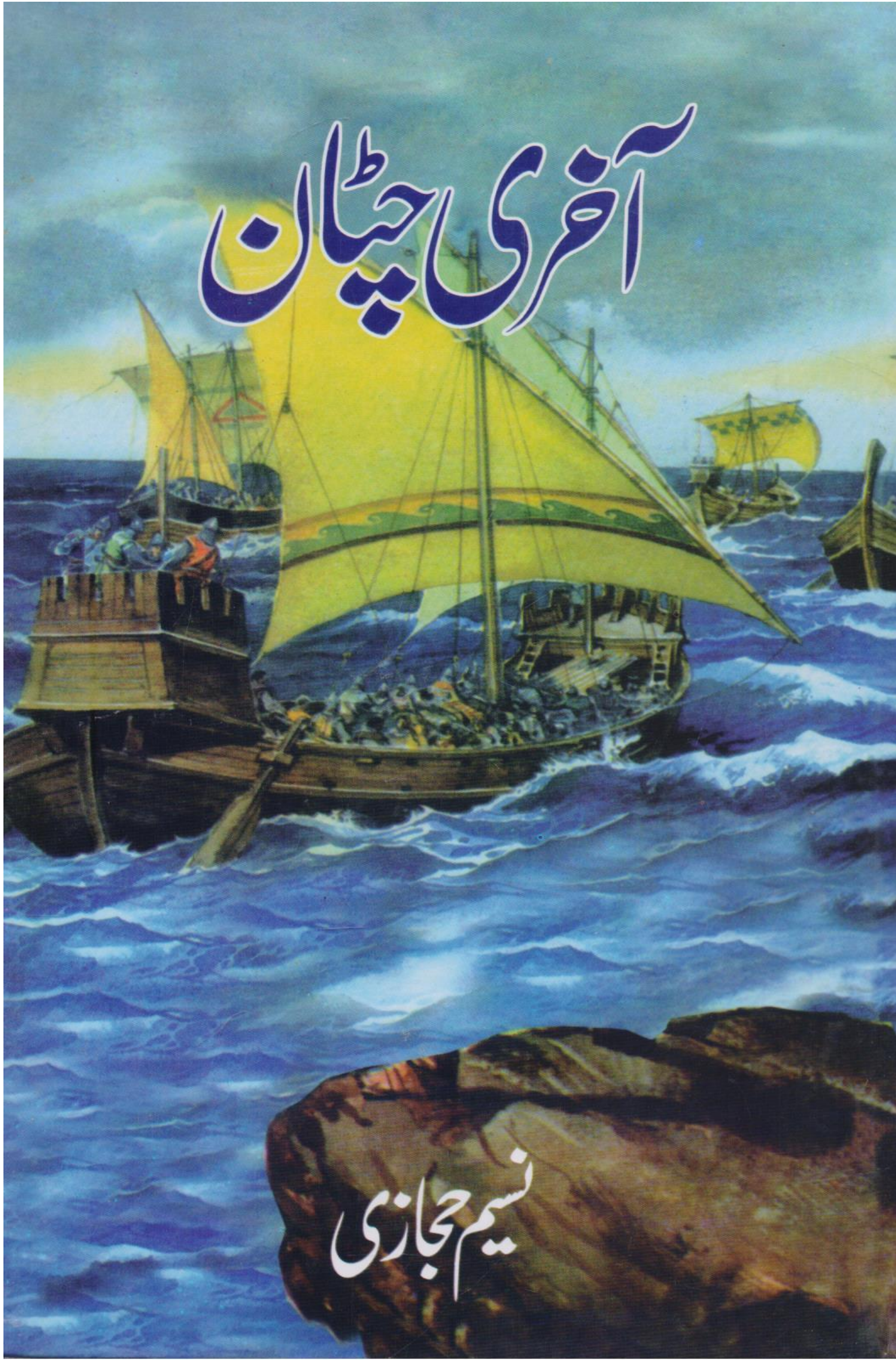
آخری چٹان



نسیم حجازی

آخری چٹان

نسیم حجازی

فہرست

پیش لفظ

”آخری چٹان“ کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا۔ یہ داستان لکھتے وقت میں سوچا کرتا تھا کہ شاید چنگیزی دور کے مؤرخین نے جن کے بیانات سے میں متاثر ہوا ہوں، تاتاریوں کے مظالم بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہو لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ صرف ایک سال کے بعد میں اپنے گھر کو وحشت و بربریت کی اس آگ کی لپیٹ میں دیکھوں گا جس نے چند صدیاں قبل عالم اسلام کے بہترین شہروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

چنگیزی دور کا ایک مؤرّخ لکھتا ہے کہ اگر میں تاتاریوں کے تمام مظالم بیان کروں تو ڈر ہے کہ آنے والی نسلیں مجھے جھوٹا کہیں گی، اور آج میں محسوس کرتا ہوں کہ مشرقی پنجاب میں وحشیوں کے ایک گروہ کی آنے

والی نسلیں بھی اپنے ان اسلاف کے کارناموں کو جھٹلائیں گی جنہوں نے وحشت و بربریت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

مشرقی پنجاب کے واقعات جس قدر المناک ہیں، اسی قدر سبق آموز بھی ہیں۔ ہم ہندوستان میں اپنی تاریخ کے ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس مرحلے پر ایک صحیح قدم نہیں اوج ثریا تک اور ایک غلط قدم تحت الثریٰ تک پہنچا سکتا ہے۔

اگر ہم چاہیں تو مشرقی پنجاب کے شہیدوں کا خون بے بسی کے آنسوؤں سے دھو ڈالیں اور چاہیں تو اس خُون کی روشنائی سے پاکستان کا روشن ترین باب لکھ ڈالیں۔

ان واقعات سے قوم کے ان دردمندوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو اس انقلابی دور میں بھی قوم کے ہر درد کے علاج کے لیے "تازہ بیان" اور "نئی قراردادیں" کافی سمجھتے ہیں۔ اگر کل تک انہیں کوئی خوش فہمی تھی تو آج وہ دور ہو جانی چاہیے۔ اگر قوّت کا جواب منطق سے دیا جا سکتا تو تاتاریوں کا سیلاب بخارا اور بغداد کو نابود کرتا ہوا مصر تک نہ جا پہنچتا۔ وہ

الفاظ جن کی تائید کے لیے شمشیر نہ ہو، کسی قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتے اور وہ قلم جو خُون میں تیرنا نہیں سیکھتا، تاریخ کے صفحات پر کوئی پائیدار نقوش بنانے سے قاصر رہتا ہے۔

"آخری چٹان" ہمارے ماضی کا ایک آئینہ ہے اور اس آئینے میں ہم اپنے حال کے خدوخال دیکھ کر اپنے مستقبل کو سنوار سکتے ہیں، ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ قدرت کسی قوم کی سیاسی غلطیاں معاف نہیں کرتی۔

"آخری چٹان" میں قوم کے ان نوجوانوں کو پیش کرتا ہوں جنہوں نے اپنے کندھوں پر پاکستان کی عظیم الشّان تعمیر کا بوجھ اٹھایا ہے۔

نسیم حجازی

لاہور، ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء

یوسف بن ظہیر

صحرائے عرب سے اسلام کا چشمہ پھُوٹا اور وہ ریگ زار جنہیں صدیوں سے کسی سیّاح نے قابلِ توجہ نہ سمجھا تھا، زمانے کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنے والی انسانیت جس آفتابِ ہدایت کی منتظر تھی، وہ فاران کی چوٹیوں سے نمودار ہوا۔

اس دن جب آمنہ کے لال عبداللہ کے بیٹے اور عبدالمطلب کے پوتے کا نام محمدؐ تجویز کیا جارہا تھا، مصوّرِ فطرت دُنیا کے نقشے میں ایک نیا رنگ بھر رہا تھا۔ قدرت اقوامِ عالم کی رہنمائی عربوں کو سونپ رہی تھی اور مورخ تاریخِ عالم کا ایک نیا باب لکھ رہے تھے۔ رحمت کے فرشتے، غلامی اور جہالت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مجروح انسانیت کو تربیت اور اخوّت

اور مساوات کا سبق دے رہے تھے۔

عرب کے صحرا نشیں لات و ہبل کو توڑ کر اٹھے اور دنیا پر رحمت کی گھٹا بن کر چھا گئے اور اُن کے لوہے نے ہر لوہے کو کاٹا۔ ان کی تہذیب و تمدّن اور اخلاق نے ہر تہذیب ہر تمدّن اور ہر اخلاق پر فتح حاصل کی۔ انہوں نے دنیا سے فساد کے درخت کی جڑیں کاٹیں اور باغِ آدم میں اپنے خون سے صلح و امن کے درخت کی آبیاری کی۔ کفر کی تاریکیاں دوپہر کے سائے کی طرح سمٹ رہی تھیں۔ قیصر و کسریٰ کے استبداد کے محل مسمار ہو چکے تھے۔ غازیانِ اسلام کی فتوحات کا جھنڈا ایک طرف کوہِ البرز کی برفانی چوٹیوں اور دوسری طرف افریقہ کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں لہرا رہا تھا۔ ان کے گھوڑے بیک وقت مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں اسپین کے دریاؤں کا پانی پی رہے تھے۔ تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ایک مورخ حیران ہو کر یہ سوال کرتا ہے کہ عربوں کے گھوڑوں کی رفتار غیر معمولی تھی یا قدرت نے ان کے سامنے زمین کو سمٹنا سکھا دیا تھا؟

یہ ایک انقلاب تھا۔ ایک روشن انقلاب۔ قدرت نے عرب کے ریت

کے ذرّوں کو ستاروں کی چمک عطا کی اور انہیں دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں بکھیر دیا۔

لیکن چھ سو سال کے بعد ایک انقلاب آیا۔ ایک تاریک انقلاب! شاید اسلام کے چراغ نے جس تاریکی کا کئی صدیوں تعاقب کیا تھا۔ چاروں اطراف سے سمٹ کر صحرائے گوبی میں پناہ لے چکی تھی۔ شاید اس آگ کی چنگاریاں جسے عرب کے پانی سے بجھایا جا چکا تھا، صحرائے گوبی کی ٹھنڈی ریت میں دب کر سلگ رہی تھیں اور چھ سو برس سے اس انتظار میں تھیں کہ خرمن اسلام کے محافظ کب سوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خرمن اسلام کے محافظ ایک مدّت سے اونگھ رہے تھے اور کفر کی آگ چھ سو برس اس لیے دبی ہی کہ قرون اولیٰ کے مجاہدین کی داستان میں اس کے لیے پانی کے چھینٹوں کا کام دیتی رہیں۔ دشمنانِ اسلام کو دولتِ عباسیہ کے کھوکھلے محل بھی اس قوم کے ناقابلِ تسخیر قلعے دکھائی دیتے تھے جس کے اسلاف نے پہلی صدی ہجری میں دنیا کے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کے تاج اپنے پاؤں تلے روند ڈالے تھے۔ قریباً چھ سو سال کے بعد جبر و

استبداد کی وہ ہوس جو روم و ایران کی سطوت کے کھنڈروں میں سو رہی تھی، صحرائے گوبی کے ایک چرواہے کے وجود میں نمودار ہوئی۔ اس چرواہے کا نام تموجن تھا، بعد میں وہ چنگیز خان کے نام سے مشہور ہوا۔ دنیا کا وہ فاتح جس کے اقبال کا سفینہ خون کے دریا میں تیر تا تھا، جس کے مقدر میں ظلمت کے طوفانوں کی رہنمائی تھی۔ اسی چنگیز خان کی قیادت میں منگولیا کے وحشی قبائل ایک آندھی کی طرح اٹھے اور تہذیب کا ہر چراغ بجھاتے ہوئے دنیا کے چاروں طرف چھا گئے۔ چھ سو برس قبل جو بادل صحرائے عرب سے نمودار ہوئے تھے، انہوں نے باغ آدم پر رحمت کے موتی نچھاور کیے تھے لیکن چھ سو برس بعد صحرائے گوبی سے جو آندھی نمودار ہوئی۔ اس میں بادلوں کے بجائے پھٹے ہوئے آتش فشاں پہاڑوں کا دھواں تھا اور اس دھوئیں کے بادلوں کے لحاف میں اس آتشیں مادے کا بے پناہ سیلاب تھا، جو شہروں اور بستیوں کو جلاتا ہوا گزر گیا۔ بابل، نینوا اور پومپیائی کے کھنڈر دیکھ کر انسان کی روح قدرت کے جن تخریبی عناصر کی ہمہ گیری کا اعتراف کرتی ہے۔ وہ تاتاریوں کے آتشیں طوفان کے سامنے بے حقیقت بن کر رہ جاتے ہیں۔

(۲)

مہذب دنیا کے لیے چنگیز خان کا افواج کا طریق جنگ بالکل نیا تھا۔ دنیا ان کے لیے ایک وسیع شکار گاہ تھی۔ خانہ بدوش تاتاریوں کے پاس گھوڑوں کی کمی نہ تھی۔ بھیڑ بکریوں کے علاوہ وہ گھوڑوں کے گوشت اور دودھ پر گزارہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جنگل کے ہر جانور کا گوشت کھا جاتے تھے۔ صحرائے گوبی میں شہروں اور بستیوں کا نام نہ تھا۔ اگر کہیں بارش ہو جاتی تو یہ خانہ بدوش وہاں جا نکلتے اور جب تک ان کے مویشی گھاس کا آخری تنکا تک نہ چر لیتے، وہ وہیں رہتے اور پھر جب کوئی مسافر یہ پیغام دیتا کہ فلاں مقام پر بارش کے چند چھینٹے پڑے ہیں تو وہ ادھر کا رُخ کر لیتے۔ بعض اوقات نئی چراگاہوں کی تلاش میں ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے مُڈھ بھیڑ ہو جاتی اور طاقتور اپنے کمزور حریف کے مویشیوں پر قابض ہونے کے علاوہ اس کے زن و مرد کو بھی ناکام بنالیتا۔ اس لیے کمزور قبائل اپنی حفاظت کے لیے متحد ہو کر کسی طاقت ور آدمی کو اپنا امیر بنالیتے تھے۔ سردیوں میں شمال کی سرد ہواؤں سے یہ تمام علاقہ کرۂ مہریر بن جاتا۔

ریت کے تودوں پر برف کی چادر بچھ جاتی۔ چارہ نہ ہونے کی وجہ سے مویشیوں کا دودھ سوکھ جاتا اور وہ گرمیوں کے بچائے ہوئے خشک گوشت پر گزارہ کرتے۔ کبھی کبھی تیز آندھیاں ان کے خیمے اڑا کر لے جاتیں اور ان کے مویشیوں کو اِدھر اُدھر کر دیتیں۔

فطرت کے ساتھ ایک دائمی جنگ نے ان لوگوں کو حد درجہ جفاکش بنا دیا تھا۔ وُہ کئی کئی دِن تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ سکتے تھے اور کئی کئی دِن بھوکے رہ کر لڑ سکتے تھے۔

چنگیز خان نے بڑے بڑے سرداروں کی سرکوبی کرنے کے بعد انہیں اپنا مطیع فرمان بنالیا۔ پھر خانہ بدوش تاتاریوں کے سامنے ان ممالک کے نقشے پیش کیے، جہاں لہلہاتے باغات سرسبز کھیتیاں اور سدا بہار چراگاہیں تھیں۔ لوٹ مار کی ہوس نے تمام خانہ بدوشوں کو چنگیز خان کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ تاتاری ہمسایہ ممالک پر بھوکے عقابوں کی طرح جھپٹے اور وہ اقوام میں پر امن زندگی نے تن آسان بنا دیا تھا، ان کے حملوں کی تاب نہ لائیں۔ چند برس میں چنگیز خان کی افواج شمال اور مشرق کے کئی

ممالک پر قبضہ کر چکی تھیں۔ ہمسایہ سلطنتیں ان کی فتوحات کی رفتار پر حیران تھیں۔ وہ ایک ایک دِن میں کئی کئی منازل طے کرتے اور بیک وقت کئی مقامات سے دوسرے ممالک پر یلغار کر دیتے۔ ان ممالک کی افواج حملہ آوروں کو روکنے کے لیے کسی ایک سرحد پر جمع ہو تیں، چنگیز خان کی فوج کا ایک حصّہ ان کا مقابلہ کرنا اور باقی افواج مخالف سمتوں سے ملک میں داخل ہو کر شہروں اور بستیوں پر قبضہ کر کے سلطنت کا تمام انتظام مفلوج کر دیتیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ کسی ملک کا سپہ سالار تاتاریوں کی پیش قدمی سے باخبر ہو کر ان کا راستہ روکنے کے لیے سرحد پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے جاسوس اسے ہر روز ہی خبر دیتے کہ حملہ آوروں کا رُخ اس طرف ہے۔ لیکن ایک صُبح کوئی ایلچی یہ پیغام لے کر آ جاتا کہ چنگیز خان کی باقی افواج نے دوسری سرحد عبور کر کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔

تاتاریوں کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان کی رفتار میں تھا۔ وہ گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سواری کرتے تھے۔ ہر سوار کے ساتھ کئی کئی گھوڑے ہوتے

تھے۔ جب ایک گھوڑا تھک جاتا تو سوار دوسرے گھوڑے پر بیٹھ جاتا۔ یلغار کے وقت سوار کو اگر بھوک محسوس ہوتی تو وہ گھوڑے کی پیٹھ پر زخم کر کے اس کے خون کے چند گھونٹ چوس لیتا۔ لمبے سفر میں بھی تاتاری اپنے ساتھ بہت تھوڑا سامانِ رسد اُٹھاتے تھے۔ جنگل میں وہ فالتو گھوڑے کھا لیتے اور راستے کے شہروں اور بستیوں سے مویشی چھین لیتے۔ اگر کسی شہر کے باشندے مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیتے تو تاتاری صرف اُن لوگوں کو قتل کرتے جنہیں سپاہیانہ خدمت کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ تاہم ہر سپاہی مفتوح قوم کی عورتوں کی بے حرمتی کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

اگر کوئی شہر مزاحمت کے بعد فتح ہوتا تو مکانوں کو آگ لگا دی جاتی اور مکینوں کو قتل کر دیا جاتا۔ ہر فوج کا جرنیل اپنے سپاہیوں کو فتح کی یادگار تعمیر کرنے کا حکم دیتا اور تاتاری سپاہی نوجوانوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے سر کاٹ کر مینار بنا دیتے۔ پھر جس فوج کا مینار سب سے بلند ہوتا، اس کے افسروں اور سپاہیوں کو چنگیز خان شاباش دیتا۔ بعض اوقات دو سپاہیوں میں اس بات پر جھگڑا بھی ہو جاتا کہ تمہارا مینار اندر

سے کھو کھلا ہے ورنہ آج میری فوج نے زیادہ سر کاٹے ہیں۔

یہ قوم تھی جس کے ہاتھوں عالمِ اسلام کی عبرت ناک تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ اس عالم اسلام کی تباہی، جو انتشار اور لا مرکزیت کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ ان مسلمانوں کی تباہی جو غفلت کی نیند سو رہے تھے، جو احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اپنی خواہشات کے مطابق اس کی تاویلیں گھڑنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے پاس آدھی دنیا کو فتح کرنے والے اسلاف کی تلواریں اب بھی تھیں لیکن اسلاف کا ایمان نہ تھا۔

(۳)

مدینے سے کوئی ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی کی مسجد میں صبح کی نماز کے بعد شیخ احمد بن حسن قرآن و حدیث کا درس دے رہے تھے۔ طاہر بن یوسف مسجد میں داخل ہوا اور شیخ کی طرف دیکھنے لگا۔

طاہر کی عمر کوئی بائیس سال کے قریب تھی۔ اس کے دراز قد، سڈول جسم اور حسین چہرے میں غایت درجہ کی شوکت اور دِل فریبی تھی۔ نگاہوں

میں عقاب کی سی بے باکی اس کی ذہانت کی آئینہ دار تھی۔

احمد بن حسن نے سوال کیا۔ ”تیار ہو گئے؟“

”جی ہاں! میں امی جان سے رخصت ہو آیا ہوں۔“

احمد بن حسن نے شاگردوں کو رخصت کیا اور اُٹھ کر نوجوان کے ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے۔

مسجد کے دروازے سے باہر شیخ کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ جو سفر کے لیے ضروری سامان سے لیس تھا۔ احمد بن حسن نے گھوڑے کی گردن پر تھپکی دی۔ گھوڑے نے گردن اُٹھائی، کان کھڑے کر لیے اور اگلا سم زمین پر مارنے لگا۔

احمد بن حسین نے مسکراتے ہوئے طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تمہارا گھوڑا کہہ رہا ہے کہ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔ ہمیں جلد رُخصت کرو! طاہر میرے ذہن میں اس وقت کوئی ایسی بات نہیں جو میں تم سے بار بار پہلے نہیں کہہ چکا۔ بخدا تمہارے لیے ایک نئی دنیا ہو گی۔ وہاں تم جیسے نوجوان

کے لیے بننے اور بگڑنے کے ہزاروں سامان موجود ہیں۔ چاہو تو اس باغ کے کانوں سے الجھ کر رہ جاؤ۔ چاہو تو اپنا دامن مہکتے ہوئے پھولوں سے بھر لو۔ بغداد خوبیوں اور برائیوں کا مرکز ہے۔ لیکن اب برائیاں زیادہ ہو رہی ہیں اور خوبیاں کم۔ تمہیں کئی تلخیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کئی حوصلہ کن مراحل سے گزرنا ہو گا۔ قاضی فخر الدّین میرا خط پڑھ کر یقیناً تمہارے لیے بہت کچھ کریں گے۔ اور ممکن ہے کہ ان کی مدد سے تم دربارِ خلافت تک رسائی حاصل کر سکو۔ دربارِ خلافت پر ترک اور ایرانی امرا کا غلبہ ہے۔ وہ تمہارا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ لیکن مجھے تمہاری صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔ تم علم کے گہرے دریاؤں کی سیر کر چکے ہو۔ مدینے کے بہترین دماغ تمہاری ذہانت پر رشک کرتے ہیں۔ مومن کی زندگی کا دوسرا جوہر سپہ گری ہے اور تم تلوار سے کھیلنا بھی جانتے ہو۔ اس وقت عالم اسلام کو تمہارے علم سے زیادہ تمہاری تلوار کی ضرورت ہے۔ بغداد میں قاضی فخر الدّین تمہارے لیے بہترین رہنما ثابت ہوں گے۔ اگر ان کے وسیلے سے تم کوئی بلند مرتبہ حاصل کر لو تو یہ بات یاد رکھنا کہ امارت کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ خدا کی خوشنودی کو خلیفہ کی

خوشنودی پر مقدم سمجھنا اور ہمیشہ خیال رکھنا کہ تم عبد الملک بنانے کے لیے نہیں، عبد اللہ بننے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ اپنی دولت کے لحاظ سے تم بغداد کے امیر ترین آدمیوں میں شمار کیے جاؤ گے۔ میں نے ان جواہرات میں سے ایک ہیرا ایک جوہری کو دِکھایا تھا اور اس کے مجھے بتایا تھا کہ اس کی قیمت دس ہزار دینار سے کم نہیں۔ میں نے ان میں سے پانچ بڑے بڑے ہیرے رکھ لیے ہیں۔ وہ میرے پاس امانت رہیں گے۔ اس کے علاوہ میں نے تجارت میں تمہارا حصّہ رکھا تھا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے لیے یہاں ایک باغ خرید لوں؟"

نوجوان نے کہا۔ "مجھے آپ نے مجبور کیا ہے ورنہ میں تو اتنی دولت ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

شیخ نے کہا۔ "اس سے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور بغداد جا کر تمہیں محسوس ہو گا کہ میری رائے صحیح تھی۔ ہاں اس دولت سے کہیں زیادہ قیمتی چیز تمہارے پاس صلاح الدّین کی تلوار ہے اور تم اس کا حق ادا کرنا جانتے ہو۔ اب چلو تمہیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔ امین کہاں ہے؟"

”وہ میرے ساتھ جانے پر بضد تھا۔ میں نے نوکر کے ساتھ شہر بھیج دیا ہے۔“

گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے طاہر نے مصافحے کے لیے شیخ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن شیخ نے مصافحے کی بجائے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور آگے بڑھ کر نوجوان کو گلے لگایا۔

”میرے بیٹے!“ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہاری جدائی ہمارے لیے بہت صبر آزما ہو گی۔ خُدا تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے۔“

احمد سے بغل گیر ہونے کے بعد نوجوان نے خدا حافظ کہہ کر مصافحے کے لیے دوبارہ ہاتھ بڑھایا لیکن احمد نے کہا۔ ”تم گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔“

”نہیں! مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔“ یہ کہہ کر نوجوان نے گھوڑے سے اُترنے کی کوشش کی لیکن شیخ نے اسے ہاتھ سے روکتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! مجھے ایک مجاہد کے گھوڑے کی باگ پکڑنے کی سعادت سے محروم نہ

کرو۔ اگر صدیق اکبرؓ اسامہ بن زیدؓ کے گھوڑے کی باگ تھام کر اپنا سر مبارک فخر سے اونچا کر سکتے تھے تو مجھے بھی آج اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔ بڑھاپے میں میرے نحیف ہاتھ اگر تلوار نہیں اٹھا سکتے لیکن ان میں تمہارے گھوڑے کی باگ تھامنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ خوش بخت ہے وہ قوم جس کے افراد جوانی میں تلواروں سے کھیلتے ہیں اور بڑھاپے میں اپنے بچوں کے گھوڑوں کی باگ پکڑ کر انہیں میدانِ جہاد کا راستہ دکھاتے ہیں۔"

احمد بن حسن طاہر کے گھوڑے کی باگ پڑے ہوئے نخلستان سے باہر نکلے۔ وہ کچھ دیر اور اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن طاہر نے کہا۔ "آپ زیادہ تکلیف نہ کیجئے، مجھے اجازت دیجئے۔"

احمد بن حسین نے گھوڑے کی باگ طاہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ " طاہر! میں نے سنا ہے کہ بغداد کے درختوں کی چھاؤں بہت ٹھنڈی ہوتی ہے۔ بیٹا وہاں جا کر سو نہ جانا اور وہاں زید کا خیال رکھنا۔ وہ بہت سیدھا آدمی ہے۔ بغداد کے امرا کے ہوشیار اور چالاک نوکروں سے اس کا مقابلہ نہ

کرنا۔ اس کی سادگی کبھی کبھی حماقت کی حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن اس کی بہادری اور ایثار اس کی ہر کوتاہی کی تلافی کرتا ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیے، میں اسے اپنا بہترین دوست سمجھتا ہوں۔"

احمد بن حسن نے خدا حافظ کہہ کر گھوڑے کی باگ چھوڑ دی۔

(۴)

طاہر بن یوسف اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار عالم اسلام کی طرف یورپ کی عیسائی طاقتوں کی یلغار روکے ہوئے تھے۔ گزشتہ صدی میں ترکان سلجوق نے ایک طرف بغداد کے عباسی خلفاء کی قیادت میں آرمینیا، ایشیائے کوچک اور شام میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی تھی اور دوسری طرف بازنطینی سلطنت سے بحیرۂ روم کے بہت سے ساحلی علاقے چھین لیے تھے۔ ۴۶۳ھ میں سلجوقی ترکوں نے بازنطینی افواج کو ملازجرو کے مقام پر فیصلہ کُن شکست دی۔ سلجوقی ترکوں کی

بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو کر پوپ اربن ثانی نے یورپ کے بادشاہوں سے فوجی مدد کی اپیل کی۔ پوپ کی اپیل ایک عرصے کے لئے کوئی خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکی۔ یورپ کے بادشاہ سلجوقیوں کی تلواروں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے لیے پوپ کی طرف سے فقط ثوابِ آخرت کا وعدہ کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں دنیا کی منفعت کے لیے سلجوقیوں سے نبرد آزما ہونا شکار کے لیے عقاب کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالنے سے کم خطرناک نہ تھا۔

لیکن اس زمانے میں ایک فرانسیسی راہب اُٹھا اور اس نے اچانک یورپ کے عوام کو عالمِ اسلام کے خلاف مشتعل کر دیا۔ اس راہب کا نام پطرس تھا۔ اس نے صلیب اُٹھائی اور گدھے پر سوار ہو کر تمام یورپ کا چکّر لگایا۔ اس کے پھٹے پرانے لباس اور ننگے پاؤں سے مظلومیت برستی تھی۔ اس کی نگاہوں میں انتقام کی چنگاریاں تھیں اور زبان پر زہریلے نشتر تھے۔ وہ جہاں جاتا لوگ اس گرد جمع ہو جاتے۔ وہ ارضِ مقدس پر سلجوقیوں کے مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرتا، خود روتا اور دوسروں کو رُلاتا۔ عوام

اس کی ہر تقریر کے اختتام پر صلیب کی حرمت کے لیے قربان ہو جانے کی قسمیں کھاتے۔ عوام کا جوش و خروش دیکھ کر یورپ کی ہر چھوٹی اور بڑی سلطنت کے حکمران عالمِ اسلام کے خلاف ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہلال کے خلاف صلیب کی تمام قہرمانی قوتیں یکجا ہو چکی تھیں لیکن ملک شاہ کی وفات تک یہ سیلاب رُکا رہا۔

ملک شام کی وفات کے بعد سلجوقی سلطنت ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے تنزل کی رفتار ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سلطنتِ مغلیہ کے تنزل کی رفتار سے بھی تیز تھی۔

سات سال کے عرصے میں مغرب کی طرف عالمِ اسلام کا وہ دفاعی مورچہ جسے یورپ کی عیسائی سلطنتیں ناقابلِ تسخیر سمجھتی تھیں، خود بخود ٹوٹ گیا اور ۱۰۹۱ء میں عیسائیت کا سیلاب عالمِ اسلام پر اُمڈ آیا۔

بغداد میں سلطنتِ عباسیہ نے ترکان سلجوق کے زوال پر اطمینان کا سانس لیا لیکن وہ عیسائیت کے خوف ناک سیلاب کی روک تھام کے لیے کچھ نہ کر

سکے۔ ایک سال کے اندر اندر عیسائیوں نے سلجوقیوں کی رہی سہی طاقت کچل ڈالی اور یروشلم کے علاوہ شام کے بہت سے شہروں اور بندر گاہوں پر قابض ہو گئے۔ اور فلسطین اور شام کے چند علاقے ملا کر ایک عیسائی سلطنت قائم کر دی۔ یہ سلطنت عالم اسلام کے سینے پر ایک خنجر تھی۔

تقریباً پچاس سال کے بعد عالمِ اسلام کا مدافعانہ جذبہ عماد الدّین زنگیؒ کی شخصیت میں نمودار ہوا۔ اور اس کے جان توڑ حملوں نے صلیب کے علمبرداروں کے دلوں میں غازیانِ اسلام کی پرانی ہیبت زندہ کر دی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ کی طرف سے ابتدا میں اس کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس کی شجاعت کی داستانیں سن کر مختلف اطراف سے عالمِ اسلام کے ہزاروں سر فروش اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ لیکن سلطنت کے اندرونی خلفشار کے باعث وہ اپنا کام پورا نہ کر سکا اور ارضِ مقدس میں عیسائی سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھتے بجھتے ہوئے بچ گیا۔ لیکن ۵۸۴ھ میں مصر میں صلاح الدّین ایوبیؒ کا اقتدار اس چراغ کے لیے ہوا کا آخری جھونکا ثابت ہوا۔ ارضِ مقدس پھر ایک بار غازیانِ اسلام کے سمند اقبال کے

بوسے لے رہی تھی، یورپ کی عیسائی طاقتوں کو صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار سلجوقیوں کی تلواروں سے کہیں زیادہ خطرناک نظر آنے لگی اور فرانس، جرمنی اور انگلینڈ کے علاوہ یورپ کی تمام عیسائی سلطنتیں اپنی ٹڈی دل افواج کے ساتھ مشرق میں عیسائیت کے اقتدار کے گرتے ہوئے ستونوں کو سہارا دینے کے لیے آموجود ہوئیں۔

خلافت عباسیہ نے اب کی بار بھی براہ راست اس جنگ میں شرکت نہ کی لیکن صلاح الدّین ایوبیؒ کے شجاعانہ کارناموں نے جلد ہی عالم اسلام کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ یورپ کی بے شمار افواج کی یلغار سے باخبر ہو کر عرب، عراق اور ترکستان سے کئی سرفروش یکے بعد دیگرے صلاح الدّین ایوبیؒ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔

(۵)

مدینے کے چند اور نوجوانوں کی طرح صلیب کے مقابلے میں ہلال کا پرچم بلند رکھنے کا جذبہ احمد بن حسن کو بھی مدینہ سے فلسطین لے گیا۔ ہلال و

صلیب کے معمولی معرکوں میں احمد بن حسن ایک گمنام سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوتا رہا۔ اس کے رسالے کے افسر اس کی شجاعت کے معترف تھے لیکن وہ خود اعتمادی جو احمد بن حسن کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی، ایک مدّت تک اس کے راستے میں رکاوٹ بنی رہی۔ بڑے سے بڑے آدمی کو خوش کرنے کے لیے بھی وہ اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اس کے دستے کا سالار ایک ترک تھا اور وہ اس کی خود اعتمادی کو اس کی خود پسندی سے تعبیر کرتا تھا۔

ایک شاندار فتح کے بعد رات کے وقت صلاح الدّین کی افواج ایک وسیع میدان میں ڈیرہ ڈالے پڑھی تھیں۔ ایک طرف زیتون کے چند درختوں کے قریب احمد بن حسن کے دستے کا ترک سالار چند سپاہیوں اور افسروں کی مجلس میں گزشتہ لڑائی کے واقعات پر تبصرہ کر رہا تھا۔

”احمد بن حسن کہاں ہے؟“ اس نے اچانک ایک سپاہی سے سوال کیا۔

سپاہی نے جواب دیا۔ ”وُہ درخت کے نیچے مشعل کے سامنے بیٹھ کر کوئی

کتاب پڑھ رہا ہے۔“

ترک افسر نے کہا۔ ”اگر اسے کتابیں پڑھنے کا اس قدر شوق نہ ہوتا تو وُہ ایک اچھا سپاہی بن سکتا ہے۔ پرسوں وُہ ایک سپاہی کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے پانچ نصرانیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور مُجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وُہ احمد ہے لیکن یہ کتابیں اسے ناکارہ بنا دیں گی۔“

ایک نوجوان جو اب تک خاموشی سے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا، بول اُٹھا۔ ” ہو سکتا ہے کہ محض ایک سپاہی بنے کی بجائے کسی فوج کی رہنمائی کے لیے پیدا ہوا ہو ! ایک عام سپاہی سپاہی تلوار سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ کرے لیکن ایک سالار کتابوں کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔“

ترک افسر نے نوجوان کے الفاظ کی تلخی کو ایک بلند قہقہے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ ”تو اہلِ بغداد سب کے سب سالار ہیں۔ وُہ فقط کتابیں پڑھتے ہیں۔“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”یہ عالمِ اسلام کی بد قسمتی ہے کہ اہلِ بغداد کتاب کے ساتھ تلوار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ورنہ عالمِ اسلام کا ہر سپاہی ان کی قیادت میں لڑنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا۔“ مشعل کی روشنی سے دور ہونے کے باعث ترک سالار اپنے مخاطب کو پہچان نہ سکا۔ اس نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔ ”یہ احمد بن حسن کا دوسرا ساتھی کہاں سے آ گیا؟ بھئی آگے آجاؤ؟“

نوجوان کونے سے اُٹھ کر سالار کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ سالار نے کہا۔ ”ارے یوسف آج تمہاری زبان کیسے کھل گئی ؟ بیٹھ جاؤ! میں ہر بہادر کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ تم نے پہلے ہی معرکے میں ہم سب کو اپنا معترف بنالیا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھو کہ یہاں کی رائے عامہ اہلِ بغداد کی ستائش کو پسند نہیں کرتی۔“

یوسف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”بات کرتے وقت میرے ذہن میں رائے عامہ نہ تھی، آپ تھے۔ اور اہلِ بغداد کو میں اس وقت تعریف کے قابل سمجھتا ہوں نہ میں نے ان کی تعریف کی ہے۔ ان کا ذکر ضمناً آ گیا

تھا۔ اصل موضوع یہ تھا کہ سپاہی کو علم سیکھنا چاہیے یا نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کو تلوار ایک ایسا سرکش گھوڑا ہے جس کے لیے علم کی باگ کی ضرورت ہے۔ بغداد والے فقط باگ کو سنوار رہے ہیں۔ ان کے پاس گھوڑا نہیں۔"

سالار نے پوچھا۔ "اور ہمارے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

یوسف نے جواب میں پوچھا۔ "ہمارے سے آپ کی مراد اپنی ذات ہے یا سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی فوج؟"

ترک افسر نے اس سوال سے پریشان ہو کر گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔ "باتوں میں یہ نوجوان احمد بن حسن کا بھی استاد معلوم ہوتا ہے۔ اسے بھی بلاؤ؟"

ایک سپاہی اُٹھ کر احمد بن حسن کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ترک سالار نے کہا۔ "احمد! پرسوں تم سچ مچ ایک سپاہی کی طرح لڑ رہے تھے۔ مجھے تم سے ہرگز یہ توقع نہ تھی۔۔۔ بیٹھ جاؤ!"

احمد بن حسن نے جواب دیا۔ ”آپ کو اپنے سپاہیوں سے بُری توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔“

ترک افسر نے قدرے کھسیانہ ہو کر کہا۔ ”تمہارا یوسف سے تعارف ہوا ہے یا نہیں؟ یہ ہمارے نئے رفیق ہیں۔“

احمد نے جواب دیا۔ ”میں ان سے متعارف ہو چکا ہوں۔“

”کیا پڑھ رہے تھے آج؟“

”میں خالد بن ولیدؓ کی فتوحات پڑھ رہا تھا۔“

ترک افسر نے سوال کیا ”بھلا خالد بن ولیدؓ کی فتوحات زیادہ ہیں یا ہمارے سلطان کی؟ میرے خیال میں اس زمانے کی جنگیں موجودہ جنگوں کے مقابلے میں معمولی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔“

احمد بن حسن نے جواب دیا۔ ”آپ کا خیال عام طور پر صحیح نہیں ہوتا۔ میں بے علمی کو قابلِ معافی سمجھتا ہوں لیکن ریاکاری کو قابلِ معافی نہیں

سمجھتا۔ آپ سلطان کے سامنے ایسی باتیں کر کے شاید انہیں خوش کر سکیں لیکن وہ اس وقت یہاں موجود نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کو کتابوں سے نفرت ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ کو ایک مسلمان ماں نے خالد اعظمؓ کی فتوحات کے حالات نہ بتائے ہوں اور آپ فخر اور احترام کے ساتھ ان مجاہدین کے نام لینا نہ سکھایا ہو جنہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور جسم پر چیتھڑے اوڑھ کر قیصر و کسریٰ کے تاج روند ڈالے تھے۔ خالد بن ولیدؓ کے زمانے میں اکثر جنگیں ایسی تھیں جن میں اسلام کی ایک تلوار کے مقابلے میں دشمن کی دس تلواریں ہوا کرتی تھیں۔ میری باتوں سے آپ کو تکلیف ضرور ہو گی۔ آپ میرے سالار ہیں۔ میدانِ جنگ میں آپ کا ہر اشارہ میرے لیے حکم ہے لیکن وہ بھی اس لیے نہیں کہ میں آپ کی یا سلطان صلاح الدّینؒ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور سلطان کا احترام اگر میرے دل میں ہے تو محض اس لیے کہ وہ بھی میری طرح اسلام کے ایک سپاہی ہیں۔ اس قسم کی غلط بیانی سے تاریخ کا ایک طالب علم شاید گمراہ نہ ہو سکے لیکن ہو سکتا ہے کہ سلطان کے سامنے اس قسم کی ناجائز خوشامد ان میں خود پسندی کا وہ جذبہ پیدا کر

دے جس کے باعث خلفائے بنی عباس اسلام کے لیے ایک عضوِ معطل بن چکے ہیں۔ اس وقت عالمِ اسلام کی بہت سی توقعات سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ سے وابستہ ہیں۔ اس لیے آپ ابھی سے انہیں خالد اور ابو عبیدہ کا ہم پلّہ ثابت کر کے مستقبل سے بے نیاز کر دینے کی بجائے ان کے لیے یہ دعا کریں کہ وہ بڑی سے بڑی منزل پر پہنچ کر بھی یہ محسوس کریں کہ ابھی ان کے سفر کی ابتدا ہوئی ہے۔"

احمد بن حسن کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک درخت کی آڑ سے ایک نقاب پوش نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "خدا صلاح الدّین کو عالم اسلام کی نیک توقعات پورا کرنے کے قابل بنائے اور اسے خوشامدیوں سے محفوظ رکھے۔" اجنبی کی آواز میں غصّہ اور ہیبت اور جلال تھا۔ سامعین بدحواس ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے مشعل کی روشنی کے قریب پہنچ کر چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ ترک افسر سراسیمہ ہو کر بولا۔ "سلطان!"

سب کے سب اٹھ کھڑے ہو گئے۔ سلطان صلاح الدّین نے ترک افسر

سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مجھے تمہاری باتیں سن کر بہت دکھ ہوا لیکن تم جاہل ہو۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم آئندہ چھ ماہ تک فرصت کے اوقات میں اپنے ساتھیوں سے بالکل الگ بیٹھ کر تاریخ پڑھا کرو۔ چھ ماہ بعد میں خود تمہارا امتحان لوں گا۔ اگر تم نے میری تسلّی کر دی تو تمہیں ترقی دی جائے ورنہ تنہائی میں بیٹھنے کی سزا اور بڑھا دی جائے گی۔ اور تم دونوں ادھر آؤ!“ سلطان نے احمد بن حسن اور یوسف کی طرف اشارہ کیا۔ احمد اور یوسف آگے بڑھ کر سلطان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

سلطان نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”میں مدینہ سے آیا ہوں۔“ احمد بن حسن نے جواب دیا۔ سلطان یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بولا۔ ”میں بغداد سے آیا ہوں۔“

”تم میری فوج میں کب شریک ہوئے؟“

احمد نے جواب دیا۔ ”مجھے تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں اور یوسف کو کوئی پانچ دن۔“

سلطان صلاح الدّین نے کہا۔ ”تم میرے متعلق غلط توقعات ظاہر کرنے کے مجرم ہو، تمہیں کیا سزا دوں؟“

احمد نے کہا۔ ”اگر آپ میری تمام باتیں سننے کے بعد بھی مجھے مجرم قرار دیتے ہیں تو میں اپنی صفائی پیش نہیں کرتا۔“

سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ نے پیار کے ساتھ احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سر دست میں تمہاری زبان سے متاثر ہوا ہوں۔ مجھے تمہاری سپاہیانہ صلاحیتوں کا صحیح علم نہیں۔ اس لیے تمہیں بارہ دستوں کا سالار مقرر کرتا ہوں اور یوسف تمہاری آواز میں ایک سپاہی کی سی خود اعتمادی ہے۔ ممکن ہے تم آگے چل کر اپنے آپ کو بڑی سے بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ثابت کر سکو۔ لیکن سر دست تمہیں پانچ دستوں کا سالار مقرر کرتا ہوں۔ تم دونوں کو میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں فقط جواں مردی اور شجاعت کی عزت ہے۔ خوشامد کی نہیں اور حضرت خالدؓ کے متعلق شاید میں اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکوں۔ کاش میں مصر کا سلطان ہونے کی بجائے اسلام کے مجاہد اعظمؓ کی فوج کا

ایک معمولی سپاہی ہوتا۔ میرے لیے صرف وہ مجاہدین بلکہ وہ لوگ بھی قابلِ رشک ہیں جنہوں نے عراق اور شام کے میدانوں میں خالد اعظمؓ کی افواج کے سواروں کو گرد کے بادلوں میں روپوش ہوتے دیکھا تھا۔ میں اپنی ذات سے غازیانِ اسلام کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو جانے والی ایک بڑھیا کا درجہ بلند سمجھتا ہوں۔"

(۶)

چند دن کے بعد صلاح الدّین ایوبیؒ کی فوج میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو احمد بن حسن اور یوسف بن ظہیر سے واقف نہ ہو۔ ایک سال کے بعد یوسف سلطان کے جانبازوں کے دستے کا سالار اور احمد بن حسن مجلسِ شوریٰ کا رکن بن چکا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے غایت درجے کی عقیدت تھی۔ میدانِ جنگ میں اگر احمد بن حسن کو کسی پر رشک آ سکتا تھا تو وہ یوسف تھا اور علما کی محفل میں یوسف اپنے دوست کی برتری کا اعتراف کرتا تھا۔

یوسف اور احمد بن حسن نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک یروشلم پر دوبارہ نشانِ صلیب کی جگہ ہلالی پرچم نصب نہ ہو گا وہ رخصت پر نہیں جائیں گے۔ جن ایّام میں سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ یروشلم پر آخری حملے کی تیاریاں کر رہا تھا، بغداد میں سلطان کی فوج کے چند رضاکار جو رخصت پر گئے ہوئے تھے، واپس آئے اور ان میں سے ایک سپاہی نے یوسف کے خیمے میں داخل ہو کر اس کی بیوی کا خط پیش کیا۔ یوسف نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خط کھول کر پڑھا اور تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد سپاہی کی طرف دیکھنے لگا۔

سپاہی نے کہا۔ ”میں نے اپنی بیوی کو آپ کے گھر بھیجا تھا۔ وہ آپ کی بیوی کی حالت نازک بیان کرتی تھی۔ آپ کا بچہ میں نے دیکھا تھا، وہ تندرست ہے۔ میں اپنی بیوی سے کہہ آیا ہوں۔ وہ آپ کی بیوی کی تیمارداری کر رہی ہے۔“

یوسف نے اپنے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”خدا آپ کو جزا دے اور پھر دوبارہ خط دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد یوسف تنہا اپنے خیمے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ پانچ چھ مرتبہ پڑھنے کے بعد اسے مختصر سے خط کے یہ الفاظ زبانی یاد ہو چکے تھے:

”میرے آقا! میرے شوہر بہت انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ یروشلم پر اسلام کا جھنڈا نصب ہوتے دیکھ سکتی۔ میں قدرے علیل ہوں لیکن آپ فکر نہ کریں۔ یروشلم کی فتح کی خبر سن کر میں تندرست ہو جاؤں گی۔ ہاں، یہ ضرور چاہتی ہوں کہ مجھے سب سے پہلے یروشلم کی فتح کی خبر سنانے والے آپ ہوں۔ اپنا عہد پورا کیجیے۔ میں دن رات خدا سے دعا کرتی ہوں کہ یروشلم پر جھنڈا نصب کرنے کی سعادت آپ کے حصّے میں آئے۔ طاہر بہت خوش ہے اور محسن کی بیوی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں۔“

یوسف خیمے میں ٹہلتے ہوئے یہ الفاظ بھی آہستہ اور کبھی بلند آواز میں دہرا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز اور بھی سست ہو رہی تھی۔ اس کا دل اور دماغ دو مختلف خیالات، دو مختلف امنگوں اور ارادوں کی کشمکش میں

مبتلا تھے۔ اس کے سامنے دو فرائض تھے۔ ایک طرف حسین اور نوجوان بیوی جس کے ساتھ شادی سے پہلے وہ دنیا میں بالکل تنہا تھا اور شادی کے بعد جس کی حیا میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ اس کے لیے دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ قیمتی تھی۔ وہ بیمار تھی اور خط کے تسلّی آمیز لہجے کے باوجود وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی حالت مخدوش ہے۔ ورنہ وہ معمولی تکلیف کی حالت میں محسن کی بیوی کی تیمارداری کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ اسے گھر پہنچنا چاہیے۔ وہ خیالات کے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر بغداد پہنچتا اور اپنے مکان میں داخل ہوتا۔ ”زاہدہ! زاہدہ! تم کیسی ہو؟ میں آ گیا ہوں۔ میری طرف دیکھو۔“ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی اور بے قرار ہو کر کہتی۔ ”آپ! کیا یروشلم پر اسلام کا پرچم نصب ہو چکا ہے؟“ یہ سوال تصوّر کے گھوڑے کے لیے تازیانہ ثابت ہوتا اور وہ بغداد کے پر امن گوشے سے لوٹ کر یروشلم کی رزم گاہوں میں پہنچ جاتا اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر بلند آواز میں کہتا۔ ”میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ میں اپنے ساتھ یروشلم کی فتح کی خبر لے کر جاؤں گا۔“ اور وہ تیروں کی بارش میں خندق عبور کرتا قلعے کی دیواریں توڑتا صلیب کے نشان اُکھاڑتا اور

ہلال کا پھریرا اُڑاتا ہوا۔ قلعے کے آخری برج تک پہنچ جاتا اور فتح کا نعرہ بلند کرتے اور خون آلود تلوار نیام میں ڈالتے ہوئے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا اور بغداد پہنچ جاتا۔ اپنے گھر کے سامنے گھوڑے سے اُترتا اور بھاگ کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہتا:

"میری جان! میری روح! میں آگیا ہوں۔ یروشلم فتح ہو گیا ہے۔ میں نے قلعہ کے سب سے اونچے برج پر اپنے ہاتھوں سے اسلامی جھنڈا نصب کیا ہے" اور زاہدہ کا حسین اور معصوم چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔" اس کا آخری فیصلہ تھا۔

احمد بن حسن اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "یوسف! بغداد سے چند سپاہی آئے ہیں۔ تمہارے گھر سے کوئی پیغام آیا؟" "بیوی کا خط آیا ہے۔" یوسف نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان ہو۔ خیریت تو ہے؟"

"وُہ کُچھ علیل ہے۔"

احمد بن حسن نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”تمہیں بُلایا ہے؟“

”نہیں۔ آپ پڑھ لیجئے۔“ یہ کہتے ہوئے یوسف نے احمد کے ہاتھ میں خط دے دیا۔

احمد نے خط پڑھنے کے بعد کہا۔ ”خط سے تو کوئی تشویش کی بات ظاہر نہیں ہوتی، تاہم تم پریشان ضرور ہو۔ میں تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں۔“

یوسف نے بے تابی سے سوال کیا۔ ”کیسی خوش خبری؟ کیا یروشلم پر جلد حملہ ہونے والا ہے؟“

احمد نے جواب دیا۔ ”ہاں، پرسوں ہم یروشلم کی فصیل توڑ رہے ہوں گے اور انشاء اللہ تم ایک ہفتے سے پہلے بغداد والوں کو یروشلم کی فتح کی خوش خبری دینے کے لیے روانہ ہو جاؤ گے اور چند منازل تک میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔“

یوسف نے پھر پوچھا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ پرسوں حملہ ہو جائے گا؟“

احمد نے جواب دیا۔ ”میں ابھی سلطان سے مل کر آرہا ہوں۔“

یوسف کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”کاش! یہ حملہ آج ہوتا!“

احمد نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”میں خط لانے والے کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ ”یہ خط محسن لایا ہے۔ وہ بغداد میں میرا پڑوسی ہے۔“

”کس رسالے میں ہے؟“

”وہ ہراول فوج کے اٹھارہویں دستے کا نائب سالار ہے۔“

شام کے وقت احمد بن حسن نے یوسف سے کہا۔ ”یوسف! میں محسن سے مل چکا ہوں، اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بیوی کی حالت تسلّی بخش نہیں۔ اگر جانا چاہو تو میں سلطان سے تمہاری رخصت کے لیے کہوں؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ مریضہ کی تیمارداری کا موقع شاید پھر بھی مل جائے لیکن یروشلم کی فتح میں حصّہ لینے کی سعادت شاید دوبارہ نصیب نہ ہو۔“

(۷)

آٹھ دن کے بعد مسلمانوں کی فوج چاروں طرف سے یروشلم پر یلغار کر رہی تھی۔ سلطان صلاح الدّینؒ ایک سفید گھوڑے پر سوار حملہ آور فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ سپاہی جسے سلطان نے سب سے پہلے کمند ڈال کر قلعے کی فصیل پر چڑھتے دیکھا، یوسف تھا۔ اوپر سے تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی اور یوسف سر پر ڈھال رکھ کر اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ فصیل پر پہنچنے کے لیے اس کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ سلطان نے اپنے دل میں کہا اگر یہ فصیل پر پہنچ گیا تو میں اسے اپنی تلوار انعام میں دوں گا۔ یوسف فصیل پر پہنچ چکا تھا اور چند نوجوان اس کی تقلید کر رہے تھے۔ یوسف کی تلوار چند آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ سلطان اپنے جرنیل سے کہہ رہا تھا۔ ”اب وُہ میرے گھوڑے کا بھی حق دار ہے۔

چند مجاہد فصیل پر چڑھ کر یوسف پر عقب سے حملہ کرنے والے پہرے داروں کو روک رہے تھے اور یوسف اپنے پے در پے حملوں سے چھ سات سپاہیوں کے پاؤں اکھاڑ چکا تھا۔ صلاح الدّینؒ جوش مسرت میں کہہ رہا تھا۔ ”نوجوان! میں تمہیں ہراول دستے کا سالار اعلیٰ بناتا ہوں۔“ تھوڑی دیر کے لیے سلطان کی توجہ کسی اور محاذ پر مبذول ہو گئی۔ جب دوبارہ اس نے فصیل کے اس حصّے کی طرف دیکھا تو اس کے سپاہی اس مقام پر قبضہ جما چکے تھے لیکن یوسف وہاں نہ تھا۔ اس نے اپنے ہم رکاب سے پوچھا۔ ”یوسف کہاں گیا؟“

اس نے دروازے کے سب سے اُونچے بُرج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ دیکھیے! یوسف بہت خطرناک مقام پر لڑ رہا ہے۔“

سلطان نے اوپر نگاہ کی۔ یوسف کی تلوار بیک وقت تین تلواروں سے لڑ رہی تھی۔ سلطان کے دو سپاہی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکے تھے۔ یوسف کی تلوار کی ایک ضرب سے نشانِ صلیب سرنگوں ہو چکا تھا۔ سلطان نے آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے بیٹے ہو۔ میں

تمھیں اس شہر کا والی مقرر کرتا ہوں۔" لیکن یوسف کے ہاتھ سے تلوار گِر چکی تھی اور ایک نوجوان اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلطان نے اُسے پہچان لیا۔ یہ احمد بن حسن تھا۔

سلطان کے سپاہی اندر داخل ہو کر قلعے کا دروازہ کھول چکے تھے۔ دشمن ہتھیار ڈال چکا تھا۔ سلطان گھوڑا بھگاتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور گھوڑے سے اُتر کر اپنی فوج کے چند افسروں کے ساتھ جلدی سے برج پر چڑھا۔ یوسف کے جسم پر زخموں کے کئی نشان تھے۔ احمد اسے اپنی چھاگل سے پانی پلا رہا تھا۔ سلطان فرش پر گھٹنے ٹیک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی زرہ کھلوا کر اس کے زخم دیکھے اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مغموم لہجے میں کہا۔ "بیٹا! میں تمھیں اس شہر کا والی بنا چکا ہوں۔ شاید تمھارا عہدِ حکومت بہت مختصر ہے۔ اگر شہر والوں کے لیے کوئی حکم نافذ کرنا چاہتے ہو تو جلدی کرو۔"

یوسف نے پہلے سلطان کی طرف اور پھر احمد کی طرف دیکھا اور بالآخر اس کی نگاہیں لوٹ کر لٹکتے ہوئے صلیبی جھنڈے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

احمد بن حسن نے کہا۔ ”اس شہر کے حاکم کی خواہش یہ ہے کہ وہ فتح کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے نصب کرے۔ “ سلطان کو ان الفاظ کے ساتھ یوسف کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک نظر آئی۔ سلطان نے دوبارہ اس کی نبض دیکھی اور ایک سپاہی کو جھنڈا لانے کا اشارہ کیا۔ ایک افسر نے ٹوٹا ہوا نشانِ صلیب اتار کر پھینک دیا۔ سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ اور احمد بن حسن نے یوسف کو سہارا دے کر اٹھایا۔ یوسف کے بے جان ہاتھوں میں اچانک زندگی آ گئی۔ اس نے جھنڈا نصب کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ مسکراہٹ جو صرف خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اچانک اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے۔ ”زاہدہ! یروشلم فتح ہو چکا ہے!“

سلطان کے حکم سے یوسف کو شاہی محل کے ایک کمرے میں پہنچایا گیا۔ جان کنی کی حالت میں اس نے احمد بن حسن سے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی۔ ”احمد! میری بیوی کی دُعا کا صرف ایک حصّہ قبول ہوا۔ میں یروشلم کی فتح کی خبر لے کر اس کے پاس نہ پہنچ سکا لیکن قدرت کا ایک راز اب

میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ زاہدہ بغداد میں نہیں کسی اور مقام پر میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اس دنیا میں ہوتی تو میں یقیناً بغداد پہنچتا۔ جھنڈا نصب کرتے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اگر تم بغداد جاؤ۔ اگر وہ زندہ ہے تو بغداد میں سب سے پہلے یروشلم کی فتح کی خبر سننا اس کا حق ہے۔ اگر وہ زندہ نہیں تو میں اپنا بیٹا تمہیں سونپا ہوں!" اس نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور خفیف سی آواز میں دہرانے لگا۔ "زاہدہ! میں آ گیا ہوں۔ یروشلم فتح ہو گیا۔ میں نے فتح کا جھنڈا اپنے ہاتھوں سے نصب کیا ہے!" اس نے دوبارہ

آنکھیں کھولیں۔ سلطان اور احمد کی طرف دیکھا لیکن ایک لمبی سانس کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے موت کے پردے حائل ہو چکے تھے۔

سلطان نے کہا۔ "احمد! تم فوراً بغداد جانے کی تیاری کرو! میں تمہیں کچھ رقم یوسف کی بیوہ کے لیے دیتا ہوں۔ اگر وہ خدانخواستہ زندہ نہ ہو تو میں اس کے بچے کی پرورش تمہیں سونپتا ہوں۔"

احمد بن حسن نے کہا۔ ”میں تیار ہوں اور اگر آپ کی اجازت ہو تو بغداد کے ایک سپاہی کو جو یوسف کا پڑوسی ہے، ساتھ لیتا جاؤں؟“

(۸)

تھوڑی دیر بعد سلطان کی قیام گاہ کے سامنے تین گھوڑے کھڑے تھے، جن میں سے ایک وہ تھا جس پر تھوڑی دیر قبل سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ خود سوار تھا۔ رخصت کے وقت سلطان نے احمد بن حسن کو اپنے خیمے میں بلایا اور چمڑے کی ایک تھیلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پانچ ہزار طلائی سکے ہیں۔ ان میں ایک ہزار تمہارے لیے اور باقی یوسف کی بیوہ کے لیے۔ اگر خدانخواستہ وہ زندہ نہ ہو تو یہ رقم یوسف کے بیٹے کی پرورش پر خرچ کرنا اور اس کے مستقبل کے لیے میں تمہیں کچھ اور دیتا ہوں۔ یہ لو۔“ سلطان نے ایک ریشمی کپڑے کی تھیلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے کھول کر دیکھو!“

احمد بن حسن نے تھیلی لے کر کھولی۔ اس میں بیش قیمت جواہرات جگمگا

رہے تھے۔ سلطان نے کہا۔ "جواہرات اسے اس وقت دینا جب وہ بالغ ہو جائے۔" احمد بن حسن نے کہا۔ "یوسف کے بیٹے کے لیے آپ کا ہر انعام جائز ہے۔ لیکن میں یہاں دولت کی تلاش میں نہیں آیا تھا۔ خدا نے مجھے ہر شے دے رکھی ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں تو یہ مدینے کے غریب بچوں کے لیے لے جاؤ!"

سلطان کا لب و لہجہ کچھ ایسا تھا کہ احمد انکار نہ کر سکا۔ سلطان نے پھر کہا۔ "دو اور چیزیں جو میں تمہیں سونپنا چاہتا ہوں، ان میں سے ایک میرا گھوڑا۔ ایک سپاہی یہ گھوڑا چھوڑنے کے لیے بغداد جائے گا۔ بغداد میں اسے بیچ کر جو رقم حاصل ہو گی وہ بھی یوسف کی بیوی کو دے دینا۔ مجھے امید ہے کہ بغداد کے لوگ میرے گھوڑے کو اچھی قیمت پر خریدیں گے۔ دوسری چیز میری تلوار ہے۔ وہ یوسف کے بیٹے کے بڑا ہونے تک تمہارے پاس محفوظ رہے گی۔"

احمد نے کہا۔ ”محسن میرے ساتھ جارہا ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”میں نے اسے فراموش نہیں کیا۔ اس کی واپسی تک مالِ غنیمت میں اس کا حصّہ محفوظ رہے گا تاہم زادِ راہ کے لیے میں اسے کچھ دیتا ہوں۔“

سلطان نے محسن کو اندر بلا کر پانچ سو طلائی سکے دیے۔ پھر دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جاؤ! میں چاہتا ہوں کہ بغداد میں یروشلم کی فتح کی خبر سننے والی یوسف کی بیوی ہو۔ خدا حافظ!“

چند ہفتوں کے بعد بغداد پہنچ کر احمد بن حسن کو معلوم ہوا کہ یوسف کی بیوی یروشلم کی فتح سے چار دن پہلے داعی اجل کو لبیک کہہ چکی تھی اور حسن کی بیوی اس کے بچے کو اپنے گھر لے گئی تھی۔ احمد بن حسن نے گھر پہنچتے ہی بچے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور جب حسن نے اڑھائی سال کا ایک خوب صورت بچہ لا کر اس کی گود میں بٹھا دیا تو اس کا دل بھر آیا۔ احمد بن حسن اس کے سر پر پیار اور شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ بچے نے ہاتھ

بڑھا کر اس کی ناک پکڑ لی اور کہا۔ ”غازی۔۔ ابّا۔۔۔ غازی!“

احمد نے اسے سینے سے بھینچ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔
”بیٹا۔۔۔ ابّا شہید کہو!“

”ابّا۔۔۔؟“ بچہ غور سے احمد کی طرف دیکھنے لگا۔

”ابّا شہید!“ احمد نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”ابّا شہید۔“ بچہ یہ کہتے ہوئے اس کی گود میں اچھلنے لگا۔

شام تک بغداد میں صلاح الدّین ایوبیؒ کے گھوڑے کا چرچا ہو چکا تھا۔ بغداد کے امراء میں سے ہر ایک اسے اپنے اصطبل کی زینت بنانے کے لیے بے قرار تھا اور ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو گھوڑے پر چڑھنے سے زیادہ اسے سنوارنا چاہتے تھے۔ خلیفہ کے متعلق مشہور تھا کہ جس قدر اس کا دل کوئی شے خریدنے کے لیے بے قرار ہوتا تھا اسی قدر اپنی جیب پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی تھی اور پھر اگر کسی سوداگر کے لیے خلیفہ کی پیش کش قابلِ قبول نہ ہو تو امرا اس کے خریدار بننے کی جرأت

نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن خلیفہ کو اس وقت خبر ہوئی جب کہ چین کا سفیر یہ گھوڑا دس ہزار کی مالیت کے جواہرات کے عوض خرید چکا تھا۔

اگلے دن احمد بن حسن یوسف بن ظہیر کے بچے کو لے کر مدینے کو روانہ ہو گیا۔

(۹)

یوسف کے کم سن بچے کا نام طاہر تھا۔ احمد بن حسن نے گھر پہنچ کر اسے اپنی بیوی کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ''سعیدہ! یہ ایک مجاہد کا بیٹا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اس ننھے مہمان کی تواضع میں مدینے کے انصار کی روایات پر عمل کرو گی!''

دوپہر کے وقت جب احمد بن حسن کا سات سال کا طلحہ مکتب سے گھر آیا تو اس نے اپنی ماں کی گود میں ایک خوب صورت بچہ دیکھ کر کہا۔ ''امّی! یہ کون ہے؟''

سعیدہ نے جواب دیا۔ ''تمہارا چھوٹا بھائی ہے بیٹا۔''

شام کے وقت طلحہ بستی کے تمام بچوں کو اپنا چھوٹا بھائی دکھا رہا تھا۔

پانچ سال کے بعد ایک دن احمد نے سعیدہ نے پوچھا۔ ”سچ کہو تمہیں طلحہ زیادہ عزیز ہے یا طاہر؟“

سعیدہ نے غور سے دونوں کی طرف دیکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔“

احمد بن حسن کے گھر میں بارہ سال کی عمر تک طاہر کی زندگی ایک سہانا خواب تھی۔ احمد بن حسن نے اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مدینے کے علما اور فنونِ حرب کے ماہرین کی اس ہونہار بچے کے متعلق متفقہ رائے تھی کہ وہ کسی بڑے کام کے لیے پیدا ہوا ہے۔ احمد بن حسن اور سعیدہ کو اپنے بیٹے طلحہ سے کم عزیز نہ تھا اور طلحہ بھی اس کے ساتھ اپنی زندگی کی بیشتر دلچسپیاں وابستہ کر چکا تھا۔

ساتویں صدی ہجری کے ابتدائی برسوں میں ہلال و صلیب کی جنگیں از سرِ نو شروع ہو چکی تھیں۔ یورپ کی عیسائی طاقتیں گزشتہ برسوں میں فلسطین

اور شام میں صلاح الدّین ایوبیؒ کے ہاتھوں پے در پے شکستیں کھانے کے بعد قسطنطنیہ کو اپنا مرکز بنا کر بازنطینی سلطنت کو پھر ایک بار مشرق کی طرف پھیلانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ مصر کی افواج پھر ایک بار عالمِ اسلام کی طرف عیسائیت کے سیلاب کی تازہ لہروں کے سامنے آخری چٹان کا کام دے رہی تھیں۔ لیکن بغداد میں سلطنتِ عباسیہ پھر ایک بار اپنی بے توجہی اور غفلت کا ثبوت دے رہی تھی۔

شام کے تاجروں کا ایک قافلہ مدینے پہنچا اور ان کی زبانی نصرانیوں کے نئے اِرادوں کا حال سُن کر احمد بن حسن جہاد پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

رخصت ہونے سے ایک دن پہلے طلحہ نے کہا۔ ”ابّا جان! میں بھی جاؤں گا۔“

احمد بن حسن نے اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے منہ سے یہ الفاظ سُننے کے لیے بے قرار تھا۔ تم نے اپنی ماں سے ذکر کیا؟“

”ہاں! وہ مجھے اجازت دے چکی ہیں۔“

طاہر نے طلحہ کی جدائی کو بہت زیادہ محسوس کیا۔

دس ماہ کے بعد احمد بن حسن واپس آیا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”سعیدہ! میں ایک المناک خبر لایا ہوں۔“

”طلحہ۔۔۔؟“ اس نے جواب طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! ہم دونوں ایک ہی مقصد لے کر گئے تھے۔ اسے شہادت نصیب ہوئی اور میں خالی ہاتھ واپس آیا ہوں۔“

سعیدہ اناللہِ وانا الیہ راجعون کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اگلے سال خدا نے احمد بن حسن کو ایک اور بیٹا عطا کیا جس کا نام امین رکھا گیا۔

چند سال بعد جب عالم اسلام کے باقی شہروں کی طرح مدینے کے لوگ بھی عالم اسلام پر مغرب سے عیسائیت کے سیلاب کی بجائے شمال مشرقی

افق پر ایک تاریک آندھی کے ابتدائی آثار محسوس کر رہے تھے، احمد بن حسن نے طاہر سے کہا۔

”بیٹا! اب مدینے سے زیادہ بغداد کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری جدائی میرے اور امین کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تم میرے بڑھاپے کی لاٹھی بننے کی بجائے عالمِ اسلام کا ایک ستون بن سکتے ہو۔ تم بغداد جانے کی تیاری کرو۔“

مدینے میں احمد بن حسن کے سوا کسی کو طاہر کی دولت کا علم نہ تھا لیکن کوئی ایسا نہ تھا جسے اس کے ساتھ عقیدت نہ تھی۔ لوگوں کو اس کے بغداد جانے کا علم ہوا تو ان میں سے بعض یہاں تک کہتے تھے کہ سلطنتِ عباسیہ کو طاہر بن یوسف سے بہتر وزیرِ اعظم نہیں مل سکتا۔

طاہر کو بغداد بھیجنے سے پہلے احمد بن حسن کو اس کے لیے ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کی بستی سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں زید نامی ایک شخص رہتا تھا۔ وہ چند سال قبل احمد

بن حسن کے باغات کا محافظ رہ چکا تھا۔ زید ایک سادہ دل اور دیانت دار آدمی تھا۔ احمد بن حسن نے طاہر سے کہا۔ ”بیٹا! میں تمہارے لیے ایک نہایت ہی مخلص اور دیانت دار خادم کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ سرِ دست مجھے زید سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا۔ اگر مناسب سمجھو تو اسے ساتھ لیتے جاؤ۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”جب میں آٹھ برس کا تھا تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب میں بڑا ہو کر باہر جاؤں گا تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اس کے بعد وہ جب بھی مجھے ملتا رہا ہے، اس وعدے کی تجدید کراتا رہا ہے۔“

احمد بن حسن نے کہا۔ ”تو پھر اسے بلاؤ! میں اسے چند باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔“

طاہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ آج صُبح سے مسجد میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں اسے چھوڑ کر نہ چلا جاؤں۔“

"بلاؤ اسے!"

طاہر تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ ایک میانے قد کے قوی ہیکل آدمی کو لے آیا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر نہایت درجے کی معصومیت تھی۔

احمد بن حسن نے کہا۔ "زید! تم طاہر کے ساتھ جانا چاہتے تھے تو مجھ سے کیوں نہ کہا؟"

زید نے سادگی سے جواب دیا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ بڑی عمر کے تمام لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہوں گے اور میرا جانا پسند نہیں کریں گے۔"

"تو تم تیّار ہو؟"

"میں بیس سال سے بغداد جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں لیکن جب کبھی مدینے سے کوئی وہاں جاتا ہے، مجھ سے کہتا ہے کہ تم بھیڑیں چرانے کے لیے پیدا ہوئے ہو، بغداد میں کیا کرو گے؟"

احمد بن حسن نے جواب دیا۔ ”لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بغداد میں تمہاری ضرورت ہے۔“

”دیکھئے مُجھ سے مذاق نہ کیجیے۔ میں غریب ہوں لیکن اپنے سینے میں دل ضرور رکھتا ہوں۔ اگر آپ مجھے طاہر کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو صاف کہہ دیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک بے کار آدمی ہوں۔“

احمد بن حسن نے ہنستے ہوئے طاہر سے کہا۔ ”بیٹا! اسے کوئی تکلیف نہ ہو!“ اور پھر زید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”زید! طاہر پرسوں یہاں سے روانہ ہو گا۔ تم تیار ہو کر پہنچ جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔“

طاہر نے کہا۔ ”اس کی بستی میرے راستے میں ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ اسے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“

زید نے کہا۔ ”میری بھی یہی خواہش تھی۔ میری بستی کے لوگ انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ ان کے والد کو سلطان صلاح

الدّین ایوبیؒ نے اپنی تلوار اور گھوڑا انعام دیا تھا۔۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ان میں یہ کوئی نہیں مانتا کہ میں بغداد جا رہا ہوں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں چند روز اِدھر اُدھر رہ کر واپس آ جاؤں گا۔ اگر یہ وہاں سے گزریں گے تو کم از کم میں ان کو شرمندہ ضرور کر سکوں گا۔"

احمد بن حسن نے کہا۔ "اچھا جاؤ! طاہر پرسوں صبح تمہاری بستی میں پہنچ جائے گا۔ اب تمہیں یہاں پہرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میرے وعدے پر اعتبار کرو۔"

"آپ کا وعدہ؟ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے آسمان پر پہنچا دینے کا وعدہ کریں تو بھی یقین کر لوں گا۔"

احمد بن حسن نے زید کو گھوڑا اور سفر کی دیگر ضروریات خریدنے کے لیے ایک معقول رقم دے کر رُخصت کیا۔

(۱۰)

احمد بن حسن سے رخصت ہو کر طاہر نے زید کی بستی کا رخ کیا۔ زید کی بستی

سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اِرد گرد بستی کے چند بچّے جمع تھے۔ ایک گھوڑا درخت سے بندھا ہوا تھا اور زید جنگ کے تمام ضروری اور غیر ضروری سامان سے لیس تھا۔ اس کا فربہ جسم تنگ زرہ میں بہت بری طرح کسا ہوا تھا اور خون کے دباؤ کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو مصروف رکھنے کے لیے نیزہ اور ڈھال کافی تھے۔ پیٹھ پر اس نے دو ترکش باندھ رکھے تھے۔ کمر میں ایک تلوار اور دو خنجر لٹک رہے تھے۔ کمان، کمند اور خوراک کا تھیلا اس نے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

زید نے طاہر کو دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بہت انتظار کروایا۔ لوگ آپ کا انتظار کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔“

طاہر نے کہا۔ ”اب گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، دیر ہو رہی ہے!“

زید گھوڑے پر سوار ہو کر ایک لڑکے سے مخاطب ہوا۔ ”ابراہیم! تمہارا باپ میرا سب سے زیادہ مذاق اڑایا کرتا ہے، جاؤ! اسے کہو۔ میں طاہر کے

ساتھ بغداد جارہاہوں۔ اگر یقین نہیں آتا تو آکر دیکھ لے اور سلیمان! تم بھی اپنی دادی سے کہو، وہ بھی آج یہ کہہ رہی تھی کہ میں بے وقوف ہوں۔ مجھے کون بغداد لے جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ طاہر کی طرف متوجہ ہوا۔ "اصل میں ان لوگوں کا بھی قصور نہیں۔ میں کئی مرتبہ بغداد جاتے جاتے رہ گیا ہوں۔"

طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب چلو! دھوپ تیز ہو رہی ہے۔ جب تم بغداد پہنچ کر بستی والوں کو خط لکھو گے تو انہیں یقین ہو جائے گا۔"

طاہر اور زید نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ بستی سے کچھ دور جا کر طاہر نے مڑ کر دیکھا۔ زید کا چہرہ پہلے کی نسبت زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ کھینچتے ہوئے کہا۔ "زید تمہاری زرہ تنگ ہے؟" زید نے جواب دیا۔ "زرہ تنگ نہیں، میں کچھ زیادہ موٹا ہو گیا ہوں۔ یہ زرہ میں نے دو سال قبل بغداد جانے کے ارادے سے تیس بکریوں کے عوض خریدی تھی۔"

طاہر نے کہا۔ ”تمھیں زیادہ تکلیف تو نہیں دیتی؟“

زید نے اپنا چہرہ شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میرا جسم اتنا نازک نہیں۔“

لیکن دو تین کوس چلنے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”طاہر! میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”اتنی جلدی تھک گئے۔ چلو آگے جا کر تھوڑی دیر ستالیں گے۔“

”طاہر!“ زید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”میرا جسم گھُٹ رہا ہے؟“

طاہر نے حدِ نگاہ پر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو اس نخلستان میں اُتریں گے، وہاں پانی بھی ہے۔ دو پہر وہیں گزاریں گے۔“

زید کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے تیسری بار گھوڑا روکا

اور چلّا کر کہا۔ ”طاہر ٹھہرو! میں قریب المرگ ہوں۔“ اور وہ طاہر کے جواب کا انتظار کیے بغیر گھوڑے سے کود کر تپتی ہوئی ریت پر بیٹھ گیا۔

طاہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے کہ تمہارا جسم اتنا نازک نہیں۔“

زید نے دانت پیس پیس کر زرہ کو اتارنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہیں اترتی۔ خدا کے لیے میری مدد کرو! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہزاروں بچھو مجھے ڈنگ مار رہے ہیں۔“

طاہر نے گھوڑے سے اُتر کر بڑی مشکل سے اس کی زرہ اتاری۔ زید نے کہا۔ ”خدا تمہیں جزا دے۔ مجھے امید نہ تھی کہ یہ اترے گی۔ آج صبح تین آدمیوں نے اسے بڑی مشکل سے میرے جسم پر کسا تھا۔“

طاہر نے کہا۔ ”زرہ اچھی ہے لیکن تمہیں ذرا تنگ ہے۔“

زید نے کہا۔ ”ذرا تنگ ہے؟ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک بے وقوف ہاتھی نے چوہے کے پنجرے میں گھسنے کی سزا پائی ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”اچھا اسے اٹھالو۔ میں بغداد پہنچ کر تمہیں بہت اچھی زرہ لے دوں گا۔ یہ کسی اور کو دے دیں گے۔“

زید نے دونوں ہاتھوں سے ریت کا گڑھا کھودتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے یہیں دفن کرتا ہوں، میں سمجھوں گا کہ میری تیس بکریاں بیماری سے مر گئیں اور نئی زرہ کی مجھے قطع خواہش نہیں۔ میں اس آہنی شکنجے میں پھنس کر دم توڑنے کی بجائے ننگے سینے پر تیر کھالوں گا۔“

زید زرہ کے لیے قبر کھود چکا تھا۔ لیکن طاہر کے سمجھانے پر وہ اسے اپنے گھوڑے کے توبڑے میں ڈال کر ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔

بغداد

گزشتہ پانچ صدیوں میں خانمائے بنو عباس کی پر امن تعمیر نے بغداد کو ایک شاعر کا خواب بنا دیا تھا۔ دریائے دجلہ اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا اور دونوں کناروں کی آبادیوں میں سڑکوں اور نہروں کے جال بچھائے ہوئے تھے۔ بغداد کے محلات اور مکانات گزشتہ پانچ سو برس کے فنِ تعمیر کے ارتقا کی داستان بیان کرتے تھے۔ دنیا بھر کے بہترین باغبانوں نے اس کی مٹی میں جنت کے حسین ترین تصورات زندہ کر دیے تھے۔ بیس لاکھ انسانوں کی یہ بستی خوبصورتی دلفریبی اور رعنائی کے لحاظ سے دنیا کا بہترین شہر تھی۔

لیکن بغداد کی تعمیر کے ساتھ ہی بغداد کے باشندوں کا زوال شروع ہو چکا

تھا۔ اسلام کا وہ دن جس نے صحرائے عرب کی تند و تیز لیکن صحت بخش ہواؤں میں پرورش پائی تھی، اب اس عجمی گہوارے میں سو رہا تھا۔ دربارِ خلافت میں عربوں کا وہ اثر و رسوخ جو خلیفہ مامون کے زمانے سے کم ہونا شروع ہو چکا تھا، اب تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ تاہم حکومت کے ایوانوں سے باہر بغداد کے علمی مراکز میں عربوں کی اہمیت کسی طرح کم نہ ہو سکی۔ انہوں نے ہیئت ، ریاضیات ، تاریخ ، جغرافیہ ، کیمیا، طب ، جرّاحت ، طبعیات کے علوم و فنون میں نام پیدا کیا۔ گرامر ، ادب اور لسانیات پر کتابیں لکھیں لیکن بغداد کے قانع اور آرام پسند باشندوں نے ان علوم کو اپنی تعمیرِ نو کا ذریعہ بنانے کی بجائے دماغی عیاشی کا بہانہ بنا لیا تھا۔ ایران ،ترکستان ، شام اور دور دراز ممالک سے فنونِ لطیفہ کے استاد بغداد پہنچ جاتے اور بغداد کے امراء ان کی سرپرستی کرتے۔

بغداد میں سینکڑوں لائبریریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ ان کتابوں کو پرکھنے کے لیے بہترین نقّاد تھے لیکن پڑھ کر ان پر عمل کرنے والے بہت کم تھے۔ عجمی امراء کی محفلوں میں قرآن اور احادیث کی جگہ

شاعری اور موسیقی نے لے لی تھی۔ خلیفہ کے دربار میں بعض اوقات ایک سیدھے سادے عالمِ دین کی بجائے ایک ہنسانے والے نقال کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور براہِ راست خدا اور رسولؐ کا حکم سنانے والوں کی بجائے خلیفہ کی ذات بابرکات کو اہم ترین فرائض کی بجا آوری سے مستثنیٰ قرار دینے کے لیے تاویلیں پیش کرنے والوں کو الطاف شاہانہ کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔

شہر کے عین وسط میں قصرِ خلد کے نام سے ایک شاندار عمارت تھی جس میں عباسی خلفا رہتے تھے اور اس عمارت کے ارد گرد امیروں اور وزیروں کے محلّات تھے۔ اونچے طبقے کے علما کے لیے بھی ان محلّات تک پہنچنے کے دروازے کھلے تھے اور یہ اس وقت تک کھلے رہتے تھے جب تک کہ ان کے نظریات خلیفہ کے سیاسی مسلک سے ٹکر نہیں کھاتے تھے۔ قصرِ خلد سے دور شہر کے ایک سرے پر دریا کے کنارے ایک وسیع قید خانہ تھا اور اس قید خانے کی سب سے زیادہ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں ان جلیل القدر علما اور اکابرینِ سلطنت کے لیے وقف تھیں جو فتویٰ دیتے وقت عباسی

خلفاء کے جذبات کا لحاظ نہ کرتے تھے، یا جو انہیں اسلام کی کسوٹی پر پرکھنے کی جرأت کرتے تھے۔

حکومت کی نظر میں صرف وہ مفتیانِ شرع قابلِ عزّت تھے جو کسی مجرم کے خلاف فیصلہ سنانے سے پہلے اس کا حسب نسب اور دربارِ خلافت میں اس کا اثر و رسوخ جان لینا ضروری سمجھتے تھے۔ ایک عام آدمی کے لے قتل کی سزا قتل تھی لیکن خلیفہ اور امراء اس سزا سے مستثنیٰ تھے۔ بعض اوقات سلطنت کے واجب الاحترام بزرگوں کی عزّت افزائی کے لیے انہیں اپنے دستر خوان پر جمع کرتے اور خلیفہ کے ملازموں کو بعض اوقات کھانے کے برتن سنبھالنے سے پہلے معزّز مہمانوں میں سے بعض کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا پڑتا۔ دورِ انحطاط کے عباسی خلفاء اپنے مخالفین کو زہر سے ہلاک کرنے کے فن میں کمال حاصل کر چکے تھے اور ایسے زہر بھی دریافت ہو چکے تھے جن کا اثر کھانے والا چند دن کے بعد محسوس کرتا۔ ہر مہمان دعوت میں شریک ہونے سے پہلے سے یہ سوچ لیتا کہ اس نے کسی موقع پر خلیفہ کو ناراض تو نہیں کیا۔ زیرِ عتاب لوگ دعوت نامہ

موصول ہونے پر ہی سمجھ لیتے کہ ان کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن بعض اوقات چند ہوشیار امراء میں اتفاق ہو جاتا تو خلیفہ کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ اقتدار کی جنگ میں اگر خلیفہ مات کھاتا تو اسے ایرانی اور ترک امراء کے ہاتھ کا کھلونا بننا پڑتا ورنہ اگر امراء مغلوب ہوتے تو وہ اس کے آلہ کار بننے پر مجبور ہو جاتے۔

آخری دور میں عباسی خلفاء کو شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ سے جس قدر لگاؤ تھا اسی قدر وہ مذہبی تعلیم سے بیگانہ تھے۔ مذہبی امور کی قیادت کے لیے ایک مرنجان مرنج عالم کو شیخ الاسلام بنا دیا جاتا تھا اور سیاسی امور خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا۔ سیاست اور مذہب کی تقسیم اسلام کے لیے سب سے بڑا فتنہ تھی۔ شیخ الاسلام کا قلم خلیفہ کی تلوار کا مطیع بن چکا تھا۔

عزّت اور معقول تنخواہ کے لالچ نے شیخ الاسلام کی مسند کو بیشتر علما کی منزلِ مقصود بنا دیا تھا اور اس منزل کی راہ میں دوسروں سے متصادم ہو کر وہ ان کے نظریات باطل قرار دینے اور ان پر کیچڑ اچھالنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ گزشتہ صدیوں میں علمائے حق کے اجتہاد میں فقط خدمتِ

دین کا جذبہ کار فرما رہا۔ انہوں نے بغداد کے گمنام گوشوں میں بیٹھ کر اسلام کی شاندار خدمات سر انجام دیں لیکن وہ لوگ جن کی پرواز کی آخری منزل سرکاری علما کی کرسیاں ہوا کرتی تھیں، بعض اوقات ان بزرگوں کی مخالفت کر کے اور بعض اوقات ان کے نام کا سہارا اور ان کے فتوؤں کی آڑ لے کر اپنی اہمیت بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر شیخ الاسلام کسی امام کے مسلک کا پابند ہوتا تو وہ کسی دوسرے امام کے مسلک کو زیادہ صحیح قرار دے کر اس کے ساتھیوں کو مناظرے کی دعوت دیتا اور بغداد کے بے فکر لوگ جس دلچسپی کے ساتھ شہر کے چوکوں میں جمع ہو کر راگ سنتے اور نقّالوں کے تماشے دیکھتے تھے اس سے کہیں زیادہ ان علما کے مناظروں میں دلچسپی لیتے تھے۔

مناظرے کی ابتدا ایک دوسرے کو سمجھنے کی نیک خواہش کے اعلان کے ساتھ ہوتی۔ ایک تقریر کرتا اور دوسرا اطمینان کے ساتھ سنتا۔ پھر وہ بیٹھ جاتا اور صاحبِ صدر کی اجازت سے مخالف جماعت کا لیڈر اُٹھ کر جواب دیتا۔ پھر دونوں کی زبانیں آہستہ آہستہ تیز ہونے لگتیں۔ جب گالیوں

تک نوبت پہنچ جاتی تو دونوں اٹھ کھڑے ہو جاتے۔ ایک اپنے مدِّ مقابل کی سات پُشتیں گِنتا، دوسرا اس کی بیس پُشتیں گن ڈالتا۔ ایک ، دو تین زبانوں کی منتخب شدہ گالیاں پیش کرتا اور دوسرا چھ سات زبانوں کی چیدہ چیدہ و گالیاں سنا دیتا اور پھر دونوں اپنے اپنے گروہ سے ہمدردی رکھنے والے عوام سے مخاطب ہو کر انہیں گالیوں کا مطلب سمجھاتے اور جب عوام کا جوش انتہا کو پہنچ جاتا تو دونوں طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوتا اور دونوں گروہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے اور آن کی آن میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ آخر پولیس اور فوج کی لاٹھیاں اس کھیل کو ختم کرتیں۔ حکومت نے مناظروں کو تو بند نہ کیا، یہ حکم جاری کر دیا کہ وہاں کوئی آدمی مسلح ہو کر نہ جائے۔ چنانچہ مناظرہ شروع ہونے سے پہلے مناظر ایک دوسرے کو یقین دلاتے کہ ان کی پارٹی کا کوئی آدمی مسلح نہیں ہے۔ اس پابندی نے لڑائیوں کو خطرناک بنانے کے ساتھ مکّہ بازی اور کشتی کے فن کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ گتھم گتھا ہو جانے کے بعد ایک دوسرے کی داڑھی نوچنا اور قبا پھاڑنا بغداد کے عوام کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ بن چکا تھا۔ علما پر ہاتھ اٹھانا خلافِ ادب سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی

مناظرین اور صاحبِ صدر ہجوم میں پھنس کر پِٹ جاتے تھے۔

ان مناظروں میں کئی نئے مسائل پیدا ہوئے اور پھر یہ مسائل بغداد کے لیے وقت کا اہم ترین موضوع بنتے گئے۔ ان مناظروں میں شہرت حاصل کرنے والے علما کو امرا کی مخصوص محفلوں میں بلایا جاتا اور وہاں ان کے درمیان لگاتار کئی کئی دن تک بحث ہوتی رہتی۔ امرا شیخ الاسلام سے کوئی فتویٰ پوچھتے اور پھر اس کے بارے میں نامور مناظرین کی رائے لی جاتی۔ اختلاف کی صورت میں خلیفہ کے سامنے ان کا مناظرہ ہوتا اور خلیفہ کا فیصلہ عام طور پر اس کے حق میں ہوتا جس کی زبان زیادہ تیز ہوتی یا دورانِ بحث خلیفہ سے علم و فضل کی ثناخوانی کر کے یہ ثابت کر دیتا کہ اس کے علم اور خلیفہ کے مقاصد میں ٹکر نہ ہو گی۔

ان تمام قباحتوں کے باوجود اگر خلیفہ اور بغداد کے عوام عربوں کا وہ سپاہیانہ شعار جس نے پہلی صدی میں انہیں آدھی دنیا کا حکمران بنا دیا تھا، ترک نہ کرتے تو بغداد اور اس کے ساتھ باقی عالمِ اسلام کو ایک عبرتناک تباہی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ولید بن عبد الملک کے زمانے میں عربوں نے

جس قدر افواج کے ساتھ سندھ، ترکستان اور چین کے ممالک فتح کیے تھے، عبّاسیوں کے پاس دورِ انحطاط میں بھی اس سے تین گنا فوج تھی اور وہ عالمِ اسلام پر کسی بڑی سے بڑی یلغار کو روک سکتے تھے لیکن اموی اور عباسی خلفاء میں یہ فرق تھا کہ اوّل الذّکر اپنی فوج کا آخری سپاہی تک دور دراز کے محاذوں پر بھیج دیتے تھے اور عباسی خلفاء بغداد کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے دو تین لاکھ تلواروں کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چونکہ اموی خلفا کی افواج دور دراز کی غیر اسلامی سلطنتوں سے برسرِ پیکار رہیں، اس لیے وہ کسی اندرونی خلفشار میں حصے دار نہ بنیں اور ان کی ہر نئی فتح کی خبر عوام میں مرکز کی اطاعت کا جذبہ بیدار کرتی رہی۔ وہ ایک لڑی میں منسلک ہوتے چلے گئے اور اگر کبھی کوئی بغاوت بھی اٹھی تو افواج نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کے علاوہ اموی خلفا نے فوج میں مختلف قبائل کے سپاہیوں کی علیحدہ علیحدہ جتھ بندی نہ ہونے دی۔ ہر قوم، ہر ملک اور ہر قبیلے کا سپاہی ان کی فوج میں مساوی درجہ رکھتا تھا اور اعلیٰ منصب پر فائز ہونے والے ہر آدمی کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔ ایک قبیلے کے سردار کا بیٹا ایک معمولی سپاہی اور اس

قبیلے کا ایک عام آدمی اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت اس فوج کا سپہ سالار بن سکتا تھا۔

لیکن عباسیوں کے اقتدار کے ساتھ عالمِ اسلام میں جس انتشار و افتراق کی ابتدا ہوئی، وہ عباسی خلفا کے انحطاط کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ عظیم الشّان سلطنت جس کی بنیاد بنو اُمیّہ کی سطوت کے کھنڈروں پر رکھی گئی تھی، پارہ پارہ ہو گئی۔ مختلف ممالک کے امراء خود مختار سلاطین بن چکے تھے۔ حد یہ تھی کہ اگر عباسی خلفا بغداد کی مساجد میں اپنے نام کے ساتھ ان سلاطین کے نام کا خطبہ پڑھوانا منظور کرتے تو وہ بھی اپنے ممالک کی مساجد کے خطبوں کو خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کی اجازت دے دیتے۔ سلجوقی سلاطین کے اقتدار کے زمانے میں عباسی خلفا ان کے ہاتھوں کے کھلونے تھے۔ عباسی خلفا نے جن ترک اور ایرانی امیروں کو بغداد میں جمع کر رکھا تھا۔ ان کے قبائل کے سپاہیوں کی قیادت ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ خلیفہ، سپہ سالار یا وزیر اعظم سے سپاہیوں کی اطاعت، اپنے قبیلے کے امیر کی اطاعت کے ساتھ مشروط تھی اور خلفا کے جاسوس

ان امرا پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اگر کسی سے سازش کا خطرہ ہوتا تو اسے اور اس کے قبیلے کے سپاہیوں کو یا تو کسی باغی سلطان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا یا کسی اور طریقے سے ختم کر دیا جاتا۔

اسی طرح امرا کے جاسوس بھی خلیفہ کے ارادوں سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ایک طرف تاریخ اگر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ایک موقع پر خلیفہ کے دستر خوان سے برتنوں کے ساتھ چند لاشیں بھی اٹھائی گئیں تو دوسری طرف ہمیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین ایک دِن غسل کے ارادے سے حمام میں داخل ہوئے اور ایک ساعت کے بعد وہاں سے ان کی لاش نکالی گئی۔

ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ بغداد کے لوگ عباسی خلفا کو کس حد تک چاہتے تھے لیکن تاریخ ایسے خلفا کے نام بتاتی ہے جنہوں نے یہ محسوس کر کے کہ لوگ موت کے بعد ان کی لاشوں کی بے حرمتی نہ کریں، اپنی قبروں کے ساتھ ساتھ سو سو خالی قبریں بنانے کی وصیت کی تھی تاکہ لوگ آسانی سے ان کی قبر کی تلاش نہ کر سکیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عالمِ اسلام کی حسن بن صباح اور اس کے جانشینوں سے واسطہ نہ پڑتا تو دولتِ عباسیہ کے تنزّل کی رفتار شاید اس قدر تیز نہ ہوتی۔ ملک شاہ سلجوقی کی وفات اور اس کے وزیرِ اعظم نظام الملک کے قتل کے بعد عالمِ اسلام میں اس خطرناک تحریک کا سدِّباب کوئی نہ کر سکا اور حسن بن صباح کے پیرو گزشتہ صدی میں عالمِ اسلام کے درخشندہ ستاروں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ وہ با عمل علما جن سے عالمِ اسلام کی راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی، ایک ایک کر کے قتل کئے جا چکے تھے۔ چنانچہ جب خوارزم اور بغداد پر تاتاریوں کی افواج قہرِ الٰہی بن کر نازل ہونے والی تھیں، عالمِ اسلام ایک خوفناک قحط الرّجال کا سامنا کر رہا تھا۔

(۲)

بغداد پہنچ کر یوسف نے چار دن قاضی فخر الدّین کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران وہ بغداد کے چند گلی کوچوں، درس گاہوں اور کتب خانوں سے واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ قاضی فخر الدّین کے اپنے کتب خانے میں پانچ

ہزار سے زائد کتابیں تھیں۔ فقہ، منطق اور تاریخ پر وہ خود کئی کتابیں لکھ چکا تھا۔ یہ کتابیں قاضی فخر الدّین کے لیے معقول آمدنی کا ذریعہ تھیں۔ طاہر نے اپنے باپ کے پرانے رفیق محسن کا پتہ معلوم کیا لیکن یہ معلوم ہوا کہ اس کا سارا خاندان مصر جا کر آباد ہو گیا ہے۔

فخر الدّین کے مکان میں طاہر اور زید کے گھوڑوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے اس نے یہ گھوڑے اپنے ایک پڑوسی کے اصطبل میں بھجوا دیے تھے۔ طاہر نے آتے ہی اپنے لیے ایک علیحدہ مکان کی ضرورت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن فخر الدّین چار دن تک ٹالتا رہا۔ پانچویں دن اُس نے اپنے شاگردوں سے طاہر کے لیے ایک کرائے کا مکان تلاش کرنے کے لیے کہا۔ ایک یہودی دلال نے اسے دو مکانات دِکھانے کے بعد بتایا کہ اگر وہ انہیں خریدنا چاہیں تو بہت سستے مل جائیں گے۔

بغداد کے بعض امراء نے تو ہندوستان، خوارزم، مصر اور اندلس کے سلاطین کی ملازمتیں اختیار کر لی تھیں اور ان کے عالی شان مکان نہایت ارزاں قیمت پر بِک رہے تھے۔ طاہر اور زید نے جتنے مکانات دیکھے، ان

میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے خریدنے کے لیے زید نے بے تابی ظاہر نہ کی ہو لیکن طاہر نے قاضی فخر الدّین کا مشورہ لینا ضروری سمجھا اور شام کو جب اس نے مکان خریدنے کے متعلق قاضی کی رائے دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ ”خالی مکانوں کی قیمت بہت گِر چکی ہے۔ تم اپنا مستقبل بغداد کے ساتھ وابستہ کر چکے ہو۔ یہاں اعلیٰ علاقے کے لوگ کرائے کے مکانات میں رہنے والے لوگوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لوگ تمہارے علم و فضل اور سپاہیانہ خوبیوں کا اندازہ لگانے سے پہلے تمہارا مکان دیکھیں گے۔ اگر تمہارے پاس مکان خریدنے کے لیے معقول رقم ہے تو ضرور خرید لو لیکن یہ ضروری ہے کہ مکان خریدنے کے بعد تمہارے پاس دو چار سال کے اخراجات کے لیے کافی رقم ہو۔ صلاح الدّین ایوبی کی تلوار تمہیں بغداد کی بڑی سے بڑی شخصیت سے متعارف کرا دے گی۔ لیکن یہ لوگ قلاش آدمی کے ساتھ زیادہ دیر دوستی نہیں رکھتے۔ بغداد میں جو منصب ذاتی قابلیت نہیں خرید سکتی وُہ تحائف خرید سکتے ہیں۔“

طاہر نے اپنی جیب سے تھیلی نکالی اور اسے کھول کر فخر الدّین کے سامنے جواہرات ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان کی قیمت کا علم نہیں۔ کیا آپ انہیں ایک مکان خریدنے اور چند سال کی ضروریات کے لیے کافی سمجھتے ہیں؟“

قاضی ایک لمحہ کے لیے حیران ہو کر جواہرات کی طرف دیکھتا رہا اور بالآخر بولا۔ ”اگر یہ جواہرات نقلی نہیں تو تم قصرِ خلد کے سوا بغداد کی ہر عمارت خرید سکتے ہو لیکن علم و فضل اور دولت کبھی اکٹھے نہیں ہوتے۔ تم نے یہ کہاں سے لیے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”یہ بھی سلطان صلاح الدّین ایوبی نے دیے تھے۔“ قاضی فخر الدّین نے چند ہیرے اپنی تھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”تم بغداد کے امیر ترین آدمیوں میں سے ہو۔ تم اپنے لیے ترقی کا کوئی دروازہ بند نہیں پاؤ گے۔ لیکن سنو! تمہارے سوا کسی اور کو تو اِن کا علم نہیں؟“

”صرف چچا احمد کو علم ہے۔“

”اور زید؟“

”اس کو میں نے نہیں بتایا لیکن بتادوں تو وُہ قابلِ اعتماد ہے۔“

فخر الدّین نے جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور واپس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تمہارے لیے اِن جواہرات کو چھپا کر رکھنا بہتر ہو گا!“

طاہر نے حیران ہو کر سوال کیا۔ ”کیا بغداد میں چوری بھی ہیں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بغداد میں چوروں کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں لیکن تمہیں ایسے متمدن ڈاکوؤں سے خطرہ ہے جن کے ہاتھ چومے جاتے ہیں۔“

”آپ کا مطلب۔۔۔۔۔۔؟“

”میں کسی خاص آدمی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ دربار کے امراء میں سے چند

ایسے ہیں جو ایسے قیمتی جواہرات کی ہوس میں اخلاقی قیود کی پروا نہیں کرتے اور جب تک تم اجنبی جو تمہیں ایسے لوگوں سے باخبر رہنا چاہیے!"

"کیا وہ مجھ سے زبردستی چھین لیں گے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "وہ اتنے بیوقوف نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے ہیں کہ زبردستی کرنے والے فوراً منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔"

"کیا خلیفہ ایسے لوگوں سے باز پُرس نہیں کرتا؟"

"خلیفہ ایسے لوگوں سے باز پُرس کرے تو دربار میں اسے بیش قیمت تحائف کون پیش کرے! اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر شخص کی آواز خلیفہ تک پہنچ سکے۔ عوام کو ان کا دیدار صرف عید کے موقع پر نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی کافی دُور سے۔ بغداد میں تمہارا کوئی اثرورسوخ نہیں۔ امراتمہارے خلاف کئی سازشیں کرسکتے ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم خوارزم شاہ کے جاسوس ہو اور تم پر مقدمہ چلائے بغیر خلیفہ سے تمہارے قتل کا حکم حاصل کرسکتے ہیں!"

”کیا ایسے موقع پر سلطان صلاح الدّین ایوبی کی تلوار مجھے بے گناہ ثابت نہ کر سکے گی؟“

”وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حکومتِ مصر نے تمہیں سلطنتِ بغداد کا تختہ اُلٹنے کے لیے بھیجا ہے؟“

طاہر نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے دولت سے محبت نہیں، میں بغداد میں ایک بہت بڑا مقصد لے کر آیا ہوں۔ میں دربارِ خلافت میں رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ خلیفہ کا ایک نیک نیّت مشیر بن کر حکومت کی خارجہ حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کر سکوں۔ عالمِ اسلام اس وقت مختلف اطراف سے خطرناک آندھیوں کا سامنا کر رہا ہے۔ گزشتہ صلیبی جنگوں میں دربارِ خلافت کی لاتعلقی اور غیر جانب داری سے مغرب کے نصرانی حکمرانوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ سلطان صلاح الدّین ایوبی نے انہیں عبرت ناک شکستیں دے کر شام و فلسطین سے نکالا لیکن ہلال و صلیب کے ان فیصلہ کُن معرکوں میں دربارِ خلافت کا طرزِ عمل بہت مایوس کُن تھا۔ شکست کے باوجود اہلِ یورپ پر ان معرکوں نے

ثابت کر دیا ہے کہ خلیفہ کو بغداد کے سوا باقی عالمِ اسلام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اہم ترین محاذ پر بھی چند رضا کاروں سے زیادہ نہیں بھیج سکتا۔ اس لیے وہ از سرِ نو منظم ہو کر مصر کی سلطنت کو تاخت و تاراج کرنا چاہتے ہیں اور یہ سلطنت عیسائیت کے سیلاب کے سامنے عالمِ اسلام کی آخری دیوار ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دیوار تنہا اس طوفان کا رُخ بدل دے لیکن شمال مشرق سے چنگیز خان کی صورت میں ایک نیا طوفان اٹھ رہا ہے اور اس طوفان کو اگر سلطنت خوارزم کی حدود کے پار نہ روکا گیا تو کسی دن یہ بغداد کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ بغداد کی چھاؤنی میں ایک بڑی فوج موجود ہے لیکن بغداد فوج کے سرداروں کی سازشوں کا مرکز صرف اس لیے بنا ہوا ہے کہ ان کے سامنے کوئی مشترکہ محاذ اور بلند نصب العین نہیں۔ ان کی زندگی اس جہاز رانوں کی زندگی نہیں جو نئے ممالک اور نئے راستے تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے حسد و بغض رکھنے کی بجائے انہیں اپنا دست و بازو سمجھ کر ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ خطرناک طوفان اور مہیب بھنور ایسے ملّاحوں میں انتشار پیدا کرنے کی بجائے ان کے اتّحاد و اتفاق کے رشتے اور زیادہ

مضبوط کرتے ہیں۔ لیکن بغداد کے لوگ ان مچھیروں کی طرح ہیں جو چھوٹے سے جوہڑ میں مچھلیوں کی تقسیم پر لڑ رہے ہوں۔ جنہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ یہ دنیا ناپید کنار سمندر ہے اور اگر وہ اس سمندر میں اٹھتی ہوئی موج نہ بن سکے تو سمتِ مخالف سے اٹھتے ہوئے طوفانوں کی موجیں ان پر چھا جائیں گی۔ انہیں یہ بتانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، اس فرض کے احساس نے مجھے بغداد آنے پر آمادہ کیا اور گھر سے رخصت ہونے سے چند دن قبل مجھے یہ علم نہ تھا کہ میری مشکلات کو آسان بنانے کے لیے میرے پاس اس قدر دولت بھی ہے۔ صلاح الدّین ایوبی کے خون اور پسینے کا ہر قطرہ خدمت اسلام کے لیے وقف تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی عطا کردہ دولت سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام دوں۔ اس لیے مجھے یہ دولت اپنے لیے سنبھالنے کا اس قدر شوق نہیں جس قدر اسلام کی راہ میں خرچ کرنے کی خواہش ہے۔ اگر مجھے محسوس ہوا کہ اس پر کسی امیر کی نگاہ ہے تو میں ان جواہرات کو بغداد کے مفلس اور نادار لوگوں میں لُٹا دوں گا۔ کسی زبردست امیر کے خزانے میں جانے نہ دوں گا۔ جو مقاصد میں نے آپ پر ظاہر کیے ہیں، ان کے حصول کے لیے دربارِ خلافت تک میری رسائی

ضروری ہے۔ گزشتہ چار دن میں مَیں نے بغداد کے متعلق جو اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ عوام اب بھی ایک صحیح نصب العین پر جمع ہو سکتے ہیں۔ صرف امراء کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس مکان کا فرش اور دیواریں سلامت ہیں۔ صرف چھت میں شگاف پڑے ہوئے ہیں اور چھت تک پہنچنے کے لیے آپ کی رہنمائی ضروری سمجھتا ہوں۔"

قاضی فخر الدّین نے کہا۔ "خدا تمہارے نیک ارادے پورے کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں تمہاری پہلی ضرورت ایک عالی شان مکان ہے۔ تمہارے اصطبل میں بہترین گھوڑے ہونے چاہیں۔ اگر تم بغداد کے میدان میں چوگان اور نیزہ بازی میں مقام پیدا کر سکے تو بہت جلد امرا کی نظروں میں آ جاؤ گے اور اس کے بعد ان میں سے ایک دو قیمتی ہیروں کا تحفہ تمہیں دربارِ خلافت تک پہنچا دے گا۔ اس کے بعد تم اپنے علم کا لوہا منوا سکو گے اور اگر خدا کو بغداد کا مستقبل بہتر بنانا مقصود ہوا تو خلیفہ کے معتمد بھی بن سکو گے۔ لیکن سرِ دست اپنے ارادے کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ خوارزم شاہ کو خلیفہ اپنا بد ترین دشمن سمجھتا ہے اور اس

دشمنی کی ذمّہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس نے بغداد پر چڑھائی کر کے سخت عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن خلیفہ نے اگر خوارزم کی سلطنت مٹانے میں چنگیز خان کی حمایت کی تو غلطی نا قابلِ تلافی ہو گی۔ قاضی فخر الدّین نے ایک ہیرا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے جواہرات کے متعلق کوئی علم نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ صرف ایک ہیرا تمہارے لیے بغداد میں نہایت اچھا مکان خرید سکے گا۔ ایک آرمینی تاجر کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ چلو اس کے پاس چلیں! باقی ہیرے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لو۔ وہ تاجر قابلِ اعتماد ہے لیکن اسے یہ نہ بتانا کہ تمہارے پاس اس قسم کے اور ہیرے بھی ہیں۔"

عصر کی نماز کے بعد طاہر اور قاضی فخر الدّین تاجر کے پاس پہنچے۔ اس نے ہیرا ہاتھ میں لے کر ایک لمحہ دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ "آپ نے یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے؟"

طاہر کی بجائے قاضی نے جواب دیا۔ ”یہ ایک بہت بڑے آدمی کا تحفہ ہے۔“

تاجر نے کہا۔ ”میں شاید فوراً اس کی قیمت ادا نہ کر سکوں لیکن اگر آپ منظور کریں تو میں اس کی آدھی قیمت اس وقت اور آدھی کل صُبح تک ادا کر دوں گا۔“

قاضی نے سوال کیا۔ ”کیا قیمت ہو گی اس کی؟“

تاجر نے ہیرے کو دو تین بار غور سے دیکھا۔ ”میں اس کے ۵۰ ہزار دینار دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”پچاس ہزار؟“ قاضی نے حیران ہو کر سوال کیا۔ لیکن سوداگر نے اس کی حیرانی کا مطلب اُلٹ سمجھتے ہوئے ہیرے کو پھر غور سے دیکھا اور کہا۔ ”دیکھیے! آپ میرے دوست ہیں۔ میں ساٹھ ہزار تک دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس سے زیادہ اس کی قیمت بغداد میں اور کوئی نہیں دے گا۔“

قاضی کو بغداد کے مشہور یہودی جوہری سے زیادہ کی امید تھی لیکن وہ

اس ہیرے کو کسی ایسی دکان پر فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا جہاں امرا کے جاسوس ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس ایک ہیرے کی قیمت سن کر اسے احساس ہو گیا تھا کہ طاہر اس کے اندازے سے کہیں زیادہ دولت مند ہے۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ اسے غور سے دیکھیں۔ اس ہیرے کی قیمت ۷۰ ہزار سے کم نہیں ہونی چاہیے۔“

سوداگر نے کچھ دیر جھگڑے کے بعد پہلے دو ہزار کی چھلانگ لگائی اور پھر پانچ پانچ سو کر کے چونسٹھ ہزار تک پہنچا۔ بالآخر چونسٹھ ہزار پانچ سو دینار پر فیصلہ ہوا۔

(۳)

رات کے وقت جب قاضی فخر الدّین، طاہر اور اپنے چند مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو زید موجود نہ تھا۔ فخر الدّین نے اپنے خادم سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ چوک مامونیہ میں ایک عظیم الشّان مناظرہ ہے اور زید مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھا کر وہاں چلا گیا ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد طاہر اپنے کمرے میں بیٹھا شمع کی روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ جوں جوں رات جارہی تھی، زید کے متعلق اس کی تشویش بڑھ رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی اُٹھ کر دروازے سے باہر جھانکتا اور پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ایک شمع ختم ہونے کے بعد اس نے دوسری شمع جلائی اور کُرسی سے اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ چند بار اس کے دل میں خیال آیا کہ چوک ماموِنیہ میں جاکر زید کو تلاش کرے لیکن ہزاروں انسانوں کے انبوہ میں زید کو ڈھونڈ نکالنا ناممکن خیال کرتے ہوئے وہ ارادہ تبدیل کر دیتا۔

آدھی رات کے قریب کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے بعد طاہر کو قاضی کا ایک خادم دوسرے سرے سے یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ ”اُٹھو دروازہ کھولو۔ شاید زید آیا ہے۔“

اور دوسرا خادم یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ ”تم خود کیوں نہیں کھولتے؟“

ایک لمحے کے بعد طاہر کو دروازہ کھلنے کی آہٹ اور قاضی کے خادم کے

قہقہے سنائی دیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”حمید ذرا زید کی صورت ملاحظہ کرو!“ پھر دونوں ہنس رہے تھے۔ ایک خادم کہہ رہا تھا۔ ”دیکھا۔ ہم نے تمہیں منع کیا تھا۔ شکر کرو آنکھ بچ گئی!“

طاہر نے جلدی سے کروٹ بدلی اور اپنا چہرہ چادر میں ڈھانپنے کے بعد آنکھ کے لیے تھوڑا سا رستہ بنا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ زید بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ دائیاں گال اور ناک سوجی ہوئی تھی اور بائیں آنکھ کے نیچے کسی طاقت ور ہاتھ کے مکّے کا نشان تھا۔ زید تھوڑی دیر اپنے بستر پر بیٹھ کر اٹھا اور دیوار کے ساتھ لٹکتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی صورت دیکھنے کے بعد بولا۔ ”دوست! اب میں بھی تمہیں مشکل سے پہچان سکتا ہوں۔ اچھا تماشہ دیکھنے گئے تھے تم!“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنا گال سہلاتا ہوا پھر بستر پر آ بیٹھا۔

”زید تم آ گئے!“ طاہر نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ زید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی اس نے اپنے چہرے سے چادر اٹھا کر اس کی صورت نہیں دیکھی، فوراً اُٹھ کر

شمع بجھادی اور اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں میں آگیا ہوں۔

"بہت دیر لگائی تم نے۔ کیا سیکھا وہاں!"

"گالیاں!" زید نے مغموم آواز میں جواب دیا۔

"تمہاری آواز بہت مغموم ہے۔ خیر تو ہے؟"

زید نے ایک اداسی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

طاہر نے کہا۔ "تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ناک میں تکلیف ہے؟" زید نے بستر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "ناک سے زیادہ میری آنکھ میں تکلیف ہے!"

طاہر کھکھلا کر ہنس پڑا۔

زید نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "طاہر! ایک مسلمان پر بلاوجہ ہاتھ اٹھانا گناہ ہے؟"

طاہر نے جواب دیا "کسی شخص پر بھی بلاوجہ ہاتھ اُٹھانا گناہ ہے۔"

”لیکن اگر کوئی بلاوجہ گلے پڑے تو؟“

”تو ہمیں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کے قانون پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن در گزر کرنا زیادہ اچھا ہے۔“

”میں نے بہت در گزر کی لیکن ناک پر چوٹ کھانے کے بعد انسان کی طبیعت میں سکون نہیں رہتا۔ میں نے انہیں باقی مکے تو معاف کر دیے تھے لیکن ناک اور آنکھ کے بارے میں بے اعتنائی نہ برت سکا۔ پھر بھی مجھے شک ہے کہ کوشش کے باوجود میرا کوئی مکا نشانے پر نہیں پڑا۔ میں تمام عمر تیر اندازی اور تلوار چلانا سیکھتا رہا ہوں لیکن یہاں آکر محسوس ہوا ہے کہ بغداد میں رہنے کے لیے مکہ بازی اور کشتی لڑنے کا فن سیکھنا بھی ضروری ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم مناظرے کے اختتامی کاروائی میں پورا حصہ لے کر آئے ہو۔“

”مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا اختتام اس طرح ہو گا۔ لیکن یقین کیجئے کہ ہاتھا

پائی کے وقت بالکل الگ تھلگ کھڑا تھا۔ اگرچہ مجھے اس موٹے تازے اور بھاری آواز والے مناظر کے مقابلے میں ایک نحیف ولاغر اور نہایت باریک آواز والے عالم سے ہمدردی ہو چکی تھی۔ پھر بھی میں فساد کے وقت ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن جب دو بزرگ صورت ایک دوسرے کی داڑھی میں ہاتھ ڈالے گالیاں دیتے ہوئے میرے قریب آ گئے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں ان کے بیچ میں کود پڑا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا لیکن وہ بدستور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے اور میں ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں تین اور نوجوان آ گئے اور وہ ان دو میں سے ایک بوڑھے پر ٹوٹ پڑے۔ میری مداخلت سے اُسے تو بھاگ کر نہر میں کودنے کا موقع مل گیا لیکن وُہ تینوں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں بہترا چلّایا کہ بھائی میں ایک اجنبی ہوں لیکن کسی نے میری نہ سُنی اور میں نے محسوس کیا کہ میں بری طرح پِٹ رہا ہوں اور اس بوڑھے نے جس کو شاید یہ رنج تھا کہ میں نے اس کے حریف کو بھاگنے کا موقع کیوں دیا ہے، اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا گریبان پھاڑ دیا۔ میں نے اپنی ناک اور آنکھ پر

چوٹ کھانے سے پہلے ان پر ہاتھ نہ اٹھایا۔ اس کے بعد میرے چند مکے خالی گئے۔ تاہم ایک آدمی میری چپت کھا کر زمین پر بیٹھ گیا اور دوسرا مکہ کھا کر لیٹ گیا۔ تیسرے نے میرے مکے کو خطرناک سمجھتے ہوئے میرے ساتھ کشتی شروع کر دی۔ اس نے مجھے تین بار زمین پر پٹخ دیا۔ چوتھی بار ہم ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ مجھے ندی میں گرانے کی کوشش میں وہ خود بھی میرے ساتھ گر پڑا۔ خوش قسمتی سے پانی تھوڑا تھا ورنہ میں ڈوب جاتا۔ ندی میں لڑتے ہوئے میں نے اسے دو تین مکے رسید کیے اور اس نے ہار مان لی۔ اب خدا کرے میرے مکے اس کی ناک اور آنکھ پر گئے ہوں۔۔۔۔۔۔ طاہر! میرے خیال میں یہاں تیراکی سیکھنا بھی ضروری ہے۔ کیا آپ تیرنا جانتے ہیں؟" طاہر نے جواب دیا۔ "بہت معمولی لیکن میرا ارادہ ہے کہ میں ہر صبح دریا میں مشق کیا کروں۔ ایک سپاہی کے لیے ایک اچھا تیراک ہونا بھی ضروری ہے۔"

"میں بھی سیکھوں گا۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد زید نے کہا۔ "طاہر! آپ مجھ سے خفا تو

نہیں!“

”کس بات پر؟“

”میں پوچھے بغیر مناظر سُننے چلا گیا تھا۔“

”اگر یہ تجربہ مفید ہو تو میرے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔“

”مفید۔۔۔؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساری عمر مناظرہ سُننے نہیں جاؤں گا۔ لیکن آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔۔۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ آج اس مناظرے کے چالیسویں رات تھی۔ چالیس دنوں میں ہر گروہ کے مناظر اپنے دعویٰ کو صحیح اور اپنے مدِّمقابل کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”ایسے لوگ ہزار برس میں بھی ایک دوسرے کو

قائل نہیں کر سکیں گے۔"

"لیکن کیوں؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ مناظر ایک دوسرے کو سمجھنے اور حق بات ماننے کی نیک خواہشات لے کر ایک دوسرے کے سامنے نہیں جاتے۔ ان کا مقصد اپنی قوّتِ بیان کا اظہار ہے۔ آئمہ اسلام جن کے نام پر لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے پر اس طرح کفر کے فتوے نہیں لگاتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام میں اجتہاد کے دروازے کھول کر اسے ہر زمان و مکان کے لیے ایک زبدہ تحریک بنا دیا جائے اور لوگ انہی کے نام کی آڑ لے کر اسلام میں افتراق و انتشار کا بیج بوتے ہیں!"

"لیکن اس کا علاج؟"

"اس کا علاج یہ ہے کہ ان پُر امن لوگوں کے لیے میدانِ عمل تلاش کیا جائے۔ اگر ہمارے سامنے میدانِ عمل ہو تو ان علما سے جو امن کے

زمانے میں مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا کرنے کی خدمت سر انجام دے رہے ہیں مسلمانوں کی اجتماعی قوّت کو منظم اور مستحکم کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس زمانے میں بھی مسلمان فتوحات کا شوق لے کر گھروں سے نکلے۔ ان میں اعتقادات کے بارے میں کبھی سر پھٹول نہ ہوئی۔ گھر پر اسلام کی فتح کی خواہش ان میں ہمیشہ اتحاد و تنظیم کا جذبہ پیدا کرتی رہی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مسلمانوں کی افواج بیک وقت سندھ، ترکستان اور اندلس میں لڑ رہی تھیں لیکن ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان مجاہدین نے کبھی مناظرہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو اور آج جب کہ ہمیں اُفق پر تباہی کا طوفان دکھائی دے رہا ہے، ہمارے علما گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے اپنے گھر میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ جس قوم کی تلوار نیام میں چلی جاتی ہے اس کا قلم بھی غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

زید نے کہا۔ ”بازار میں افواہ گرم ہے کہ مغرب کے نصرانی بادشاہ مصر پر ایک زبر دست حملے کے تیّاری کر رہے ہیں اور شاید چنگیز خان بھی خوارزم پر حملہ کر دے۔ اگر خلیفہ نے ان لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان

کر دیا تو میں سب سے پہلے ان دو علما کے پاس جاؤں گا اور یہ کہوں گا کہ آؤ میں تیغ و کفن باندھ کر میدان میں جا رہا ہوں۔ اسلام کی جس محبت کا مظاہرہ تم چوک مامونیہ میں کیا کرتے ہو۔ ایک دن میدانِ جنگ میں بھی اس کی نمائش ہو جائے! آپ نے مجھے زرہ خرید کر دینے کا وعدہ کیا تھا؟"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ لیکن تم زرہ پہننے سے سخت نفرت کا اظہار کر چکے ہو۔"

"اس وقت میرا جسم دُکھ رہا تھا۔ آج میں نے فوجیوں کو دیکھا۔ نئی زرہ جسم پر اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں تمہیں کل نئی زرہ لے دوں گا۔"

"اور خود بھی؟"

"خود بھی لے لوں گا۔"

"آپ تیرنا بھی سکھائیں گے نا مجھے؟"

"وہ بھی سکھا دوں گا۔"

زید نے تھوڑی دیر بعد پھر کہا۔ "طاہر ! میں نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی۔"

"وہ کیا؟" طاہر نے جمائی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"جب میں ندی سے باہر نکل کر اس طرف آ رہا تھا۔ مجھے راستے میں وہ بُوڑھا دکھائی دیا جس نے میری قمیص پھاڑ دی تھی اور میں نے بغیر سوچے سمجھے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔"

"بہت بُرا کیا تم نے۔ اگر وہ کبھی ملے تو اس سے معذرت کرنا!"

"معذرت قبول کرنے والوں سے تو وہ بھی نہیں۔ تاہم مجھے افسوس ضرور ہے۔"

"اچھا اب سو جاؤ۔"

(۴)

تین ماہ کے بعد طاہر بغداد کے امراء کی محفلوں میں کافی شہرت اور عزّت حاصل کر چکا تھا۔ دریائے دجلہ کے کنارے وہ ایک عالی شان مکان خرید چکا تھا۔ زید کے علاوہ اس کے پاس چار اور خادم اور تین سائیس تھے۔ اس کے اصطبل میں چوگان (بغداد میں چوگان یا پولو کارواج اس زمانے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔) اور نیزہ بازی کے لیے گھوڑے تھے۔ قاضی فخر الدّین کے مہمان خانہ سے اس عالیشان مکان میں منتقل ہوتے ہی سب سے پہلے جن لوگوں نے اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا، وہ بغداد کے علما تھے۔ پہلے ہی دِن اس کے پاس وفد کی صورت میں یکے بعد دیگرے علما کی پانچ ٹولیاں آئیں اور قریباً ہر ٹولی کے لیڈر کا مطالبہ یہی تھا کہ آپ ہمارے فرقے میں شامل ہو جائیں اور طاہر نے ان سب کو یہی جواب دیا۔

”اگر آپ مجھے اسلام کی دعوت دینے آئے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں اور اسلام کا صحیح مفہوم سمجھتا ہوں۔ میرے سامنے وہ مسائل بیان نہ کیجیے جن پر آپ پانچ صدیوں میں متفق

نہیں ہو سکے۔ بعض علما نے اسے بحث میں گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن طاہر کی چند باتوں نے انہیں یقین دلا دیا کہ اس نوجوان کے پاس صرف چاندی اور سونا ہی نہیں علم کا خزانہ بھی ہے۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ شہسواری کے فن میں کمال بھی ایک عرب نوجوان کی وراثت سمجھی جاتی تھی۔ مدینے میں احمد بن حسن نے طاہر کو فنونِ سپہ گری سکھانے کے لیے بہترین اُستادوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں ہی مدینے کے نوجوان تیغ زنی اور نیزہ بازی میں اس کے کمال کا اعتراف کرتے تھے لیکن بغداد پہنچ کر طاہر کو معلوم ہوا کہ یہاں چوگان کے کھیل کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

شاہی محل کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس میں فوجی پریڈ، گھڑ دوڑ، نیزہ بازی اور چوگان کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس میدان کے ایک طرف وزیر اعظم اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدیداروں کے محلات کی قطار تھی۔ شہر کے وہ معزّزین جنہیں امرائے سلطنت دعوت دیتے، ان محلات کی

بالکونی میں بیٹھ کر پولو اور گھڑ دوڑ دیکھتے۔ خواتین کے لیے بالائی منزلوں کے دریچوں پر چلمنیں ڈال دی جاتیں۔

اس میدان میں کھیلوں کا انتظام ایک علیحدہ ناظم کے سپرد تھا۔ طاہر نے اس ناظم سے واقفیت پیدا کرنے کی تدبیر سوچنے سے پہلے چوگان کے کھیل میں مہارت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ شہر میں چوگان کے کھیل کے لیے چند اور میدان بھی تھے۔ طاہر نے ایک میدان میں چوگان کی مشق شروع کر دی اور چند ہفتوں کے بعد شہر میں چوگان کے شائقین کی محفلوں میں ایک ایسے نوجوان کا چرچا ہونے لگا جس کے باپ نے بہادری کے صلے میں صلاح الدّین ایوبی کی تلوار حاصل کی تھی۔ عوام کی آواز امرا کے کانوں تک پہنچی۔ امرا نے وزیر اعظم کو باخبر کیا اور وزیر اعظم نے کوتوال کو بلا کر پوچھا کہ ہم ابھی تک اس نوجوان سے متعارف کیوں نہیں ہوئے؟ چنانچہ ایک صبح طاہر دریا میں تیرنے کی مشق کر رہا تھا۔ زید بھاگتا ہوا آیا اور کنارے کھڑا ہو کر چلّایا۔

”آپ جلدی باہر نکلیے۔ شہر کا کوتوال آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

طاہر نے باہر نکل کر کپڑے بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ کوتوال ہی ہے؟“

”وہ خود یہی کہتا ہے کہ میں کوتوال ہوں۔ اس کے ساتھ چھ سپاہی ہیں۔ میں اسے دیوان خانے میں بٹھا آیا ہوں۔ خدا کرے وہ اچھی نیّت سے آیا ہو!“

طاہر نے کہا۔ ”کسی کی نیّت پر بلاوجہ شک نہیں کیا کرتے۔“

(۵)

مکان پر پہنچ کر طاہر کو معلوم ہوا کہ کوتوال وزیر اعظم کی طرف سے ملاقات کی دعوت لے کر آیا ہے۔

”میں بھی تیّار ہو کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر طاہر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک قیمتی جُبّہ زیبِ تن کیے واپس آیا اور کوتوال کے ساتھ ہو لیا۔

بغداد کے وزیر اعظم افتخار الدّین سے طاہر کی پہلی ملاقات بہت مختصر تھی۔ افتخار الدّین نے اس سے چند سوالات پوچھے۔ تم بغداد میں کب آئے؟ کہاں سے آئے اور کیا مقصد لے کر آئے ہو؟

طاہر نے ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آئے ہوئے تین مہینے دس دن ہوئے ہیں۔ میں مدینے سے آیا ہوں اور میرا مقصد خدمت اسلام ہے۔“

”بہت نیک مقصد ہے۔“ وزیر اعظم نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن یہ مقصد آپ دولتِ عبّاسیہ کی خدمت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کسی خفیہ انجمن کے رُکن بن کر؟ میں نے سنا ہے کہ سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار کی بدولت بغداد کے عوام آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔۔۔!“

”یہ اس مردِ مجاہد کی تلوار کا احترام ہو سکتا ہے۔ میں ابھی اپنے آپ کو کسی عزّت کا حق دار نہیں سمجھتا۔ رہا دولتِ عباسیہ کی خدمت کا سوال تو میں

عرض کرتا ہوں کہ اگر میرے دل میں یہ جذبہ نہ ہوتا تو میں اپنا مستقبل بغداد سے وابستہ نہ کرتا۔ میں دولتِ عباسیہ کی خدمت، اسلام کی خدمت سمجھتا ہوں۔"" صحیح خدمت سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

طاہر نے اس سوال پر اچانک محسوس کیا کہ اس جہاندیدہ آدمی سے گفتگو کرتے ہوئے اسے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "بیرونی خطرات کا اندازہ لگاتے ہوئے بغداد کی مدافعانہ قوّت کو مضبوط کرنا دولتِ عباسیہ کی صحیح خدمت سمجھتا ہوں۔"

افتخار الدّین نے کہا۔ "کیا تمہارے خیال میں محمد شاہِ خوارزم کے واپس لوٹ جانے سے بیرونی خطرات ٹل نہیں گئے۔"

"لیکن چنگیز خان کا خطرہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔"

افتخار الدّین نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہمارے لیے نہیں۔ خوارزم کے لیے!"

"کیا آپ تاتاریوں کے طوفان کے مقابلے کے لیے خوارزم کو تنہا چھوڑ

دیں گے؟"

"یہ حالات پر مختصر ہے۔ ابھی تک خوارزم شاہ نے ہم سے معافی نہیں مانگی۔ نہ اعانت طلب کی ہے اور نہ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ چنگیز خان چند تاجروں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے خوارزم پر چڑھ دوڑے گا کیونکہ وہ تاجر زیادہ تر بخارا کے مسلمان تھے۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کہ سلطنت خوارزم کے ساتھ دولتِ عباسیہ کے سیاسی تعلقات پھر بحال ہو گئے ہیں اور ان کا سفیر یہاں آیا ہے؟"

افتخار الدّین نے جلدی سے سوال کیا۔ "تم خوارزم کے سفیر سے ملے ہو؟"

طاہر کو پھر ایک بار یہ احساس ہوا کہ اس نے تدبّر کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ "مجھے اس سے کیا کام!" افتخار الدّین نے کہا۔ "تمہاری دولت کی جو داستانیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ اگر وہ صحیح ہیں تو تمہیں بغداد میں بہت محتاط ہو کر رہنا چاہیے۔ ہماری حکومت اپنی حکمتِ عملی

کے متعلق باہر سے ہر مشورے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے اور امیر زادے عام طور پر غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کر بیٹھتے ہیں؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیے۔ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ دولتِ عباسیہ کی بہتری کے لیے صرف ہو گا۔ اگر اجازت ہو تو میں آپ کو ایک تحفہ پیش کرنے کی جرأت کروں؟"

افتخار الدّین نے جلدی سے سوال کیا۔ "صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار؟"

"نہیں۔ تلوار شاید آپ کے اسلحہ خانے میں ایک فالتو شے ہو۔" یہ کہہ کر طاہر نے اپنی جیب سے سونے کی ایک ڈبیہ نکالی اور کھول کر وزیر اعظم کو پیش کی۔

افتخار الدّین نے ڈبی لے کر ایک چمکتا ہوا ہیرا نکالا اور غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں تحائف حاصل کرنے کے شوق سے نہیں بلایا تھا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔"

طاہر نے کہا۔ "اگر آپ مجھے شرفِ بازیابی نہ بھی بخشتے تو بھی میرے دل

میں یہ خواہش تھی کہ یہ ہیرا کسی دن آپ کو پیش کروں گا۔ آپ اسے قبول فرمایئے!"

وزیر اعظم نے ہیرے کی ڈبیا میز پر رکھ دی اور تالی بجائی۔ ایک غلام کمرے میں داخل ہوا اور چند قدم جھک کر ادب سے سلام کرنے کے بعد حکم کا انتظار کرنے لگا۔

وزیر اعظم نے کہا۔ "انہیں ہمارے اصطبل میں لے جاؤ اور جو گھوڑا یہ پسند کریں، اس پر زین ڈال کر ان کے حوالے کر دو۔" پھر اس نے طاہر کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل شام تمہاری میرے ہاں دعوت ہے اور میں فیصلہ کروں گا کہ تم سے دولتِ عباسیہ کی کون سی خدمت لی جا سکتی ہے۔"

طاہر وزیر اعظم کے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہونے کو تھا کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

وزیر اعظم نے کہا۔ "طاہر! یہ قاسم ہے۔ میرا بیٹا!"

طاہر نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

قاسم کوئی بیس بائیس سال کا موٹا تازہ نوجوان تھا۔ اس کے چہرے سے امرا کے عام لڑکوں کی طرح آسودگی، بے حسی اور بے فکری مترشح تھی۔ آنکھیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ اس میں اپنے عالی نسب ہونے کا احساس حماقت کی حد تک پایا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی لیکن اس مسکراہٹ سے ملائمت اور سادگی کی بجائے درندگی اور عیاری برستی تھی۔ قاسم کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی تلوار تھی، جسے تیغ زنی سیکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نے خود بغل میں دبا رکھا تھا اور جسم پر زرہ بکتر پہنے ہوئے تھا۔

قاسم نے کہا۔ ”میں تیغ زنی کی مشق کے لیے جا رہا تھا کہ آپ کے یہاں آنے کا پتہ چلا۔ میں آپ سے زیادہ سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار دیکھنے کا خواہشمند تھا۔“

وزیر اعظم نے فوراً گفتگو کا موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کی اور کہا۔

”قاسم! یہ ہمارے اصطبل سے اپنے لیے ایک گھوڑا پسند کریں گے۔ مشہور ہے کہ ایک عرب گھوڑے کے انتخاب میں غلطی نہیں کرتا۔ تم ان کے ساتھ جا کر دیکھو کون سا گھوڑا پسند کرتے ہیں۔“ لیکن قاسم نے گھوڑے کے انتخاب کے مسئلہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور پھر طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ بیچنا چاہیں تو میں صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار خریدنا چاہتا ہوں۔ ابا جان اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرے دیں گے۔ آپ لباس سے ایک عالم معلوم ہوتے ہیں۔ آپ اسے کیا کریں گے؟“

وزیر اعظم نے جھنجھلا کر منہ پھیر لیا اور طاہر نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ایسی چیز کو بیچنا اس کی تضحیک ہو گی۔ میں کسی معاوضے کے بغیر اسے آپ کی نذر کر دوں گا لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ آپ اپنے آپ کو اس امانت کا مجھ سے بہتر حق دار ثابت

کریں!"

قاسم نے پُر اُمّید ہو کر جواب دیا۔ "آپ ایک عالم ہیں اور میں ایک سپاہی ہوں۔ تلوار پر آپ سے زیادہ میرا حق مسلّم ہے۔ ورنہ آپ آزما کر دیکھ لیجیے!"

طاہر نے کہا۔ "بہت اچھا۔ اگر آپ نے تیغ زنی میں مجھے مات دے گئے تو تلوار آپ کی۔"

شمشیر زنی کے فن میں قاسم کی خود اعتمادی غرور کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اس کا غرور بلا وجہ نہ تھا۔ وہ دور دراز کے بہترین استادانِ فن سے تربیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی زندگی کے دو ہی مشاغل تھے۔ پولو اور تیغ زنی۔ پولو میں چند اور نوجوانوں کو بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ تھا لیکن تیغ زنی میں سب اس کے کمال کے معترف تھے۔ اس لیے جب طاہر نے اسے مقابلے کی دعوت دی تو قاسم نے ایک قہقہہ لگایا اور وزیر اعظم نے طاہر کی طرف تعجّب کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مقابلہ دلچسپ رہے گا

لیکن میں چاہتا ہوں دوسرے لوگ بھی اس سے لطف اٹھائیں۔ شاید خلیفہ المسلمین بھی اس میں دلچسپی لیں۔ لیکن آج نہیں کی بہتر رہے گا۔ آپ کل صبح آ جائیں۔ دوپہر اور شام دونوں وقت کا کھانا میرے ہاں کھائیں۔ قاسم! اب تم انہیں گھوڑے دکھاؤ؟"

(۶)

وزیر اعظم سے دوبارہ مصافحہ کرنے کے بعد طاہر قاسم کے ساتھ محل سے نیچے اترا۔ محل کے صحن میں سنگِ مرمر کی سڑک کے دونوں طرف صاف شفاف پانی کے تالابوں میں فوّارے چھوٹ رہے تھے اور ان تالابوں کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں سبز گھاس کے پلاٹ تھے۔ ایک ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد چند سیڑھیاں اُتر کر یہ سنگِ مرمر کی سڑک ایک دلکش باغ سے گزرتی تھی اور تالابوں کا پانی دو آبشاریں بنانے کے بعد دو تنگ اور تیز رفتار نہروں میں تبدیل ہو جاتا تھا، پھر ان نہروں سے دائیں بائیں کئی اور شاخیں نکل کر باغ کو سیراب کرتی تھیں۔ وہ میدان جس میں پولو اور گھڑ دوڑ ہوتی تھی۔ محل کے اس حصے کے عقب میں تھا

اور طاہر اسی طرف محل میں داخل ہوا تھا۔

دوسری ڈیوڑھی پر باغ ختم ہو جاتا تھا اور اس سے باہر ایک وسیع چار دیواری کے اندر وزیر اعظم کے خادموں کے مکانات اور ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔ اصطبل میں مختلف نسلوں کے ڈیڑھ سو گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور یہ تمام وزیر اعظم کی ذاتی ملکیت تھے۔ طاہر نے اصطبل کے تین چار چکر لگائے۔ کسی گھوڑے کو سرسری طور پر اور کسی کو غور سے دیکھے اور بالآخر ایک گھوڑے کی پیٹھ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے پسند کرتا ہوں۔“

قاسم نے کہا۔ ”خوب۔ میں آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں لیکن کبھی کبھی اُلٹے پاؤں چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے ہمارے اصطبل میں آئے ہو کُل دو مہینے ہوئے ہیں۔ یہ اتنا سرکش ہے کہ میں بھی اسے تربیت نہیں دے سکا۔“

ایک حبشی خادم گھوڑے پر زین ڈال کر اصطبل کے صحن میں لے آیا۔

قاسم نے گھوڑے کی باگ پکڑ کر طاہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”کل کا وعدہ نہ بھولیے!“

طاہر نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیے۔ میں تلوار اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔“

قاسم نے ایک خادم کو اشارے سے بلا کر کہا۔ ”یہ گھوڑا ان کے گھر چھوڑ آؤ۔“

خادم گھوڑے کی باگ پکڑنے کے لیے آگے بڑھا لیکن اصطبل کے دروازے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور آن کی آن میں دو گھوڑے صحن میں داخل ہوئے۔ طاہر نے ان گھوڑوں کے سواروں کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ یہ دونوں جوان لڑکیاں تھیں۔ دونوں سفید ریشم کا چست لباس اور موتیوں سے جڑی ہوئی سفید ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ آنکھوں اور پیشانی کے سوا چہرے کے باقی نقوش پر سیاہ رنگ کے باریک نقاب تھے۔ گھوڑے بہت بری

طرح ہانپ رہے تھے۔ وہ گھوڑوں سے اتریں۔ خادم نے طاہر کے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر ان کے گھوڑوں کی باگ پکڑ لیں۔ ایک لمحے کے بعد دوسرے خادم بھاگتے ہوئے پہنچ گئے اور اس نے گھوڑے ان کے حوالے کر کے پھر طاہر کے گھوڑے کی باگ پکڑی۔ لڑکیاں قاسم کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھیں اور قاسم جلدی سے طاہر کو خدا حافظ کہہ کر ان کے پیچھے چل دیا۔

جب طاہر خادم کے ساتھ اصطبل سے نکل کر محل کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گزرا تو دونوں لڑکیاں سیڑھیوں پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور قاسم اس کی طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ بتا رہا تھا۔

آخری دروازے سے گزرنے کے بعد طاہر کے سامنے ایک کشادہ سڑک تھی اور اس کے ایک ہاتھ دریائے دجلہ اور دوسرے ہاتھ حکام سلطنت کے مکانات کی قطار تھی۔ کوئی پانچ سو قدم کے فاصلے پر دریا کا پُل دکھائی دیتا تھا۔

ان لڑکیوں کا نام صفیہ اور سکینہ تھا۔ سکینہ قاسم کی بہن تھی اور صفیہ اس کے مرحوم چچا کی لڑکی۔

اصطبل سے نکلنے کے بعد سکینہ نے صفیہ سے کہا۔ ”صفیہ! تم نے اس نوجوان کو دیکھا۔ کتنی سادگی تھی اس کے چہرے پر۔ تمہیں دیکھ کر بد حواس سا ہو گیا تھا۔“

”میں نے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ تمہیں دیکھ کر ہوا ہو گا بد حواس؟“

”صفیہ وہ بغداد کے امراء سے بہت مختلف تھا۔ ہمیں دیکھ کر فوراً آنکھیں جھکا لی تھیں۔“

صفیہ نے جواب دیا۔ ”میں قاسم کے تمام دوستوں کے متعلق ایک ہی رائے رکھتی ہوں۔“

”لیکن میں اسے قاسم کے ساتھ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

صفیہ نے کہا۔ ”ہاں وہ شکل و صورت سے باعلم آدمی معلوم ہوتا تھا۔ قاسم ایسے لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا۔“

جب یہ لڑکیاں سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھیں قاسم نے انہیں پیچھے سے آواز دے کر ٹھہرالیا۔ صفیہ اس نے قریب پہنچے ہوئے کہا۔ ”ایک جانور دیکھو گی!“

صفیہ نے جواب دیا۔ ”تمہیں دن میں ایک بار دیکھنے کے بعد میرے دل میں کسی نئے جانور کو دیکھنے کی خواہش کیوں پیدا ہونے لگی؟“ قاسم نے اپنی تلخی کو مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف تمہاری نگاہوں میں جانور ہوں، لیکن تمہیں ایسا شخص دکھاتا ہوں جسے کل تک بغداد کے تمام لوگ جانور کہیں گے۔ سکینہ! تم نے بھی دیکھا۔ وہ نوجوان جو اصطبل میں میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے باپ نے بہادری کے انعام میں سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار حاصل کی تھی اور آج اس نے مجھے دعوت دی ہے کہ اگر تیغ زنی میں اس سے بازی لے جاؤں تو وہ تلوار میری ہو گی۔“

اس وقت ظاہر ڈیوڑھی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ قاسم نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان بدوؤں کی ذہنیت بھی عجیب ہے، چاہے انہوں نے اپنی زندگی میں تلوار کو چھُو کر بھی نہ دیکھا ہو۔ اپنے آپ کو اس فن کا استاد ضرور سمجھتے ہیں۔ کل بڑا عجیب تماشا ہو گا۔ ابّا جان کی خواہش ہے کہ یہ تماشہ خلیفۃ المسلمین کے سامنے ہو!“

صفیہ نے کہا۔ ”اگر اس کے پاس صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار ہے اور وہ صحیح قسم کا بدّو ہے تو مجھے ڈر ہے کہ تم دوسروں کے لیے سامانِ تضحیک نہ بن جاؤ۔ چلو سکینہ چلیں! کل دیکھیں گے اس کے کرتب۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر اس نے صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار حاصل کر لی تو پھر اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگیں گے۔“

طاہر کے نئے دوست اور دشمن

اسی رات عشاء کی نماز سے تھوڑی دیر بعد طاہر اپنے دیوان خانے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ اس کے مکان کے سامنے چار گھوڑوں کی بگھی رکی۔ ایک خادم نے آکر اطلاع دی کہ ایک فوجی افسر سپہ سالار کا پیغام لایا ہے۔ طاہر نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اندر لے آؤ!"

خادم چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک دراز قیامت قوی ہیکل اور بارعب آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی اور چہرے سے خلوص، ذہانت اور شجاعت مترشح تھی۔ طاہر نے اُٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھالیا۔

نو وارد نے کہا۔ ”میرا نام عبد العزیز ہے۔ میں آپ سے غائبانہ واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ اس وقت میں سپہ سالار کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں آپ سے ذاتی طور پر بھی ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ سر دست میں آپ کو یہ بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں۔ اور میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ اس لیے نہیں بڑھانا چاہتا کہ آپ بہت زیادہ امیر ہیں یا آپ کے پاس وہ تلوار ہے جو آپ کے والد نے صلاح الدّین ایوبی سے انعام میں حاصل کی تھی، بلکہ اس لیے کہ آپ کے دل میں اپنے آپ کو بہادر باپ کی نشانی کا حق دار ثابت کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ آپ نے قاسم کو مقابلے کی دعوت دی ہے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے معلوم نہ تھا کہ بغداد میں یہ تلوار اس قدر اہمیّت اختیار کرے گی۔ میرے نزدیک اس کا صحیح مصرف یہ نہ تھا کہ ایک امیر زادے کے اسلحہ خانے کی زینت بن جائے۔ اس لیے مجھے مقابلے کی دعوت دینا پڑی۔“

عبدالعزیز نے کہا۔ ”جہاں تک تلوار سے کھیلنے کا تعلق ہے، قاسم کو آپ نے محض ایک امیر زادہ سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی صلاحیت کا اعتراف کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن قصر خلد کے آس پاس رہنے والے امراء کے لڑکوں سے وہ اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ اس لیے آپ ذرا محتاط رہیں تو اچھا ہو گا۔ اگر آپ ہار گئے تو آپ کو شاید تلوار چھن جانے کا افسوس نہ ہو لیکن بغداد کی فوج میں ایک نہایت غلط قسم کے عہدے دار کا اضافہ ہو جائے گا۔ پچھلے دنوں جب علاؤالدّین خوارزم شاہ کی افواج بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہماری افواج نے اسے راستے میں روکنے کی لیے پیش قدمی کی۔ وزیر اعظم کی کوشش سے خلیفہ نے اس برخوردار کو میمنہ کے بیس دستوں کے سالار کا عہدہ دے دیا لیکن تمام راستہ یہ حالت رہی کہ اگر سپہ سالار کے خیمے پر رات کے وقت بیس سپاہی پہرہ دیتے تو یہ دن کے وقت بھی چالیس پہرے داروں کا مطالبہ کرتا۔ اپنے ہر افسر کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا اور یہ کہتا کہ میرا باپ سلطنت عباسیہ کا وزیر اعظم ہے۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ بغداد میں اس نوجوان کو جس قدر کند تلواروں سے مشق کرنے کا شوق تھا اسی قدر اب

یہ اصلی تلواروں کا مقابلہ کرنے سے گھبراتا ہے۔ چنانچہ چوتھی منزل پر اسے دردِ سر شروع ہوا اور پانچویں منزل پر یہ رُخصت لے کر گھر چلا آیا۔ اس کی خوش قسمتی سے خوارزم کی افواج راستے سے لوٹ گئیں اور اسے خلیفہ کے سامنے صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ اب سپہ سالار کو ڈر ہے کہ سلطان صلاح الدّین ایوبی کی تلوار اسے خلیفہ کی نظروں میں کسی نہایت اہم عہدے کا حق دار ثابت نہ کر دے۔ میں بھی یہ خدشہ محسوس کرتا ہوں لیکن سپہ سالار کی طرح پریشان نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بغداد کی ترقی کے دن گنے جا چکے ہیں اور بیسیوں اہل عہدے داروں میں ایک اور کے اضافے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ میں بغداد میں بہت بڑی اُمّیدیں لے کر آیا تھا لیکن۔۔۔۔!"

یہاں تک کہ کر عبد العزیز خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"لیکن کیا۔۔۔۔۔۔؟" طاہر نے پوچھا۔

عبد العزیز نے کہا۔ ”میں مایوس ہو چکا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتا اور اگر آپ اپنے دل میں خدمت اسلام کا جذبہ لے کر آئے ہیں تو آپ بھی شاید یہاں زیادہ دیر نہ رہ سکیں۔ اس وقت مصر میں ہلال و صلیب کے معرکے پھر گرم ہو گئے ہیں۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میری ضرورت ہے۔ وہاں عالمِ اسلام کے ہر مجاہد کی ضرورت ہے۔ میرے چند اور دوست بھی وہاں جانے کے لیے تیّار ہیں۔ اور میں آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں۔ لیکن اگر آپ وہاں نہ جانا چاہیں تو کم از کم ہمارے لیے تعارفی خط لکھ دیں۔ مصر میں آپ کی کافی واقفیت ہو گی۔ تعارفی خط اس لیے نہیں چاہتا کہ وہاں ہماری اہمیت محسوس کی جائے بلکہ اس کی ضرورت اس لیے محسوس کرتا ہوں کہ بغداد کے ہر آدمی کو وہاں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر میں سپہ سالار کا خط لے کر بھی جاؤں تو بھی ہم پر اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ ہمیں جاسوس سمجھا جائے گا۔“

طاہر نے کہا۔ ”نصرانیوں پر ملک العادل کے پے در پے فتوحات کی خبر آپ سُن چکے ہوں گے۔ میرے نزدیک فتنہ تاتار، اسلام کے لیے کہیں

زیادہ خطرناک ہے۔"

عبدالعزیز نے مایوس ہو کر کہا۔ "میں بھی اسے کم خطرناک نہیں سمجھتا۔ لیکن کاش! وہ شخص جو خوارزم میں ہمارے دفاع کا آخری مورچہ سنبھالے ہوئے ہے، اس قدر احمق نہ ہوتا۔ اسے محض اپنی قوت کے غلط اندازے نے تمام دنیا سے لڑائی مول لینے پر آمادہ کر دیا ہے۔ وہ صرف اہلِ بغداد کو بلکہ ہر غیر ملکی کو خلیفہ کا جاسوس سمجھتا ہے۔ اس نے چنگیز خان کو قوّت آزمائی کی دعوت دی ہے لیکن اس قدر خوف ناک طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی اسلامی سلطنت کی اعانت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خلیفہ ناصر کو بھی یقین ہے کہ چنگیز خان سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ پھر بغداد پر اپنی طاقت آزمائے گا۔ اس لیے۔۔۔ لیکن یہ باتیں کہنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔۔۔ پھر سہی۔ اب چلیے، سپہ سالار آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے!"

طاہر نے کہا۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ مجھ پر اعتماد کیجیے۔"

عبد العزیز نے متجسّس نگاہوں سے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف ایک سپاہی ہوں اور سپاہی کو سیاسی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔“

”ٹھہریے۔“ طاہر یہ کہتے ہوئے جلدی سے اٹھا اور دوسرے کمرے سے صلاح الدّین ایوبی کی تلوار نکال لایا اور عبدالعزیز کے سامنے اس کی دستے پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے والد نے خُون کا آخر قطرہ بہا کر یہ انعام حاصل کیا تھا۔ میں اس تلوار پر ہاتھ رکھ کر نیک مقصد میں آپ سے وفاداری کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس کے عوض میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں لیتا۔ آپ کے چہرے پر پہلی نگاہ نے مجھے بتادیا تھا کہ بغداد میں مجھے جس رفیق کی تلاش تھی، اسے قدرت نے بھیج دیا ہے۔“

عبدالعزیز نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور طاہر کے چہرے پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ شاید میں بھی کسی کی تلاش میں تھا۔ بغداد میں بہت سے لوگ کسی کی تلاش میں ہیں۔ کیا قدرت نے بغداد کی پر سکون زندگی میں تموج پیدا کرنے کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے؟ اس جھیل کا

کھڑا پانی ہوا کے کسی تیز جھونکے کا منتظر ہے۔" اس سوئی ہوئی محفل کے لیے صورِ اسرافیل کی ضرورت ہے۔ اگر وہ آپ ہیں تو میں آپ سے آخری دم تک دوستی اور وفا کا عہد کرتا ہوں۔ میں نے گزشتہ رات ایک خواب دیکھا تھا اور اب شاید اس کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار تھا۔ سمندر میں طوفان اُٹھ رہا تھا۔ کشتی ایک سوراخ کے راستے آہستہ آہستہ پانی جمع ہو رہا تھا اور ہمیں یقین تھا کہ ڈوب جائے گی۔ ہم زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اچانک پانی سے ایک چٹان نمودار ہوئی اور پھیلتی اور بلند ہوتی چلی گئی۔ سرکش موجیں بعض اوقات اس سے ٹکرا کر واپس چلی جائیں اور بعض اوقات اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آغوش میں چھپا لیتیں۔ ہم میں سے ایک نوجوان نے کشتی کی پتوار سنبھالتے ہوئے کہا۔ یہ چٹان ہمارا آخری سہارا ہے۔ لیکن ہم محسوس کرتے تھے کہ چٹان زیادہ دیر ان زبردست موجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بعض ملّاحوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے ہاتھ سے پتوار چھین لی اور اس نے مایوس ہو کر پانی میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا چٹان پر جا چڑھا۔ میں اور میرے چند ساتھیوں نے اس کی تنقید کی لیکن دوسرے

مسافر کشتی کے ساتھ چمٹے رہے۔ ہم چٹان پر پہنچ چکے تھے اور کشتی کو سمندر کی موجیں ایک تنکے کی طرح بہا کر ہم سے دُور لے جا رہی تھیں۔ لیکن عجیب بات تھی کہ بعض لوگ اس چٹان سے کود کر کشتی کا رُخ کر رہے تھے۔ میری آنکھ کھُل گئی اور میں کشتی کا انجام نہ دیکھ سکا۔"

طاہر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "کیا آپ سلطنتِ خوارزم کو تاتاریوں کے سیلاب کی راہ میں آخری چٹان نہیں سمجھتے؟"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "وہ ہمارے دفاع کی آخری چوکی ضرور بن سکتی تھی لیکن موجودہ حالات میں یہ کہنا مشکل ہے کہ علاؤ الدّین محمد شاہ کی قیادت میں خوارزم کی افواج تاتاری سیلاب کے سامنے آخری چٹان ثابت ہوں گی۔ وہ ایک خود غرض، جاہ پسند اور توہم پرست آدمی ہے۔ جب اس نے بغداد پر چڑھائی کی تھی اہلِ بغداد پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے اور یہ خدشہ تھا کہ اس کی فتح کے امکانات دیکھ کر خلیفہ کی فوج کے بہت سے ترک امراء اس کے ساتھ جا ملیں گے لیکن راستے میں برف پڑی اور وہ اسے عذاب الٰہی سمجھ کر واپس چلا گیا۔ مجھے خدشہ ہے کہ چنگیز

خان سے پہلی شکست کے بعد وہ یہ سمجھ کر ہمّت ہار دے گا کہ اس کے مقدر کا ستارہ ڈوب چکا ہے اور یہ چٹان ایک بار ڈوب کر دوبارہ ابھرنے کا نام نہ لے گی۔"

طاہر نے کہا۔ "تو کیا اس صورت میں بغداد کے لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا ضروری نہیں کہ دفاع کا یہ آخری مورچہ ٹوٹ جانے کے بعد تاتاریوں کا سیلاب ہم سے قریب تر ہو جائے گا۔ کیا مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے خلیفہ اور خوارزم شاہ کے اختلافات مٹانے کی کوشش کرنا ہر دُور اندیش آدمی فرض نہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر دولت عباسیہ اور سلطنت خوارزم میں اتحاد ہو جائے تو ہم دنیا کے آخری کونے تک چنگیز خان کا تعاقب کر سکتے ہیں۔ میں یہی مقصد لے کر بغداد میں آیا ہوں اور یہی مقصد ہے جو مجھے امرائے سلطنت اور خلیفہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نہایت بھونڈے اور شرم ناک طریقے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں انہیں خواب سے جگانا چاہتا ہوں اور اگر خدانخواستہ مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میری دوسری منزل مصر یا خوارزم ہو

گی۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "تو مجھے خواب میں کشتی سے چٹان کا راستہ دکھانے والا اور کوئی نہ تھا، آپ تھے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرے چند دوست بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔ اگر آپ کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں کل رات انہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔"

طاہر نے کہا۔ "کل رات میری وزیر اعظم کے یہاں دعوت ہے۔ پرسوں آپ انہیں یہاں لے آئیں۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "اگر کل رات آپ کی وزیر اعظم کے ہاں دعوت ہے تو پرسوں شام یقیناً سپہ سالار آپ کو اپنے ہاں بلائیں گے۔ اس کے بعد دوسرے امراء کی باری ہو گی اور پھر شاید خلیفہ بھی آپ کو اپنی نظرِ عنایت کا مستحق سمجھیں لیکن سچ بتایئے آپ نے وزیر اعظم پر کیا جادو کیا؟ وہ کسی معمولی تحفہ کو درخو اعتنا نہیں سمجھتے؟"

طاہر کے تذبذب پر عبدالعزیز نے کہا۔ "میں نے یہ سوال صرف اس لیے

پوچھا تھا کہ آپ کو باخبر کر دوں۔ سپہ سالار براہ راست آپ سے یہ سوال نہ پوچھے لیکن وہ گول مول باتوں سے یہ راز معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن آپ اسے ٹالنے کی کوشش کریں اور اپنا سب سے قیمتی تحفہ خلیفہ کے لیے رکھ چھوڑیں۔"

طاہر نے کہا۔ "میں وزیر اعظم کو ایک ہیرا پیش کیا تھا اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو سپہ سالار کو بھی ایک ہیرا پیش کر دوں۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "اچھا ہوا آپ نے پوچھ لیا۔ سپہ سالار تحالف سے عہدے حاصل کرنے والے امیر زادوں سے بہت چڑتا ہے۔ وہ تحائف پیش کرنے والوں سے ہمیشہ کے لیے بدظن ہو جاتا ہے۔ اب چلیے وہ بہت پریشان ہو رہا ہو گا۔"

طاہر اور عبدالعزیز ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے مکان سے باہر نکلے اور بگھی پر سوار ہو گئے۔ راستے میں عبدالعزیز نے کہا۔ آپ کی دعوتوں کا سلسلہ شاید چند دنوں تک ختم نہ ہو اس لیے اگر آپ مناسب

سمجھیں تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ پرسوں صبح آ جاؤں گا۔ پرسوں جمعہ ہے اور ہمیں چھٹی ہو گی۔ نماز کے بعد ہم کشتی پر یا گھوڑوں پر سیر کے لیے جائیں گے۔"

تھوڑی دور آگے جا کر طاہر نے سوال کیا۔ "آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ سپہ سالار نے مجھے شرفِ ملاقات کیوں بخشا ہے؟"

عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جو نووارد وزیرِاعظم سے ملتا ہے، سپہ سالار اس سے ملاقات ضروری سمجھتے ہیں اور آپ سے ملنے کے لیے ان کی بے قراری کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے قاسم کو مقابلے کی دعوت دی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قاسم کی شہرت میں ایک نیا اضافہ شاید اس کے لیے فوج میں بلند ترین عہدہ حاصل کرنے کا سبب بن جائے۔ اس لیے وہ آپ سے غالباً کہیں گے کہ برخوردار! اگر تم تلوار چلانا نہیں جانتے تو گھوڑوں کا انتظام میں کرتا ہوں۔ تم آج رات ہی بغداد سے روانہ ہو جاؤ، کسی سیاسی موضوع پر ان سے بات نہ کرنا۔ وہ ہر سیاست دان کو بغداد کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک

سادہ دل سپاہی ثابت کر کے تم ان کی توجّہ اور دلچسپی کے مستحق بن جاؤ گے۔ اگر علاؤ الدّین محمد شاہ کا ذکر آ جائے تو یہ نہ کہہ دینا کہ وہ راستے کی برف باری کو بدشگونی سمجھ کر واپس چلا گیا تھا۔ وہ صرف یہ سن کر خوش ہوتے ہیں کہ خوارزم شاہ پر ان کی ہیبت چھا گئی تھی۔ یہ سننے کے بعد اگر وہ اٹھ کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھرنے لگیں تو آپ ضرور کہہ دیں کہ خوارزم کی لومڑی کو شیر بغداد کے سامنے آنے کی جرأت کیونکر ہو سکتی تھی؟"

سپہ سالار کے مکان کے سامنے بگھی رُکی اور طاہر اور عبد العزیز اندر داخل ہوئے، ایک پہرے دار انہیں اوپر کی منزل میں لے گیا۔ ملاقات کے کمرے سے باہر سپہ سالار کا محافظ کھڑا تھا۔ اس نے ان دونوں کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے عبد العزیز سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ نے بہت دیر لگائی۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں انہیں اندر چھوڑ آؤں۔"

(۲)

محافظ طاہر کو اندر چھوڑنے کے بعد واپس آ کر عبد العزیز کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک حبشی غلام نے باہر آ کر عبد العزیز سے کہا۔ "سپہ سالار آپ کو بلاتے ہیں۔"

عبد العزیز کمرے میں داخل ہوا۔ سپہ سالار نے کہا۔ عبد العزیز انہیں ان کے گھر پہنچا آؤ اور دیکھو۔ کل علی الصبح ان کے پاس جانا اور یہاں لانے سے پہلے ان کا اچھی طرح امتحان لے لینا۔ قاسم کو آج شام میں نے اس کے یونانی استاد کے ساتھ مشق کرتے دیکھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہ یونانی کون ہے؟"

عبد العزیز نے جواب دیا۔ "اس کے متعلق ہمیں زیادہ معلومات فراہم نہیں، لیکن میں نے سُنا ہے کہ وہ گزشتہ ہفتے اپنے بادشاہ کی طرف سے خلیفہ اور وزیر اعظم کے پاس چند تحائف لایا تھا اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں بہادری دکھا کر شاہِ فرانس

سے انعام حاصل کیا تھا اور قاسم نے ایک معقول معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔"

عمر رسیدہ سپہ سالار نے غصّے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور اب وہ واپس جا کر یہ کہے گا کہ بغداد کے امراء کے لڑکے تیغ زنی سیکھنے کے لیے مغرب کے عیسائی اُستادوں کے محتاج ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو اسے یہ بتا سکے کہ مسلمان تلوار کا کھیل سیکھنے کے لیے کسی استاد کا محتاج نہیں۔ یہ احساسِ کمتری ہمیں لے ڈوبے گا!"

عبد العزیز نے کہا۔ "اس بارے میں ہمارے جذبات آپ سے مختلف نہیں لیکن کاش وہ شخص محض ایک یونانی ہوتا۔ وہ وزیر اعظم کے صاحب زادے کا استاد ہے۔ ایک عام سپاہی اسے مقابلے کی دعوت کیونکر دے سکتا ہے؟ اگر قاسم کو مقابلے کی دعوت دینے کے لیے بھی ایک امیر زادہ ہونا ضروری نہ ہوتا تو اب تک اپنے متعلق اس کی تمام غلط فہمی دور ہو چکی ہوتی۔ طاہر کو ایک امیر زادہ فرض کر لیا گیا ہے اور اگر اسے ایک امیر زاد فرض نہ بھی کیا جاتا تو صلاح الدّین ایوبی کی تلوار قاسم کے دل میں

رقابت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔"

سپہ سالار نے کہا۔ "لیکن یہ تماشا خلیفہ کے سامنے ہو گا۔ قاسم کے استاد کے پاس شاہِ فرانس کا آفرین نامہ ہے۔ شاگرد نے اگر بازی جیت کر صلاح الدّین ایوبی کی تلوار حاصل کر لی تو کون کہہ سکتا ہے کہ چند سال بعد بغداد کی افواج کی قیادت کیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو گی۔"

عبد العزیز نے کہا۔ "مجھے طاہر کے متعلق اطمینان ہے۔ اس شاگرد کے بعد کسی طرح استاد بھی میدان میں آجائے تو ممکن ہے کہ یہ کھیل اور بھی دلچسپ بن جائے۔"

"استاد کے بعد شاگرد! نوجوان تم دُور کی سوچنے میں ہمارے وزیر خارجہ سے کسی طرح کم نہیں۔ آج سے تمہارا نام اپنے ذہین سالاروں کی فہرست میں درج کرتا ہوں۔ استاد کے بعد شاگرد!"

عبد العزیز نے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جی شاگرد کے بعد اُستاد!"

"ہاں ہاں شاگرد کے بعد استاد!" سپہ سالار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اگر اس نوجوان نے ہماری توقعات پوری کیں تو ان دونوں کی صورت دیکھنے والی ہو گی۔"

"شاگرد کے بعد استاد! عزیز! تم نے بہت دور کی سوچی۔ اب بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آج وزیر اعظم یہ خدشہ ظاہر کر رہے تھے کہ اگر کوئی قصیدہ گو شاعر آ گیا تو خلیفہ اس دلچسپ کھیل کو دیکھنے کے لیے آنے کا وعدہ بھول جائیں گے۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ کل کوئی شاعر اس طرف کو نہ جانے پائے لیکن۔۔۔۔۔" اس نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔ "کل میں اس نوجوان کو اچھی طرح آزما کر دیکھ لینا۔ اب اسے گھر چھوڑ آؤ!"

سپہ سالار کے محل سے نکل کر بگھی پر سوار ہوتے ہوئے عبدالعزیز نے طاہر کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "استاد کے بعد شاگرد!"

طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ سپہ سالار نے

میرے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد میرے بازوؤں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ برخوردار! تمہارے بازو تو کافی مضبوط معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم تیغ زنی میں اپنی مہارت کا غلط اندازہ لگانے کے عادی ہو تو میرے بہترین گھوڑے تمہیں گھر پہنچانے کے لیے موجود ہیں۔ قاسم کے یونانی استاد کا نام کیا ہے؟"

"لوکس۔ "عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اُستاد شاگرد سے بہتر ثابت نہیں ہو گا۔"

طاہر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اس سے ذرا پریشان نہیں۔ لیکن کاش! میرا اور اس کا مقابلہ اس قدر دوستانہ فضا میں کُند تلواروں سے نہ ہوتا!"

عبدالعزیز چاند کی روشنی میں غور سے طاہر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دلفریب چہرہ جس پر اسے تھوڑی دیر پہلے ایک باعلم آدمی کی سنجیدگی نظر آتی تھی، اب سپاہیانہ وقار و جبروت کا امیدوار تھا۔

طاہر کے مکان کے سامنے پہنچ کر عبد العزیز نے کہا۔ ”اُتریے۔ آپ کا مکان آگیا۔ “لیکن وہ کسی گہرے خیال میں محو تھا۔ عبد العزیز نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا سوچ رہے تھے آپ؟ کیا اس یونانی کو تیغ زنی کا سبق دے رہے تھے؟“

طاہر نے چونک کر کہا۔ ”نہیں نہیں۔ میرے لیے یہ مسئلہ اس قدر اہم نہیں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چنگیز خان اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔ ترکستان میں سلطان علاؤ الدّین کیا کر رہا ہے؟ مصر میں کیا ہو رہا ہے اور ہم بغداد میں کیا کر رہے ہیں۔ ہم زندگی سے کس قدر دُور ہیں؟“

طاہر بگھی سے اُترا۔ دروازے کے باہر زید اس کا انتظار کر رہا تھا۔ طاہر نے کہا۔ ”زید تم ابھی تک سوئے نہیں؟“

زید نے غصّے، شکایت اور شفقت کے لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ خالی ہاتھ شیروں کی کچھار میں جائیں اور مجھے نیند آ جائے۔“

(۳)

شاہی محل کے سامنے ایک نصف دائرے میں سائبانوں کے بیچ دو قطاروں میں امرائے سلطنت کُرسیوں پر رونق افروز تھے۔ ان کے پیچھے تیسری قطار میں نچلے طبقے کے حکام کھڑے تھے۔ اور درمیان میں ذرا اونچے پلیٹ فارم پر ولی عہد ظاہر اور اس کے نوجوان بیٹے مستنصر کی کرسیاں تھیں۔ ظاہر اور مستنصر کے سامنے ایک میز پر سُنہری طشت میں صلاح الدّین ایوبی کی تلوار رکھی ہوئی تھی۔ سائبان اور شاہی محل کے برآمدے کے درمیان میں خالی جگہ پر ایک سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اور محل کے برآمدوں میں ریشی پودوں کے پیچھے شاہی خاندان اور امیر گھرانوں کی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ محل کی دوسری منزل کی کشادہ گیلری کے درمیان ایک خوب صورت محراب کے نیچے ایک سُنہری کرسی دکھائی دیتی تھی اور شامیانے کے نیچے بیٹھنے والے تمام امرا کی نگاہیں اس کی کرسی پر لگی ہوئی تھیں۔ ولی عہد کے دائیں ہاتھ وزیر اعظم اور شہزادہ مستنصر کے بائیں ہاتھ سپہ سالار کی کرسیاں تھیں اور دوسرے وزرا فوجی عہدے

داروں اور بیرونی ممالک کے سفیروں کو ان کے مراتب کے لحاظ سے بٹھایا گیا تھا۔ چنگیز خان کے سفیر کی کرسی وزیر اعظم کے ساتھ تھی اور علاؤالدّین محمد شاہ کا سفیر عماد المُلک سپہ سالار کے قریب بیٹھا تھا۔

پہلی قطار کے ایک سرے پر قاسم کی کرسی تھی اور اس کے پیچھے دوسری قطار میں طاہر بیٹھا ہوا تھا۔ طاہر کے بائیں ہاتھ کی کُرسیاں چھوڑ کر قاسم کا فرانسیسی استاد بیٹھا ہوا تھا اور طاہر کے عین پیچھے تیسری قطار میں عبد العزیز کھڑا تھا۔

طاہر نے عبدالعزیز کی طرف مڑ کر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "کیا ہمارا مقابلہ اس قالین پر ہو گا؟"

عبد العزیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ خالی قالین تو صرف اس لیے ہے کہ آپ کا مقابلہ وزیر اعظم کے صاحب زادے سے ہو گا۔ اگر یہ مقابلہ شاہی خاندان کے کسی فرد کے ساتھ ہوتا تو اس پر پھولوں کی سیج بھی بچھائی جاتی۔"

طاہر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا چوگان کے لیے بھی میدان میں قالین بچھائے جاتے ہیں؟“

عبدالعزیز نے آہستہ سے اس کے کان میں جواب دیا۔ ”نہیں لیکن اگر ہمارے تنزّل کی رفتار یہی رہی تو ممکن ہے کہ اس کا بھی رواج ہو جائے۔ آپ نے لوکس کو دیکھا؟ آپ کے بائیں ہاتھ چوتھی کرسی پر!“

طاہر نے بائیں طرف دیکھا اور کہا ”ارے! یہ تو پوری تیاری کر کے آیا ہے؟“

عبدالعزیز نے کہا۔ ”آپ اسے ہر وقت اسی لباس میں دیکھیں گے۔ شاید یہ سوتا بھی اسی لباس میں ہے۔ آپ ہمت کریں۔ شاگرد کے بعد استاد کی باری ضرور آئے گی۔ شاید سپہ سالار شہزاد مستنصر کے ساتھ اس وقت یہی بات کر رہا ہے۔“

طاہر نے سپہ سالار کی طرف دیکھا۔ وہ مستنصر سے سرگوشی کے انداز میں کوئی بات کہہ رہا تھا۔ قاسم نے طاہر کی طرف مُڑ کر دیکھا اور ذرا بلند آواز

میں کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کھیل بہت جلد ختم کر دوں گا۔“

اس کے جواب میں طاہر کی خاموشی پر لوکس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا۔ ”لیکن اتنی جلدی نہ کرنا۔ اگر تماشہ فوراً ختم کر دیا تو دیکھنے والوں کو مایوسی ہو گی۔“

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہیں طاہر کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ اس نے مُڑ کر عبد العزیز کی طرف دیکھا۔ عبد العزیز کی طرف دیکھنے کے بعد طاہر لوکس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”آپ مطمئن رہیں۔ دیکھنے والوں کو مایوسی نہیں ہو گی۔ شاید آپ کو بھی مایوسی نہ ہو۔ جب تک آپ خود اس بات کی خواہش نہیں کریں گے۔ یہ کھیل ختم نہیں ہو گا۔“

طاہر کے الفاظ میں ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی تھی اور اپنے استاد کی طرح قاسم بھی اپنے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسری طرف بر آمدے میں ریشمی پردوں کے پیچھے خواتین کے اجتماع

میں صفیہ سکینہ سے کہہ رہی تھی۔ دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ قاسم کی زبان اس کی تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ سکینہ نے کہا۔ ”وہ کوئی دوستانہ بات کر رہے ہوں گے۔“

صفیہ نے کہا۔ ”اگر کوئی دوستانہ بات ہوتی تو سلسلہ کلام اس کے جواب پر ختم نہ ہو جاتا۔ قاسم کے منہ سے کوئی سخت بات نکل گئی ہو گی۔ اس کے یونانی استاد نے تائید کی ہو گی اور اب اس کا جواب سن کر دونوں بھیگی بلّیوں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے ہیں۔“

سکینہ نے کہا۔ ”میرا بھائی تو ایک شیر کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ تم ہر بات فرض کر لیتی ہو۔ بھلا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ قاسم نے اس سے کوئی سخت بات کی ہے؟ اتنی دور سے نہ کوئی بات سن سکتی ہو اور نہ میں سن سکتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ قاسم کی تلوار تیز ہے یا زبان۔ قاسم اس کی ایسی گت بنائے گا کہ وہ دوبارہ تلوار کو ہاتھ لگانے کا نام نہ لے گا۔“

صفیہ نے کہا۔ ”اور اگر قاسم کی گت بن گئی تو۔۔۔۔۔۔۔؟“

سکینہ نے کہا۔ ”صفیہ ! خدا سے نیک دُعا مانگو۔ تمہیں اس اجنبی کے ساتھ اس قدر ہمدردی کیوں ہے ؟“

صفیہ نے چونک کر جواب دیا۔ ”مجھے ایک اجنبی کے ساتھ نہیں، اس مجاہد کے بیٹے کے ساتھ ہمدردی ہے جس نے یروشلم مسلمانوں کی فتح کا جھنڈا نصب کر کے صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار حاصل کی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کا بیٹا بھری محفل میں اپنے باپ کی اس مقدس امانت کا نااہل ثابت ہو اور قاسم اس تلوار کو حاصل کر کے بھی کیا کرے گا؟“

”کیا وہ ایک سپاہی نہیں ؟“

”سپاہی ؟ سپہ سالار کی لڑکی سے پوچھو وہ کیسا سپاہی ہے۔ زیادہ جاننا چاہو تو عبد المُلک کی بیوی سے پوچھو۔ وہ صرف قالین پر کشتی لڑنے والا پہلوان ہے۔ پتھریلی زمین پر چار منازل طے کرنے کے بعد سپہ سالار سے لڑ کر گھر لوٹ آیا تھا۔ خوش قسمتی سے خوارزم کی افواج واپس چلی گئیں اور

اسے باتیں بنانے کے لیے بہانہ مل گیا۔ ورنہ میں نے سنا ہے کہ وہ رات کے وقت خواب کی حالت میں بھی چلا اُٹھتا تھا کہ ترک آ گئے۔ بھاگو اپنی جانیں بچاؤ! میں یہ کہتی ہوں کہ اگر وہ تمہارا بھائی ہونے کی بجائے ایک عام آدمی کا لڑکا ہوتا تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو میدانِ جنگ سے بھاگنے والے سپاہیوں سے کیا جاتا ہے۔"

سکینہ نے کہا۔ "یہ سب سپہ سالار کی شرارت ہے۔ اس نے قاسم کو خلیفہ کی نظروں سے گرانے کے لیے ایسی باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ لیکن آج اسے بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ بغداد کی افواج کی قیادت سنبھالنے کا حق دار کون ہے؟"

صفیہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بالائی منزل سے نقیب نے بلند آواز میں کوئی ایک درجن القاب بول کر خلیفۃ المسلمین کی آمد کی خبر دی۔ شامیانے کے اندر بیٹھنے والے امراء نے اوپر کی بالکنی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر تعظیم سے گردنیں جھکا لیں لیکن طاہر گردن جھکانے کی بجائے دم بخود سا ہو کر سفید ریش خلیفہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے چہرے کے صحیح خدو

خال کو بڑھاپے کی جھریوں نے چھپا رکھا تھا۔ دو حبشی غلاموں نے بوڑھے خلیفہ کو سہارا دے کر سُنہری کرسی پر بٹھا دیا۔ اچانک دریچوں کے پردے گرے اور نقیب نے حاضرین کو بیٹھنے کا حکم دیا۔

(۴)

ایک فوجی افسر ثالث کے فرائض سرانجام دینے کے لیے میدان میں آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک حبشی غلام سنہری طشت میں چند تلواریں جو مشق کے لیے استعمال کی جاتی تھیں اٹھائے ہوئے آگے بڑھا۔ ثالث کے اشارے پر قاسم اور طاہر اپنی کرسیوں سے اُٹھے اور انہوں نے طشت سے ایک ایک تلوار اُٹھالی۔ قاسم نے اپنے خود کا نقاب چہرے پر سرکا لیا۔ طاہر نے اس کی تقلید کی۔ تماشائیوں پر ایک سکوت طاری تھا۔

تلواروں کی جھنکار آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی اور اس جھنکار کے ساتھ ساتھ تماشائیوں کی زبانیں کھلنے لگیں۔

امراء جو اپنی کرسیوں پر ٹیک لگائے ہوئے آرام سے بیٹھے تھے۔ آہستہ

آہستہ آگے کی طرف جھکنے لگے۔ قاسم کے حملوں کی تیزی بڑھ رہی تھی اور طاہر صرف اس کے وار روکنے پر اکتفا کر رہا تھا۔ تماشائی ایک طرف قاسم کی تندہی اور تیزی کے معترف تھے تو دوسری طرف انہیں مدافعانہ جنگ میں طاہر کے کمال کا اعتراف تھا۔ وزیر اعظم اپنی کرسی پر اکڑ اکڑ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو سپہ سالار اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی سے بالشت بھر اونچا ہو رہا تھا۔ قاسم کا استاد لوکس اپنے شاگرد کے پے در پے حملوں کی ناکامی برداشت نہ کر سکا اور فرانسیسی زبان میں کچھ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا لیکن پیچھے سے ایک قوی ہیکل فوجی افسر نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے زبردستی دبا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ اس کی کرسی کے پیچھے عبدالعزیز پہنچ چکا تھا اور اسے اپنے کندھوں پر نئے ہاتھ کا دباؤ کہیں زیادہ حوصلہ شکن محسوس ہوا۔

دوسری طرف خواتین کے اجتماع میں صفیہ سکینہ سے کہہ رہی تھی۔ ”سکینہ! کیا تمہارے خیال میں بغداد کے مہذب نوجوان نے مدینے کے

ایک بدّو کو مقابلے کی دعوت دے کر غلطی نہیں کی؟ قاسم کہتا تھا کہ پچاس گننے سے پہلے کھیل ختم ہو جائے گا اور میں تین سو گن چکی ہوں۔"

سکینہ نے صفیہ سے زیادہ اپنے آپ کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "پگلی میں نے اسے کہا تھا کہ ذرا تھوڑا تماشہ ہونے دینا۔ وہ اسے ایک بچے کی طرح کھلا رہا ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ جب بچّہ اسے کھلانا شروع کرے گا تو اس کی حالت قابلِ رحم ہو گی!"

سکینہ نے کہا۔ "تم دس دن تیغ زنی کی مشق کرنے کے بعد یہ سمجھ بیٹھی ہو کہ تم اس فن کی استاد ہو گئی ہو۔ تم کیا جانو مردوں کا کھیل!"

صفیہ نے کہا۔ "میں اپنے مقابلے میں تمہارے بھائی کی برتری کا اعتراف کرتی ہوں لیکن یہاں اس کا مقابلہ ایک مرد کے ساتھ ہو رہا ہے اور وہ بھی بدّو کے ساتھ، جو لڑے بغیر ہار نہیں مانے گا۔ دیکھو! قاسم اب اندھا دھند وار کر رہا ہے اور وہ ابھی تک روکنے پر اکتفا کر رہا ہے۔"

طاہر کے بچاؤ کے لیے پیچھے دیکھ کر سکینہ نے مسرت سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ ”جسے وار کرنا ہی نہ آتا ہو وہ روکنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہے؟“

صفیہ نے کہا۔ ”اگر کہو تو پچاس کی گنتی اب پھر شروع کر دوں؟“

سکینہ نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ اب تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لو۔ کہیں میرے بھائی کو تمہاری نظر نہ لگ جائے۔ جب تمہارا یہ بدّو تلوار پھینک کر زمین پر لیٹ جائے گا، میں تمہیں آنکھیں کھولنے کے لیے کہوں گی۔“

صفیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنی باتوں کے باوجود ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے اس نے ابھی تک دُعا نہ کی تھی اور آنکھیں بند کرنے کے بعد جب اس نے دُعا کا ارادہ کیا تو اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا کہ وہ کس کی فتح کے لیے دعا کرے؟ قاسم اس کے چچا کا لڑکا تھا۔ اس کے خاندان کی تمام اُمّیدیں اس کے ساتھ وابستہ تھیں اور اس کے علاوہ وہ اسے چاہتا بھی تھا۔ اپنی تمام کمزوریوں اور تمام کوتاہیوں کے باوجود قاسم

اسے چاہتا تھا اور جب تک اس کے فوج سے واپس آنے کے بعد اس کی بزدلی کے افسانے مشہور ہوئے تھے، اسے خود بھی اس سے نفرت نہ تھی۔ جب وہ خوارزم شاہ کے مقابلے کے لیے روانہ ہونے والی فوج کا ساتھ دینے کے لیے گھر سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا تھا تو صفیہ نے نہایت خلوص کے ساتھ اپنے دل میں کہا تھا۔ ”قاسم! خدا تمھیں سلامتی سے واپس لائے اور جب بغداد کے لوگ میدان میں تمہارے بہادرانہ کارناموں کے عوض تمہارے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں تو میں بھی اپنے باغ کے بہترین پھول تمہارے لیے منتخب کروں اور پھر اگر سکینہ یہ کہے کہ صفیہ تمھیں قاسم پسند ہے؟ تو میں بُرا نہیں مانوں گی۔ لیکن جب قاسم واپس آیا اور اس کی بُزدلی کے افسانوں کے ساتھ اس کی شراب نوشی کے قصّے مشہور ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے ہمیشہ نفرت سے دیکھتی تھی اور اظہارِ محبت کے لیے قاسم کی مجنونانہ حرکتوں نے اس نفرت کی خلیج کو اور وسیع کر دیا تھا لیکن اس وقت قاسم اس کے چچازاد بھائی کا مقابلہ ایک اجنبی کے ساتھ تھا۔ وہ اجنبی جس کے متعلق وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے اور اس کے پاس صلاح الدّین

ایوبیؒ کی نشانی ہے۔ صلاح الدّین ایوبیؒ کے زمانے میں اس کے باپ نے بھی ہلال و صلیب کے معرکے میں ایک گمنام سپاہی کی حیثیت سے حصّہ لیا تھا، اس لیے اسے اسلام کے اس عظیم الشّان مجاہد کے نام سے عقیدت تھی اور اسی عقیدت نے اس کے دل میں اس اجنبی کے لیے مروّت کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ لیکن کیا طاہر سے ہمدردی کے لیے صرف یہی وجہ کافی تھی کہ اس کے پاس صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار تھی؟ صفیہ بار بار اپنے دل سے یہ سوال پوچھ رہی تھی اور ہر بار اس کا دل یہ گواہی دیتا تھا، نہیں اگر کسی اور نوجوان کے پاس یہ تلوار ہوتی تو شاید تجھے قطعاً متاثر نہ کر سکتا۔ صفیہ! صفیہ! تو بھی ان نوجوان لڑکیوں میں سے ایک ہے جنھوں نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اس کی حسین صورت کو اپنے دھڑکتے ہوئے دلوں کی نیک دُعاؤں کا مستحق سمجھ لیا تھا۔

اچانک تماشائیوں کی دبی ہوئی آواز بُلند نعروں میں تبدیل ہونے لگیں لیکن صفیہ آنکھیں کھولنے کی بجائے تصوّر میں یکے بعد دو صورتیں دیکھ رہی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اس کے سامنے فاتح قاسم کی مغرور

صورت اور شکست خوردہ طاہر کی بے کس شکل تھی اور دوسرے لمحے میں وہ طاہر کے سامنے اپنے چچازاد بھائی کو گردن جھکائے دیکھ رہی تھی۔ خون کے رشتے نے جوش مارا اور اس نے جلدی سے دُعا کی۔ "یا اللہ! قاسم کی فتح۔۔۔ لیکن اس کی زبان رُک گئی۔ وہ اجنبی جس نے اس کی زندگی کے سمندر میں پہلی بار ہلکی ہلکی موجیں پیدا کی تھیں۔ انتہائی بے بسی کی حالت میں یہ پوچھ رہا تھا۔ "کیا میرے لیے تمہارا چچازاد بھائی نہ ہونا ایک گناہ ہے؟"

تماشائیوں کی بڑھتی ہوئی لَے دے سُن کر صفیہ نے آنکھیں کھولیں۔ طاہر کی مدافعت اب جارحانہ حملوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور قاسم بد حواس ہو کر اُلٹے پاؤں میدان میں چکر لگا رہا تھا۔ قاسم تین بار اُلٹے پاؤں بھاگتے ہوئے گِرا لیکن طاہر نے اُس کے سینے پر تلوار رکھ کر ہار منوانے کی بجائے ہر بار اُسے اُٹھنے کا موقع دیا۔ چوتھی بار گِر کر قاسم نے اُٹھنے کی بجائے اپنی تلوار پھینک دی۔ طاہر نے آگے بڑھ کر اسے اُٹھانے کے لیے ہاتھ کا سہارا دینا چاہا لیکن اس نے طاہر کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا اور اُٹھ کر

ڈگمگاتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے خود اُتار کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا اور اس کے چہرے سے پسینے کی دھاریں چھوٹ رہی تھیں۔ لوکس نے اٹھ کر اسے پسینہ پونچھنے کے لیے اپنا رومال پیش کیا لیکن قاسم نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ جب لوکس پریشان ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ عبدالعزیز نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ ”یہ رومال اپنے لیے رکھیے۔ ابھی لوگوں کی تسلّی نہیں ہوئی۔ وہ آپ کے کرتب بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔“

لوکس کے لیے ہونٹ کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

(۵)

بغداد کے امراء دبی زبان سے طاہر کو داد دے رہے تھے لیکن خوارزم کا سفیر اپنی کرسی سے اُٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے طاہر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نوجوان میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ صلاح الدّین ایوبیؒ کے بہادر سپاہی کے بیٹے سے ہمیں یہی توقع تھی!“

طاہر نے خُود اُتار کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ عماد الملک نے اس کا خود پکڑتے ہوئے اسے اپنا رومال پیش کیا۔ طاہر اس کے ہاتھ سے رومال لے کر اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ رہا تھا کہ اوپر سے نقیب نے اعلان کیا کہ خلیفۃ المسلمین جا رہے ہیں۔ حاضرین اُٹھ کر احترام کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ نقیب نے تھوڑی دیر بعد خلیفہ کے تشریف لے جانے کا اعلان کیا اور سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

طاہر، عماد الملک کے ہاتھ سے اپنا خود لے کر پسینہ پونچھتا ہوا اپنی جگہ بیٹھا، امرائے سلطنت کی نگاہیں وزیر اعظم پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ذہنی کرب کو ایک سیاسی مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا:

"میں خلیفۃ المسلمین، ولی عہد سلطنت شہزادہ مستنصر اور امرائے بغداد کی طرف سے طاہر بن یوسف کو ہدیۂ تبرک پیش کرتا ہوں اور اُمّید کرتا ہوں کہ یہ تلوار جس کا اس نوجوان نے اپنے آپ کو بہترین حقدار ثابت کیا ہے، دولتِ عباسیہ کی بہترین خدمات سرانجام دے گی۔"

اس تقریر نے حاضرین کی جھجک دُور کر دی اور وہ یکے بعد دیگرے اُٹھ کر طاہر سے مصافحہ کرنے لگے۔

سپہ سالار پھر ایک بار مستنصر سے سرگوشی کرنے کے بعد اٹھا اور بلند آواز میں بولا:

”شہزادہ مستنصر باللہ کی خواہش ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار کمر میں باندھنے سے پہلے اس کا ایک اور امتحان لیں۔ ہمارے معزّز مہمانوں میں سے ایک کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں اس سے بہترین تیغ زن کوئی نہیں۔ اگر طاہر بہت زیادہ تھک نہ گیا ہو تو میں یہ درخواست کروں گا کہ وہ ہمارے معزّز مہمان کی دعوت قبول کرے، کیونکہ طاہر کے پاس اگر صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار ہے تو ہمارے معزّز مہمان لوکس کے پاس شاہِ فرانس کا آفرین نامہ ہے۔“

لوکس نے یہ سن کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اپنی کرسی سے اُٹھا اور سر پر خُود رکھ کر میدان میں آ کھڑا ہوا۔ طاہر پانی کا پیالہ پی کر مُسکراتا ہوا اُٹھا۔ عبد

العزیز نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ ”آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ مقابلہ جلد ختم کرنے کی کوشش کریں۔“ طاہر نے اطمینان سے اپنے سر پر خُود رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ساتھ میرا کھیل بہت مختصر ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

حبشی غلام نے آگے بڑھ کر تلواریں پیش کیں۔ لوکس نے اپنے لیے ایک تلوار اٹھانے کی بجائے دو تلواریں اُٹھائیں اور ایک تلوار طاہر کی طرف پھینک دی۔ طاہر نے تلوار دبوچ لی اور اس کے وار کا انتظار کرنے لگا۔ لوکس طاہر کا طریقہ جنگ دیکھ چکا تھا۔ اس نے اُس کی تھکاوٹ سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً حملہ کر دیا لیکن بجائے اس کے کہ طاہر اس کا وار اپنی تلوار پر روکتا، اس نے جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کا وار خالی جانے دیا اور جب اس کی تلوار کی نوک زمین کے ساتھ لگ چکی تھی، طاہر نے اپنی تلوار پوری طاقت کے ساتھ گھما کر اس کی تلوار کے ساتھ دے ماری۔ لوکس کے ہاتھ سے تلوار گِر پڑی اور وہ خالی ہاتھ میدان میں کھڑا لوگوں کے قہقہے سن رہا تھا۔

شہزادہ مستنصر نے ولی عہد ظاہر شاہ کا اشارہ پا کر میز پر سے تلوار اٹھائی اور آگے بڑھ کر طاہر کی کمر کے ساتھ باندھ دی اور طاہر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے اسلحہ خانے میں اس سے زیادہ خوب صورت، اس سے زیادہ چمک دار اور تیز تلواریں ہیں لیکن کاش آپ جیسے چند اور سپاہی بھی ہوتے۔ آپ یہاں سے نہ جائیں، ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”جب تک آپ کو میری ضرورت ہے، میں یہیں ہوں۔

”چلیے ابّا جان سے ملیے!“

طاہر ولی عہد کی کرسی کے قریب پہنچا۔ ولی عہد نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نوجوان! میرے اصطبل کا بہترین گھوڑا جس پر میں سوار ہونے کی حسرت اب تک پوری نہ کر سکا اور میرے اسلحہ خانے کی بہترین تلوار، جس کے استعمال سے میرے ہاتھ ناواقف ہیں، تمہیں انعام میں دیتا ہوں۔ آج یہ چیزیں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔“

یہ کہ کر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ”مستنصر! مہمانوں کو رخصت کرنا اب تمہارا کام ہے۔ میں جاتا ہوں، میری طبعیت خراب ہے۔“

ولی عہد کے چلے جانے کے بعد اہلِ محفل اور زیادہ بے تکلّف ہو گئے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر طاہر سے مصافحہ کر رہے تھے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی چنگیز خان کے سفیر نے بھی طاہر کے ساتھ مصافحہ کیا لیکن اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے طاہر نے اپنے جسم میں ایک کپکپاہٹ محسوس کی۔

مجلس آہستہ آہستہ برخاست ہونے لگی۔ وزیر اعظم نے رخصت ہوتے ہوئے طاہر سے کہا۔ ”بیٹا! میرے ہاں رات دعوت نہ بھولنا!“

قاسم ابھی تک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وزیر اعظم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کُرسی سے اُٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر محل کی طرف چل دیا۔

سب سے آخر میں طاہر کے گرد سپہ سالار اور دوسرے فوجی افسر رہ گئے۔ سپہ سالار نے عبدالعزیز کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”استاد کے بعد شاگرد!“

عبد العزیز نے کہا۔ ”شاگرد کے بعد استاد۔“

سپہ سالار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”عزیز! تمہیں شکار کا بہت شوق ہے۔ میں کل سے تمہیں اور تمہارے دوستوں کو لیکن آٹھ سے زیادہ نہ ہوں، تین دن کی چھٹی دیتا ہوں۔ طاہر کو ساتھ لے جاؤ!“

پردے کے پیچھے صفیہ سکینہ سے کہہ رہی تھی۔ ”سکینہ! دیکھا بدّو کو؟“ سکینہ خاموش تھی اور جب صفیہ اس کے ساتھ اپنے محل کی طرف جارہی تھی، وہ تمام راستہ اپنے دل میں بدّو کا لفظ دہراتی رہی۔ اس کے لیے اس لفظ کے معنی بدل چکے تھے۔ ”کُل آٹھ!“

”اور کون کون ہیں؟“

”عبد العزیز، عبد الملک، مبارک اور افضل۔ باقی فوجی افسر ہیں۔ ان کے نام میں نہیں جانتا۔ ہاں شاید ایک طاہر کا نوکر ہے۔“

قاسم نے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں ہم گھوڑوں پر جائیں یا کشتیوں میں جانا بہتر رہے گا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”گھوڑوں پر جانے سے یہ بات راز نہیں رہ سکے گی۔ ہم کشتیوں پر راتوں رات واپس آ سکتے ہیں۔“

قاسم لوکس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اگر آپ کو ہمارا ساتھ دینا پسند نہ ہو تو آپ یہاں رہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک آدمی سے کوئی خاص کمی نہ ہو گی۔“

لوکس نے جواب دیا۔ ”میں ان لوگوں میں سے نہیں جو غلط اور خطرناک راستوں پر دوستوں کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بہادروں کی روایات کے خلاف ہے۔ کم از کم سوئے ہوئے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے میری تلوار بے نیام نہ ہو گی۔“

قاسم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ ہم اٹھارہ اُن آٹھ سوئے ہوئے آدمیوں کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے ہیں۔ نہیں۔ ہم انہیں جگا کر منہ ہاتھ دھونے اور اچھی طرح مسلح ہو کر سامنے آنے کا

موقع دیں گے۔ اس کے بعد اگر وہ بھاگ جائیں تو میری خواہش نہیں کہ ہم خوامخواہ ان کے خون سے ہاتھ رنگیں۔ میں انہیں مارنا نہیں چاہتا۔ بھگانا چاہتا ہوں۔ اپنے ساتھ زیادہ آدمی لے جانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ مرعوب ہو کر بھاگ جائیں۔" لوکس نے کہا۔ "اگر وہ مقابلہ کرنے پر اتر آئے تو؟"

قاسم نے جواب دیا۔ "تو ان کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو اپنا مرتبہ نہ پہچاننے والے لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آپ مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ عبدالعزیز آپ کو جھنجھوڑ کر کُرسی پر بٹھا رہا تھا۔ اگر آپ کو اپنی عزّت کا پاس نہیں تو مجھے اس کا پاس ضرور ہے۔ طاہر کے ایک دوست کی طرف سے یہ فقط تمہید تھی۔ اگر ہم نے اس کی آنکھیں کھولنے کے لیے کچھ نہ کیا تو بغداد کا ہر فاقہ مست ہمارے سر پر چڑھ جائے گا۔"

"لیکن آپ کے ابّا جان؟"

"ابا جان کو اگر ہمارے ارادے معلوم ہو جائیں تو شاید وہ اپنی مصلحتوں

کے پیشِ نظر منع کریں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں ان کے سامنے اپنی مہم کی کامیابی کا ذکر کروں گا تو وہ آپ سب کو اپنے دستر خوان پر بلائیں گے۔"

لوکس نے قدرے مغموم لہجے میں کہا۔ "تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

قاسم نے اپنے تمام دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھیے، طاہر کا ہر صورت میں بغداد سے کوچ کرنا ہمارے لیے بہتر ہے۔ وہ سپہ سالار کے محل اور قصرِ خلافت تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور اگر وہ کسی بڑے منصب پر پہنچ گیا تو ہر میدان میں اپنے دوستوں کو آگے کرے گا اور ہم سب کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔"

(٦)

صفیہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی، وہ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھی اور دبے پاؤں گیلری سے گزر کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ الفاظ گھوم رہے تھے۔ دریا کے اسی کنارے پر۔۔۔ یہاں سے کوئی پانچ

کوس دور۔ نیچے کی طرف۔ اس کے دل کی دھڑکن کبھی سست اور کبھی تیز ہو رہی تھی، خیالات کے ایک ہیجان کے ماتحت وہ کبھی چلتے چلتے رُک جاتی اور کبھی تیزی سے قدم اٹھانے لگتی۔ وہ طاہر کو ایک بار پھر باخبر کرنا چاہتی تھی۔ اس کی جان بچانا چاہتی تھی۔ لیکن کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ محض ایک بہادر نوجوان تھا؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ بغداد میں ایک اجنبی تھا۔ ایک اجنبی بدّو۔۔۔ بدّو! بدّو! اس نے چند بار یہ لفظ دہرایا۔ اور اس میں ایک مٹھاس، ایک لذّت اور ایک کشش محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ کاش! میں بھی ایک بدّو ہوتی اور کسی صحرا کی تند ہواؤں میں اس کے دامن کا سہارا لے سکتی۔ اسے سنگِ مرمر کا یہ عالی شان محل ایک بدّو کے خیمے کے مقابلے میں غیر مکمل نظر آرہا تھا۔ وہ ان دلکش فضاؤں میں سانس لینا چاہتی تھی جہاں آزادی کے نخلستانوں میں محبت کے چشمے پھوٹتے تھے۔ جہاں مکروریا نے انسانیت کا چہرہ ابھی تک مسخ نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر اپنے دل میں کہا۔ صفیہ! صفیہ! اپنے دل کو فریب نہ دو۔ اس کی دنیا اور تمہاری دنیا میں ایک ناقابلِ عبور سمندر حائل ہے۔ وہ ایک عام آدمی ہے اور وزیر اعظم کی بھتیجی ہو۔ تم اس کی جان بچا سکو تو یہ ایک کار

خیر ہے۔ اس سے زیادہ ایسے خواب نہ دیکھو۔ ان کی کوئی تعبیر نہیں۔

وہ سکینہ کو تلاش کرتی ہوئی ایک کمرے میں پہنچی۔ سکینہ تکیے کے سہارے قالین پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے صفیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”صفیہ! تم کہاں گئی تھیں؟ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ آؤ مجھے ان اشعار کا مطلب سمجھاؤ!“

”صفیہ! سکینہ! آج گھوڑے پر سیر کے لیے نہ چلو گی؟“

سکینہ نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ”اس وقت؟“ صفیہ نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے تھوڑی دیر کے بعد۔“

سکینہ نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”شام کے وقت چلیں گے۔“

صفیہ نے سکینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج ہم میدان کی بجائے دریا کے کنارے چلیں گے۔“

سکینہ نے جواب دیا۔ ”تمہارا مقصد ہے کہ بغداد کے لوگ ہم سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور ابّا جان ہمارا گھوڑوں پر سوار ہونا بند کر دیں۔ یاد ہے پچھلی دفعہ ہم دریائے دجلہ کے کنارے گئی تھیں تو کس قدر ناراض ہوئے تھے۔“

صفیہ نے کہا۔ ”نقاب میں ہمیں کون پہچانے گا؟“

”لیکن ہمارے گھوڑے تو پہچانے جائیں گے۔“ یہ سُن کر صفیہ سوچ میں پڑ گئی اور اس نے اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شام ہونے تک سکینہ نے اس سے چند بار پوچھا۔ ”صفیہ! تم مغموم ہو۔ آخر بتاؤ تو سہی تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟“ اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا۔ ”سکینہ آج میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ گھوڑے پر ایک لمبی دوڑ لگانے کے بعد میری طبعیت ٹھیک ہو جائے گی۔“

صفیہ کے اصرار پر سکینہ معمول سے کچھ دیر پہلے سیر کو جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر محل سے باہر نکلیں تو صفیہ نے اپنے

گھوڑے کی باگ کھینچنے اور چند بار ایڑ لگانے کے بعد اسے شوخ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ سکینہ! دریا کے کنارے ایک دوڑ لگائیں۔ ہم جلد واپس آ جائیں گی۔ اس کنارے پر شہر کے لوگوں کی آمد و رفت ویسے ہی کم ہے اور اگر بالفرض کوئی ہمارے گھوڑوں سے ہمیں پہچان بھی لے تو اُسے شکایت لے کر آنے کی جرأت نہیں ہو گی اور پھر اس میں برائی ہی کیا ہے؟ بالآخر ہماری وہ مائیں اور بہنیں بھی تو تھیں جو مردوں کے دوش بدوش میدان، جنگ میں جایا کرتی تھیں۔''

سکینہ نے کہا۔ ''لیکن دریا کے کنارے کون سا میدانِ جنگ ہے؟''

صفیہ نے لاجواب کی ہو کر کہا۔ ''میں سمجھی تم ڈرتی ہو۔ لیکن میں تمہیں یقین دِلاتی ہوں کہ میرا خنجر تمہاری حفاظت کرے گا۔''

سکینہ نے کہا۔ ''میں کسی سے کیوں ڈرنے لگی۔ کیا میرے پاس خنجر نہیں؟ چلو!'' سکینہ کا ارادہ بدل جانے کے خوف سے صفیہ نے جلدی سے گھوڑا دریا کی طرف موڑ دیا اور آن کی آن میں یہ دونوں شہر کی آبادی سے نکل

گئیں۔ تھوڑی دور آگے جا کر سکینہ نے شور مچانا شروع کیا۔ ”صفیہ ٹھہرو! آگے جانا خطرناک ہے۔ صفیہ! صفیہ! کیا تم حسن بن صباح کی جنت میں پہنچنے کا ارادہ کر چکی ہو؟“

صفیہ کی تدبیر کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سکینہ تھوڑی دور تک اس کا ساتھ دے۔ اس نے گھوڑا روکے بغیر مُڑ کر سکینہ کی طرف دیکھا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، بلند آواز میں کہا۔ ”سکینہ! یہ گھوڑا آج ذرا سرکشی دکھا رہا ہے۔ میں اس کا مزاج درست کرنا چاہتی ہوں۔ تم اگر آگے جانے سے ڈرتی ہو تو ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔“

اور سکینہ کہہ رہی تھی۔ ”کیسی بے وقوف ہو تم۔ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ اس گھوڑے پر صرف قاسم سوار ہو سکتا ہے۔ تم اس پر مت چڑھو!“

صفیہ نے مُڑ کر جواب دیا۔ ”اس کا جوش ابھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ زیادہ سے

زیادہ دو کوس اور بھاگے گا۔" سکینہ نے کچھ دور اس کا ساتھ دیا اور بالآخر وہ گھوڑے کو روک کر انتہائی پریشانی کی حالت میں صفیہ کے صبا رفتار گھوڑے کی طرف دیکھنے لگی۔ گھوڑا گرد کے اُڑتے ہوئے بادلوں میں روپوش ہو گیا اور سکینہ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔

سُورج غروب ہونے میں کافی دی تھی۔ کنارے کے آس پاس کسانوں اور چرواہوں کی چند بستیاں دیکھ کر سکینہ نے اپنے متعلق کوئی زیادہ خطرہ محسوس نہ کیا۔

چند بار سکینہ کو غصہ آیا اور اس نے چاہا کہ وہ واپس جائے لیکن جب اسے یہ خیال آتا کہ گھر جا کر کیا بتائے گی تو اس کا ارادہ بدل جاتا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا ایک جگہ کھڑا رہنا درست نہیں۔ اس نے معمولی رفتار سے گھوڑا چھوڑ دیا۔ کوئی آدھ میل نیچے جا کر اسے موڑ لیا اور پھر کوئی ایک میل آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل کر رُک گئی۔

مغرب کی طرف شفق کی سُرخی چھا رہی تھی۔ درختوں کے سائے تیزی

سے بڑھ رہے تھے۔ پرندے کھیتوں سے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ سکینہ کی تشویش بڑھ رہی تھی، تاہم وہ اپنے دل کو تسلّی دینے کے لیے یہ کہہ رہی تھی۔ "وہ ایسی نادان نہیں۔ وہ یقیناً بہت دور نہیں گئی ہو گی۔ وہ مجھے ستانے کے لیے دریا کے کنارے کسی درخت کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہو گی۔ اگر میں چل پڑوں تو وہ گھوڑا دوڑا کر مجھ سے آ ملے گی اور پھر میرے قریب جا کر زور سے قہقہہ لگائے گی۔"

سکینہ کے دل میں دوسرا خیال آیا۔ لیکن خدانخواستہ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو تو؟ پھر بھی مجھے چلنا چاہیے۔ میں ابا جان سے کہہ دوں گی کہ اس کا گھوڑا سرکش ہو کر اس طرف نکل آیا تھا۔

بہت دیر سوچنے کے بعد سکینہ نے واپس چلنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم اس امید پر کہ صفیہ آ رہی ہو گی، وہ کبھی کبھی گھوڑے کو روک کر اس کا انتظار کرنے لگتی۔

صفیہ

رات کے وقت وزیر اعظم کے دستر خوان پہ بغداد کے چند منظورِ امراء موجود تھے۔ قاسم کی عدم موجودگی میں وزیر اعظم نے طاہر سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "قاسم اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ہوا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل پر بہت نادم ہے۔ مجھے توقع ہے کہ کل یا پرسوں وہ خود تمہارے پاس آئے گا اور میں اُمّید کرتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست ثابت ہوگے۔"

طاہر نے کہا۔ "وہ مجھے اپنی دوستی کے قابل پائے گا۔"

کھانے کے دوران باقی مہمانوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد

وزیر اعظم نے طاہر سے سوال کیا۔

"کیا تمھیں سپہ سالارِ نے فوج میں کسی اعلیٰ عہدے کی پیشکش نہیں کی؟ میں نے سنا ہے کہ ولی عہد اور شہزادہ مستنصر نے تمہاری سفارش کی ہے؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "سپہ سالار نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ مجھے ولی عہد اور شہزادہ مستنصر کی سفارش کا علم ہے۔"

وزیر اعظم نے غور سے طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر تم فوج میں جانا چاہو تو میں خود سپہ سالار سے کہہ سکتا ہوں لیکن فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ترک فائز ہیں اور ان کے بعد ایرانیوں کا اقتدار ہے۔ اس لیے عرب افسر کے لیے ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "مجھے کسی عہدے کا لالچ نہیں۔ میں صرف مسلمانوں کی خدمت کے لیے کسی موقع کا متلاشی ہوں۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "ایک معمولی عہدے دار کے لیے عام طور پر اپنے

افسروں کو خوش رکھنے کا مسئلہ اس قدر اہم ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی خدمت کر ہی نہیں سکتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ تم اس نازک دور میں سلطنتِ عباسیہ کی نہایت شاندار خدمات سرانجام دے سکتے ہو۔"

طاہر نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم قاسم کا باپ ہونے کے باوجود ایک قابلِ قدر انسان ہے اور اس کے متعلق بغداد کے لوگوں نے جو رائے قائم کی تھی وہ رقابت اور حسد کی پیداوار تھی۔ اس نے کہا۔ "مجھے آپ سلطنتِ بغداد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ پائیں گے۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "موجودہ وقت میں بغداد کے خارجی معاملات بہت اُلجھے ہوئے ہیں اور ہمیں دفترِ خارجہ کے لیے نہایت ہوش مند، ذہین اور قابلِ اعتماد آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

طاہر کو اچانک اپنی منزل کا زینہ دکھائی دیا۔ اس نے کہا۔ "اپنی ذہانت اور ہوش مندی کے متعلق مجھے کوئی دعویٰ نہیں لیکن آپ مجھے قابلِ اعتماد

ضرور پائیں گے۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "میں کل وزیرِ خارجہ سے بات کروں گا۔ ممکن ہے کہ چند دن تک ایک نہایت اہم مہم تمہارے سپرد کر دی جائے۔ شاید قاسم بھی تمہارا رفیقِ کار ہو۔ تم خوارزم کے سفیر سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرو اور اگر ہو سکے تو اسے یقین دلاؤ کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو خوارزم پر تاتاریوں کا حملہ برداشت نہیں کریں گے۔"

طاہر نے کہا۔ "کیا اسے یقین دلانے کی بھی ضرورت ہو گی؟ عالمِ اسلام کا ایک ذلیل ترین فرد بھی خوارزم پر تاتاریوں کا حملہ برداشت نہیں کرے گا۔ لیکن کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ چنگیز خان ضرور ترکستان پر حملہ کرے گا؟" وزیر اعظم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "جب تک چنگیز خان کو بغداد کی غیر جانبداری کا یقین نہ ہو گا وہ جرأت نہیں کرے گا اور ممکن ہے کہ اگر اس کی افواج نے ترکستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تو ہمیں یہ بتانا پڑے کہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود ایک اسلامی سلطنت پر تاتاریوں کی یلغار برداشت نہیں کریں گے۔ تازہ اطلاعات یہ ہیں کہ

چنگیز خان کی افواج خوارزم کی شمال مشرقی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں۔ ممکن ہے ہمیں اسے یہ پیغام بھی بھیجنا پڑے کہ اگر تم نے خوارزم پر حملہ کیا تو بغداد کی افواج خوارزم شاہ کی حمایت کے لیے میدان میں آ جائیں گی۔ لیکن خوارزم شاہ کے عمال کی یہ حالت ہے کہ وہ بغداد سے مملکتِ تاتار میں جانے والے تاجر کو بھی جاسوس سمجھ لیتے ہیں۔ اور ہمارے سفیروں تک کی تلاشی لینے سے باز نہیں آتے اور اب چند دن سے تو وہ بغداد کے کسی ایلچی کو بھی سرحد عبور کر کے چنگیز خان کی مملکت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو خوارزم کے ساتھ ہمارے تعلقات پہلے کی طرح کشیدہ ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ہم ضرورت کے وقت چنگیز خان کو تنبیہہ بھی نہ کر سکیں۔ اس لیے اگر ہم اس نازک وقت پر خوارزم کے سفیر کے ساتھ تمہارے جیسے نوجوان کی دوستی کا فائدہ اٹھا سکے تو اس میں خوارزم اور بغداد دونوں کی بھلائی ہو گی۔ اسے صلاح الدّین ایوبیؒ کی بدولت تمہارے ساتھ بے حد عقیدت ہو چکی ہے۔ اس لیے تم موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ آج تم نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور اس نے سب سے پہلے اُٹھ کر تمہیں داد دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم

سلطنتِ خوارزم کے متعلق اپنے نیک ارادے ظاہر کر کے اسے دوست بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "خوارزم کے متعلق نیک ارادوں کا اظہار میرے دل کی آواز ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنے خلوص سے متاثر کر سکوں گا اور اگر آپ نے چنگیز خان کو تنبیہ کرنے کے لیے منتخب کیا ہے تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ مہم کس کے سپرد کی جائے گی لیکن اگر تم نے خوارزم کے سفیر کا اعتماد حاصل کر لیا تو تمہاری کامیابی کے امکانات بہت روشن ہو جائیں گے کیونکہ خوارزم کی گزر گاہیں ہمارے لیے بند ہونے کی صورت میں ہمارے ایلچی کو مشرق کے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سے ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں جانا پڑے گا اور یہ راستہ وحشی اور لٹیرے قبائل کی موجودگی میں اور بھی خطرناک ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد وزیر اعظم نے

طاہر کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں وہ دوسروں تک نہیں پہنچیں گی۔“

طاہر نے کہا۔ ”اگر آپ مجھ سے یہ وعدہ نہ بھی لیتے تو بھی میں کسی کے ساتھ یہ باتیں نہ کرتا۔ بہرحال آپ کی تسلّی کے لیے میں وعدہ کرتا ہوں اور میرا وعدہ ایک سیاستدان کا وعدہ نہیں، ایک سپاہی کا وعدہ سمجھئے!“

وزیر اعظم کے اشارے سے اس کا محافظ طاہر کو محل سے باہر چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا۔ پہلا دروازہ گزرنے کے بعد باغ میں پاؤں رکھتے ہوئے طاہر نے کہا۔ ”اب آپ جائیے۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔“

محافظ نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو گھر تک پہنچانے کے لیے محل کے دروازے پر بگھی موجود ہے۔“

(۲)

طاہر پھولوں کی کیاریوں میں گزرتی ہوئی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھولوں کی مہک سے لبریز ہوا کے جھونکے اس کے دل و دماغ میں

ایک تازگی اور سرور پیدا کر رہے تھے۔ یہ دن اس کی زندگی کا مبارک ترین دن تھا۔ وہ صبح سے اب تک اپنے کئی سپنوں کی تعبیر دیکھ چکا تھا۔ تیغ زنی کے مقابلے میں اس کی کامیابی نے اس کے لیے منزلِ مقصور کی کئی راہیں کھول دی تھیں، ولی عہد کا بہترین گھوڑا اور اس کی تلوار اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔ شہزادہ مستنصر کو اس نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ بغداد کے امراءاس کے معترف ہو چکے تھے۔ تاہم اسے یہ خدشہ تھا کہ اس نے وزیر اعظم کو ناراض کر لیا ہے۔ اس کے متعلق وہ سن چکا تھا کہ وہ نہایت منتقم المزاج آدمی ہے اور اس کی ایک تدبیر اس کے تمام ارادوں پر پانی پھیر سکتی ہے لیکن دستر خوان پر وزیر اعظم کی خندہ پیشانی اور حسن سلوک نے ان خیالات کی تردید کر دی تھی اور اس کی باتوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس کا سب سے بڑا دوست اور خیر خواہ ہے۔ بغداد کا یہ جہاں دیدہ سیاست دان جس کی اب تک ہزاروں برائیاں سن چکا تھا اب اسے انسانیت کے بہترین اوصاف کا پیکر نظر آرہا تھا۔ طاہر کو قاسم کا خیال آیا اور اس نے اپنے دل میں کہا۔ کاش میں اسے میدان میں اس قدر ذلیل نہ کرتا۔ وزیر اعظم وسیع النظری کے باوجود اس کا باپ ہے اور

اسے یقیناً اس بات کا دُکھ تو ہوا ہو گا۔ دستر خوان پر قاسم کو موجود نہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے دل میں ابھی تک پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ طاہر کو وزیر اعظم کے یہ الفاظ یاد آئے کہ قاسم کل یا پرسوں تک تمہارے پاس آئے گا۔ طاہر نے پہلی دفعہ قاسم کے لیے اپنے دل میں برادرانہ شفقت محسوس کی۔ اس نے سوچا کہ وہ شاید اپنے باپ کے مجبور کرنے پر اس کے پاس آئے تاہم اس کے دل میں ایک تکلیف دہ احساس ضرور ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ میں خود پہل کروں۔ خود اس کے پاس جاؤں اور یہ کہوں۔ قاسم میں تمہارا دوست ہوں۔ بغداد کی بھلائی کے لیے، دولتِ عباسیہ کی بھلائی کے لیے، ہمیں ایک دوسرے کا دوست بننا چاہیے۔ کاش! میں ابھی گھر جانے سے پہلے قاسم سے مل سکتا۔ اتنی جلدی نہیں۔ مجھے قاسم کا غصّہ ٹھنڈا ہو جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔ کل میں عبدالعزیز کے ساتھ شکار پر جانے سے پہلے اسے ضرور ملوں گا اور لوکس اس کا استاد ہے، اس شہر میں اجنبی بھی۔ میں اس کی دلجوئی بھی کروں گا۔

اچانک طاہر نے اپنے ہاتھ پر کسی کی گرفت محسوس کی اور اسے پیچھے سے

کوئی یہ کہتا ہو سنائی دیا ”ٹھہریے!“

طاہر چونک کر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے مڑا۔ اس کے سامنے ایک خواجہ سرا کھڑا تھا۔ خواجہ سرا نے اپنے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور کہا۔ ”میرے ساتھ آیئے۔“

طاہر ایک لمحے کے لیے تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ خواجہ سرا نے کہا۔ ”ڈریے نہیں، میرا پیغام سلامتی کا پیغام ہے۔“

سڑک کے دونوں جانب بہنے والی نہروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگِ مرمر کی سلیں پُلوں کا کام دے رہی تھیں۔ خواجہ سرا جلدی سے نہر عبور کر کے پھولوں کی کیاری میں کھڑا ہو گیا اور طاہر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس کے پیچھے ہو لیا۔ کسی غیر متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا دایاں ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا۔ پھولوں کی کیاری میں سے گزرنے کے بعد وہ خواجہ سرا کے پیچھے گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوا۔ ”یہاں ٹھہریے۔“ یہ کہہ کر خواجہ سرا ایک درخت کے پیچھے غائب ہو

گیا۔ خواجہ سرا کے غائب ہو جانے کے بعد طاہر نے اچانک یہ محسوس کیا کہ اس نے اپنی راہ سے بھٹکنے میں غلطی کی ہے، اس نے احتیاطاً تلوار نیام سے نکالی اور درختوں کے درمیاں ذرا کھلی جگہ چھوڑ کر ایک درخت کے پیچھے چھُپ کر کھڑا ہو گیا۔

(۳)

تھوڑی دیر بعد درختوں کے پتوں میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک نوجوان لڑکی درختوں کے تاریک سائے سے نمودار ہو کر اس جگہ آ کھڑی ہوئی جہاں کچھ دیر پہلے طاہر کھڑا تھا۔ چاند کی روشنی پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ طاہر نے چاند کی کرنوں کو کسی پھول کی سفید پنکھڑیوں میں اس قدر تازگی اور دلفریبی پیدا کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لیکن وہ کون تھی؟ طاہر ایک لمحے کے لیے تصوّرِ حیرت بن کر اس حسین، سادہ اور معصوم چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

نوجوان لڑکی پریشان ہو کر ادھر ادھر جھانک رہی تھی، بالآخر اس نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

طاہر تلوار نیام میں ڈالتے ہوئے درخت کی آڑ سے باہر نکلا۔ لڑکی نے جلدی سے چہرے پر نقاب ڈال لی اور ایک ثانیہ توقف کے بعد کہا۔ ”آپ میرے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں آپ کی بھلائی کے لیے آپ سے کچھ کہنا ضروری سمجھتی ہوں۔“

طاہر لڑکی کے الفاظ کے معانی سے زیادہ ان کے ترنّم سے متاثر ہو رہا تھا۔ لڑکی نے پھر تھوڑی دیر رُک کر کہا۔ ”آپ بغداد میں ایک اجنبی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں آپ کے مخلص دوست بھی ہوں۔ لیکن آپ دوست نما دشمنوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ پائیں گے اور ممکن ہے کہ جس شخص سے آپ پھولوں کی توقع رکھتے ہوں، اس کے ہاتھ میں آپ کے لیے ایک زہر آلو نشتر ہو۔ قاسم سے باخبر رہیے۔ آپ کے متعلق اس کے ارادے خطرناک ہیں!“

طاہر نے جواب دیا۔ ”کل میں نے اس کے ساتھ کچھ زیادتی کی تھی۔ وہ یقیناً مجھ سے خفا ہو گا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اپنے متعلق اس کا دل صاف کرلوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں، مجھے قاسم سے کوئی خطرہ نہیں۔“

لڑکی نے کہا۔ ”بغداد میں آپ جیسے خوش فہم آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ اپنے لیے کوئی ایسا گوشہ تلاش کیجیے جہاں حسد، بغض اور عناد کو دلفریب مسکراہٹوں میں نہیں چھپایا جاتا۔ جہاں دل اور زبان کے درمیان ریا کے پردے نہیں۔ قاسم کو میں آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔ آپ کے لیے اس کی دوستی شاید کھلی دشمنی سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گی۔“

طاہر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”نیک دل خاتون! اس محل میں رہنے والوں کو میری بجائے قاسم سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہیے۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”آپ کو یہ جاننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ میں

قاسم سے یقیناً قریب تر ہوں لیکن مجھے اس کا آپ کے ساتھ الجھنا پسند نہیں۔"

"میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"اس کی وجہ؟" لڑکی نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ "اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں، لیکن آپ مجھ پر اعتبار کیجیے۔ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ آپ اپنے لیے بغداد کا کوئی گوشہ محفوظ نہ سمجھئے!" "آپ میرے متعلق اس قدر پریشان نہ ہوں۔ میرے بازو میری حفاظت کر سکیں گے اور اس کے علاوہ موت سے کبھی نہیں ڈرا۔"

لڑکی نے مغموم لہجے میں کہا۔ "شاید میرے یہاں آنے کی یہی وجہ تھی کہ آپ موت سے نہیں ڈرتے اور آپ کو ڈرانا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن آپ کو اپنے بازوؤں پر اس قدر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ بہادر کی تلوار پیچھے سے حملہ کرنے والے کا خنجر نہیں روک سکتی۔"

طاہر نے کہا۔ "میں قاسم کو اس قدر بُزدل نہیں سمجھتا۔"

لڑکی نے کہا۔ ”قاسم بزدل نہیں، لیکن انتقام کے جوش میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“

”میں اس کا جوش ٹھنڈا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں آپ کی کامیابی کے لیے دُعا کروں گی۔“

”میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا، لیکن اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟“

”اس سوال کا جواب میں دے چکی ہوں۔ آپ مجھے ایک ایسی مسلمان لڑکی سمجھئے جس کے دل میں اپنی قوم کے بہادر فرزندوں کے لیے عزّت ہے۔ آپ کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ آپ ایک بہادر باپ کے بیٹے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی، نہ جانا چاہتی ہوں۔ آپ بھی میرے متعلق زیادہ جاننے کی کوشش نہ کریں۔ زندگی میں ہمارے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ کی کشتی بھنور کے قریب آ چکی ہے۔ میں نے آپ کی آنکھیں کھولنا ضروری

سمجھا۔ میں اپنا فرض پورا کر چکی ہوں۔ میں جاتی ہوں۔ آپ ذرا ٹھہریے۔ میں خواجہ سرا کو بھیجتی ہوں، وہ آپ کو راستے پر چھوڑ آئے گا۔" لڑکی طاہر کو حیران و ششدر چھوڑ کر درختوں میں غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ سرا نمودار ہوا اور طاہر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے آگے چل دیا۔

پھولوں کی کیاری کے قریب پہنچ کر خواجہ سرا نے کہا۔ "اب آگے آپ راستہ جانتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے!"

طاہر کے دل میں خواجہ سرا سے اس لڑکی کے متعلق کچھ پوچھنے کی خواہش ہوئی لیکن زبان نے دِل کی تائید نہ کی۔

(۴)

طاہر مختلف خیالات کی کشمکش میں گلی سے باہر نکلا۔ دروازے کے سامنے بگھی کھڑی تھی۔ کوچوان نے اُسے جھک کر سلام کیا اور وہ کچھ کہے بغیر بگھی پر سوار ہو گیا۔

وہ کون تھی؟ طاہر نے اپنے دل سے بار بار اس سوال کا جواب پوچھ رہا تھا۔ کل اس نے اصطبل کے سامنے دو لڑکیوں کو دیکھا تھا اور وہ غالباً اُن میں سے ایک تھی۔ لیکن اس نے اس کے متعلق اس قدر پریشانی کا اظہار کیوں کیا؟ وہ قاسم سے اس قدر بد ظن کیوں تھی؟ اچانک طاہر کے دماغ میں ایک خیال آیا اور اس کی پریشانی دور ہونے لگی۔ وہ لڑکی اسے یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ بغداد میں رہنا اس کے لیے خطرناک ہے اور اپنے اسے دعوے کے ثبوت میں اس نے بغداد کے لوگوں کی نہایت گھناؤنی تصویر پیش کی تھی۔ کیا یہ قاسم کی شرارت نہیں۔ اور یہ شرارت اس لیے تو نہیں کی گئی کہ وہ مرعوب ہو کر بغداد سے چلا جائے؟ آخر وزیر اعظم کے محل میں رہنے والی ایک لڑکی کو جو یقیناً قاسم کی رشتہ دار یا خادمہ ہو گی، اس کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہونے لگی؟"

لیکن وہ ایک خادمہ نہ تھی۔ وہ ایک شہزادی نظر آتی تھی۔ طاہر کی آنکھوں میں اس کی حسین و جمیل تصویر پھرنے لگی۔ وہ یقیناً وزیر اعظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو گی۔ اس کے الفاظ میں خلوص تھا۔ اس

کے چہرے پر سادگی تھی۔ وہ تصنع اور فریب سے ناواقف معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے قاسم سے کوئی رنجش ہو لیکن وہ بہر حال ایک اجنبی تھا اور اُونچے طبقے کے لوگ گھر کے معاملات ایک اجنبی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ پھر اسے کیونکر معلوم ہوا کہ وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے؟ اس نے وہ تمام معلومات کسی مرد سے حاصل کی ہوں گی اور وہ مرد قاسم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ قاسم کسی پردے کی آڑ میں کھڑا ہو کر وزیر اعظم سے اس کی باتیں سُن رہا ہو گا اور وزیر اعظم کو اس کی طرف بہت زیادہ مائل دیکھ کر اپنے حریف کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے یہ سازش کی ہو گی۔ اس لڑکی کو یقیناً اس نے سکھا پڑھا کر اسے بے وقوف بنانے کے لیے بھیجا ہو گا اور اب وہ لڑکی قاسم سے جا کر یہ کہے گی کہ میں نے اسے بہت ڈرایا۔ وہ تمہارے پاس آکر معذرت کرے گا اور تمہارے سامنے دوزانو ہو کر دوستی کے لیے ہاتھ پھیلائے گا۔

ان خیالات سے طاہر نے دو نتائج اخذ کیے۔ ایک یہ کہ قاسم اپنے باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اپنے گزشتہ طرزِ عمل کی تلافی کے لیے تیار ہے لیکن

وہ چاہتا ہے کہ دوستی کی تجدید کے لیے میں پہل کروں اور اس مقصد کے لیے وہ اس کے دل میں ایک احساسِ مرعوبیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر اس واقعے کے بعد اس نے پہل کی تو وہ سمجھے گا کہ یہ اس لڑکی کی دھمکیوں کا اثر ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ وہ قاسم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے اس کا انتظار کرے۔

اس لڑکی نے قاسم کو جس قدر خطرناک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اس قدر وہ اسے سادہ اور بے ضرر نظر آتا تھا۔ اپنے گھر پہنچ کر دل میں قاسم کے لیے وہی جذبات تھے جو ایک بڑا بھائی چھوٹے اور ضدی بھائی کے لیے محسوس کرتا ہے۔ نوجوان لڑکی سے متعلق اس کی رائے تھی کہ وہ ان امیر زادیوں میں سے ایک تھی جن کی عمر تصنّع اور بناوٹ میں گزر جاتی ہے۔ جو جھوٹ کو سچ بنانا ایک کمال سمجھتی ہیں۔ لیکن رات کو سونے سے پہلے جب وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا ان تمام واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیا وہ سادہ اور معصوم لڑکی اس قدر جھوٹ بول سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب سوچتے ہوئے وہ اس ذہنی کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا جس میں دل اور دماغ کی مختلف آوازیں انسان کو کسی فیصلے پر نہیں پہنچنے دیتیں۔

(۵)

اگلے دن صبح سے لے کر دوپہر تک قاسم گھر سے غائب رہا اور صفیہ پریشانی کی حالت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد محل کے خادموں سے اس کے متعلق پوچھتی رہی۔ دوپہر کے وقت اسے معلوم ہوا کہ قاسم آگیا ہے اور اپنے پندرہ بیس دوستوں کے ساتھ محل کے مشرقی کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔

محل کے اس کونے کے برآمدے کا رُخ دریا کی طرف تھا اور سنگِ مرمر کی سیڑھیاں برآمدے کی کُرسی سے شروع ہو کر دریا تک جا پہنچتی تھیں۔ پانی کی سطح سے ذرا اُوپر آخری سیڑھی پر کہیں کہیں لوہے کی میخیں لگی ہوئی تھیں۔ اور ان میخوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوب صورت کشتیاں

بندھی ہوئی تھیں۔ اس سیڑھی پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف قصرِ خلافت اور سپہ سالار اور دوسرے عہدے داروں کے محلات کے وہ حصّے جو دریا کے کنارے تعمیر کئے گئے تھے، دکھائی دیتے تھے اور ہر محل کے سامنے کشتیوں کی ایک بڑی تعداد نظر آتی تھی۔

صفیہ قاسم کے ارادوں سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ اب جب اس نے یہ سنا کہ وہ اپنے پندرہ بیس دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے، اس کی تشویش بڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ ایک مضبوط ارادہ لے کر محل کے مشرقی کونے کی طرف چل دی۔ اس کونے پر اوپر کی منزل کے کمروں میں کبھی کبھی صُبح یا شام کے وقت خواتین آ کر بیٹھیں اور دریائے دجلہ کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ تیسری منزل پر ایک وسیع بارہ دری تھی۔ دوسری اور تیسری منزل سے دریا کی طرف اُترنے کے لیے پیچ در پیچ سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور ان کا دروازہ دریا کی طرف کھلنے والے بر آمدے کے کونے میں تھا۔

صفیہ تیسری منزل کی گیلری سے گزرتی ہوئی بارہ دری میں پہنچی اور وہاں

سے اسے تنگ سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ نچلے کمرے کی چھت سے ذرا نیچے اس سیڑھی کے دروازے کا رُخ پائیں باغ کی طرف تھا اور قاسم کبھی کبھی خوش گوار موسم میں اس گیلری میں بیٹھ کر اپنے کسی دوست کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔

نیچے اور اوپر سے ان سیڑھیوں کے سوا اس گیلری میں آمدورفت کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ کمرہ جس میں قاسم بیٹھا تھا، اس کے دریچے اس گیلری میں کھُلتے تھے۔ صفیہ ایک دریچے کے قریب بیٹھ گئی اور پردے کو تھوڑا سا ایک طرف سرکا کر نیچے جھانکنے لگی۔

قاسم پندرہ بیس ایسے نوجوانوں میں بیٹھا ہوا تھا جن کے متعلق بغداد کے شریف آدمیوں میں سے کسی کی رائے اچھی نہ تھی۔ صفیہ انہیں اکثر قاسم کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ ان میں لوکس بھی تھا لیکن آج وہ خلافِ عادت بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ قاسم نے کہا۔ "بدنامی کے داغ خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ شروع میں اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ وار کرنا جانتا ہی نہیں اور میں صرف اس خیال سے کہ یہ کھیل جلد

ختم نہ ہو جائے۔ نہایت بے پروائی سے اس پر حملے کرتا رہا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ میرے بازو شل ہو جانے کے بعد وہ اس تیزی سے حملہ کرے گا تو میں شروع میں ہی یہ کھیل ختم کر ڈالتا اور لوکس کے ساتھ بھی اس نے دھوکہ کیا۔ لوکس پر اس نے خلافِ توقع دھاوا بول دیا۔ خیر اب دیکھا جائے گا!"

لوکس نے کہا۔ "کم از کم میں اپنے متعلق یہ نہیں کہوں گا کہ اس نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اس کی فتح برتری کا نتیجہ تھی۔ مجھے اگر کسی بات کا افسوس ہے تو وہ یہ کہ ہم نے بہادروں کی طرح ہار مان کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔"

لوکس کی زبان سے یہ بات سب کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کمرے میں ایک شخص داخل ہوا اور سب کی نگاہیں لوکس سے ہٹ کر اس کی طرف مبذول ہوئیں۔

قاسم نے پوچھا۔ "کیوں کیا خبر لائے؟"

نو وارد نے جواب دیا۔ ”انہوں نے دریا کے اسی کنارے پر نیچے کی طرف یہاں سے پانچ کوس دور خیمہ لگایا ہے۔ اس وقت وہ شکار کھیل رہے ہیں اور رات کے وقت۔۔۔۔۔!“ قاسم نے اس کا فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ ”رات کے وقت گدھے کی نیند سو رہے ہوں گے۔ اسی کنارے پر اوپر کی طرف یا نیچے؟“

”نیچے جنگل کے قریب۔“

”وہ کتنے ہیں؟“

”کُل آٹھ!“

”اور کون کون ہیں؟“

”عبد العزیز، عبد الملک، مبارک اور افضل۔ باقی فوجی افسر ہیں۔ ان کے نام میں نہیں جانتا۔ ہاں شاید ایک طاہر کا نوکر ہے۔“

قاسم نے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں ہم گھوڑوں پر جائیں یا کشتیوں میں

جانا بہتر رہے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "گھوڑوں پر جانے سے یہ بات راز نہیں رہ سکے گی۔ ہم کشتیوں پر راتوں رات واپس آسکتے ہیں۔"

قاسم لوکس کی طرف متوجہ ہوا۔ "اگر آپ کو ہمارا ساتھ دینا پسند نہ ہو تو آپ یہاں رہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک آدمی سے کوئی خاص کمی نہ ہو گی۔"

لوکس نے جواب دیا۔ "میں ان لوگوں میں سے نہیں جو غلط اور خطرناک راستوں پر دوستوں کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بہادروں کی روایات کے خلاف ہے۔ کم از کم سوئے ہوئے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے میری تلوار بے نیام نہ ہو گی۔"

قاسم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارا خیال ہے کہ ہم اٹھارہ اُن آٹھ سوئے ہوئے آدمیوں کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے ہیں۔ نہیں۔ ہم

انہیں جگا کر منہ ہاتھ دھونے اور اچھی طرح مسلح ہو کر سامنے آنے کا موقع دیں گے۔ اس کے بعد اگر وہ بھاگ جائیں تو میری خواہش نہیں کہ ہم خوامخواہ ان کے خون سے ہاتھ رنگیں۔ میں انہیں مارنا نہیں چاہتا۔ بھگانا چاہتا ہوں۔ اپنے ساتھ زیادہ آدمی لے جانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ مرعوب ہو کر بھاگ جائیں۔"

لوکس نے کہا۔ "اگر وہ مقابلہ کرنے پر اتر آئے تو؟"

قاسم نے جواب دیا۔ "تو ان کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو اپنا مرتبہ نہ پہچاننے والے لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آپ مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ عبد العزیز آپ کو جھنجھوڑ کر کُرسی پر بٹھا رہا تھا۔ اگر آپ کو اپنی عزّت کا پاس نہیں تو مجھے اس کا پاس ضرور ہے۔ طاہر کے ایک دوست کی طرف سے یہ فقط تمہید تھی۔ اگر ہم نے اس کی آنکھیں کھولنے کے لیے کچھ نہ کیا تو بغداد کا ہر فاقہ مست ہمارے سر پر چڑھ جائے گا۔"

"لیکن آپ کے ابّا جان؟"

”ابا جان کو اگر ہمارے ارادے معلوم ہو جائیں تو شاید وہ اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر منع کریں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں ان کے سامنے اپنی مہم کی کامیابی کا ذکر کروں گا تو وہ آپ سب کو اپنے دسترخوان پر بلائیں گے۔“

لوکس نے قدرے مغموم لہجے میں کہا۔ ”تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

قاسم نے اپنے تمام دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھیے، طاہر کا ہر صورت میں بغداد سے کوچ کرنا ہمارے لیے بہتر ہے۔ وہ سپہ سالار کے محل اور قصرِ خلافت تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور اگر وہ کسی بڑے منصب پر پہنچ گیا تو ہر میدان میں اپنے دوستوں کو آگے کرے گا اور ہم سب کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔“

(٦)

صفیہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی، وہ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھی اور دبے پاؤں گیلری سے گزر کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس کے ذہن میں بار بار

یہ الفاظ گھوم رہے تھے۔ دریا کے اسی کنارے پر۔۔۔ یہاں سے کوئی پانچ کوس دور۔ نیچے کی طرف۔ اس کے دل کی دھڑکن کبھی سست اور کبھی تیز ہو رہی تھی، خیالات کے ایک ہیجان کے ماتحت وہ کبھی چلتے چلتے رُک جاتی اور کبھی تیزی سے قدم اٹھانے لگتی۔ وہ طاہر کو ایک بار پھر باخبر کرنا چاہتی تھی۔ اس کی جان بچانا چاہتی تھی۔ لیکن کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ محض ایک بہادر نوجوان تھا؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ بغداد میں ایک اجنبی تھا۔ ایک اجنبی بدّو۔۔۔ بدّو! بدّو! اس نے چند بار یہ لفظ دہرایا۔ اور اس میں ایک مٹھاس، ایک لذّت اور ایک کشش محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ کاش! میں بھی ایک بدّو ہوتی اور کسی صحرا کی تند ہواؤں میں اس کے دامن کا سہارا لے سکتی۔ اسے سنگِ مرمر کا یہ عالی شان محل ایک بدّو کے خیمے کے مقابلے میں غیر مکمل نظر آ رہا تھا۔ وہ ان دلکش فضاؤں میں سانس لینا چاہتی تھی جہاں آزادی کے نخلستانوں میں محبت کے چشمے پھوٹتے تھے۔ جہاں مکر و ریا نے انسانیت کا چہرہ ابھی تک مسخ نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر اپنے دل میں کہا۔ صفیہ! صفیہ! اپنے دل کو فریب نہ دو۔ اس کی دنیا اور تمہاری دنیا میں ایک ناقابلِ عبور سمندر حائل ہے۔ وہ ایک عام

آدمی ہے اور وزیر اعظم کی بھتیجی ہو۔ تم اس کی جان بچا سکو تو یہ ایک کار خیر ہے۔ اس سے زیادہ ایسے خواب نہ دیکھو۔ ان کی کوئی تعبیر نہیں۔

وہ سکینہ کو تلاش کرتی ہوئی ایک کمرے میں پہنچی۔ سکینہ تکیے کے سہارے قالین پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے صفیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”صفیہ! تم کہاں گئی تھیں؟ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ آؤ مجھے ان اشعار کا مطلب سمجھاؤ!“

”صفیہ! سکینہ! آج گھوڑے پر سیر کے لیے نہ چلو گی؟“

سکینہ نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ”اس وقت؟“

صفیہ نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے تھوڑی دیر کے بعد۔“

سکینہ نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”شام کے وقت چلیں گے۔“

صفیہ نے سکینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج ہم میدان کی بجائے دریا

کے کنارے چلیں گے۔"

سکینہ نے جواب دیا۔ "تمہارا مقصد ہے کہ بغداد کے لوگ ہم سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور ابّا جان ہمارا گھوڑوں پر سوار ہونا بند کر دیں۔ یاد ہے پچھلی دفعہ ہم دریائے دجلہ کے کنارے گئی تھیں تو کس قدر ناراض ہوئے تھے۔"

صفیہ نے کہا۔ "نقاب میں ہمیں کون پہچانے گا؟"

"لیکن ہمارے گھوڑے تو پہچانے جائیں گے۔" یہ سُن کر صفیہ سوچ میں پڑ گئی اور اس نے اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شام ہونے تک سکینہ نے اس سے چند بار پوچھا۔ "صفیہ! تم مغموم ہو۔ آخر بتاؤ تو سہی تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟" اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا۔ "سکینہ آج میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ گھوڑے پر ایک لمبی دوڑ لگانے کے بعد میری طبعیت ٹھیک ہو جائے گی۔"

صفیہ کے اصرار پر سکینہ معمول سے کچھ دیر پہلے سیر کو جانے کے لیے تیار

ہو گئی۔ جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر محل سے باہر نکلیں تو صفیہ نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچنے اور چند بار ایڑ لگانے کے بعد اسے شوخ کرتے ہوئے کہا۔ ”آؤ سکینہ! دریا کے کنارے ایک دوڑ لگائیں۔ ہم جلد واپس آ جائیں گی۔ اس کنارے پر شہر کے لوگوں کی آمد و رفت ویسے ہی کم ہے اور اگر بالفرض کوئی ہمارے گھوڑوں سے ہمیں پہچان بھی لے تو اُسے شکایت لے کر آنے کی جرأت نہیں ہو گی اور پھر اس میں برائی ہی کیا ہے؟ بالآخر ہماری وہ مائیں اور بہنیں بھی تو تھیں جو مردوں کے دوش بدوش میدان، جنگ میں جایا کرتی تھیں۔“

سکینہ نے کہا۔ ”لیکن دریا کے کنارے کون سا میدانِ جنگ ہے؟“

صفیہ نے لاجواب سی ہو کر کہا۔ ”میں سمجھی تم ڈرتی ہو۔ لیکن میں تمہیں یقین دِلاتی ہوں کہ میرا خنجر تمہاری حفاظت کرے گا۔“

سکینہ نے کہا۔ ”میں کسی سے کیوں ڈرنے لگی۔ کیا میرے پاس خنجر نہیں؟ چلو!“ سکینہ کا ارادہ بدل جانے کے خوف سے صفیہ نے جلدی سے گھوڑا

دریا کی طرف موڑ دیا اور آن کی آن میں یہ دونوں شہر کی آبادی سے نکل گئیں۔ تھوڑی دور آگے جا کر سکینہ نے شور مچانا شروع کیا۔ ”صفیہ ٹھہرو! آگے جانا خطرناک ہے۔ صفیہ! صفیہ! کیا تم حسن بن صباح کی جنت میں پہنچنے کا ارادہ کر چکی ہو؟“

صفیہ کی تدبیر کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سکینہ تھوڑی دور تک اس کا ساتھ دے۔ اس نے گھوڑا روکے بغیر مُڑ کر سکینہ کی طرف دیکھا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، بلند آواز میں کہا۔ ”سکینہ! یہ گھوڑا آج ذرا سرکشی دکھا رہا ہے۔ میں اس کا مزاج درست کرنا چاہتی ہوں۔ تم اگر آگے جانے سے ڈرتی ہو تو ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔“

اور سکینہ کہہ رہی تھی۔ ”کیسی بے وقوف ہو تم۔ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ اس گھوڑے پر صرف قاسم سوار ہو سکتا ہے۔ تم اس پر مت چڑھو!“

صفیہ نے مُڑ کر جواب دیا۔ ”اس کا جوش ابھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو کوس اور بھاگے گا۔“

سکینہ نے کچھ دور اس کا ساتھ دیا اور بالآخر وہ گھوڑے کو روک کر انتہائی پریشانی کی حالت میں صفیہ کے صبا رفتار گھوڑے کی طرف دیکھنے لگی۔ گھوڑا گرد کے اُڑتے ہوئے بادلوں میں روپوش ہو گیا اور سکینہ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔

سُورج غروب ہونے میں کافی دی تھی۔ کنارے کے آس پاس کسانوں اور چرواہوں کی چند بستیاں دیکھ کر سکینہ نے اپنے متعلق کوئی زیادہ خطرہ محسوس نہ کیا۔

چند بار سکینہ کو غصہ آیا اور اس نے چاہا کہ وہ واپس جائے لیکن جب اسے یہ خیال آتا کہ گھر جا کر کیا بتائے گی تو اس کا ارادہ بدل جاتا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا ایک جگہ کھڑا رہنا درست نہیں۔ اس نے معمولی رفتار سے گھوڑا چھوڑ دیا۔ کوئی آدھ میل نیچے جا کر اسے موڑ لیا اور پھر کوئی ایک

میل آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل کر رُک گئی۔

مغرب کی طرف شفق کی سُرخی چھا رہی تھی۔ درختوں کے سائے تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ پرندے کھیتوں سے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ سکینہ کی تشویش بڑھ رہی تھی، تاہم وہ اپنے دل کو تسلّی دینے کے لیے یہ کہہ رہی تھی۔ "وہ ایسی نادان نہیں۔ وہ یقیناً بہت دور نہیں گئی ہو گی۔ وہ مجھے ستانے کے لیے دریا کے کنارے کسی درخت کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہو گی۔ اگر میں چل پڑوں تو وہ گھوڑا دوڑا کر مجھ سے آ ملے گی اور پھر میرے قریب جا کر زور سے قہقہہ لگائے گی۔"

سکینہ کے دل میں دوسرا خیال آیا۔ لیکن خدانخواستہ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو تو؟ پھر بھی مجھے چلنا چاہیے۔ میں ابا جان سے کہہ دوں گی کہ اس کا گھوڑا سرکش ہو کر اس طرف نکل آیا تھا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد سکینہ نے واپس چلنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم اس امید پر کہ صفیہ آ رہی ہو گی، وہ کبھی کبھی گھوڑے کو روک کر اس کا انتظار کرنے لگتی۔

قاسم کا انتقام

طاہر، عبد العزیز کے دوستوں میں سے عبد الملک اور مبارک کے ساتھ بہت جلد مانوس ہو گیا۔ مبارک ایک قوی ہیکل اور سادہ دل سپاہی تھا۔ تعلیم میں بھی وہ باقی سب سے پیچھے تھا۔ احباب کی محفل میں بات کرتے ہوئے وہ بہت جھجکتا لیکن دریا میں تیرنے، گھنے جنگل میں گھوڑے پر ہرن کا پیچھا کرنے اور اُڑتے ہوئے پرندوں کو تیر کا نشانہ بنانے میں اس نے اپنے آپ کو طاہر کی توجہ کا مستحق بنا لیا۔ طاہر کو زید اور مبارک میں بہت سی باتیں مشترک نظر آتیں۔ زید جس قدر دوسروں سے بات کرتا ہوا گھبراتا تھا، اسی قدر مبارک کے ساتھ بے تکلّف ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

افضل ایک خوش وضع نوجوان تھا۔ باتیں کرنے میں وہ کافی ہوشیار تھا لیکن دوسروں کے مقابلے میں اس کی نفاست اور تن آسانی دیکھ کر طاہر نے اس کے متعلق کوئی بلند رائے قائم نہ کی۔ شکار میں افضل نے تھوڑی دیر اپنے دوستوں کا ساتھ دیا اور پھر ایک درخت کے نیچے گھوڑا باندھ کر آرام سے سو گیا۔ دوپہر کے وقت جب وہ دریا میں تیر رہے تھے، زید کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ گہرے پانی سے دور رہنے کے لیے اسے ایک ساتھی مل گیا ہے۔

طاہر جس نوجوان سے متاثر ہوا وہ عبدالملک تھا۔ قد میں وہ عبدالعزیز سے ذرا کم تھا۔ جسمانی طور پر وہ کافی تنومند تھا لیکن اس کا چہرہ نسبتاً لمبوترا اور پتلا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی تیکھے نقوش اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں غایت درجہ کی جاذبیت تھی۔ اس نے بغداد کی بہترین درس گاہوں میں تربیت حاصل کی تھی اور بغداد کے مروجہ علوم پر اسے کافی عبور تھا اور جس قدر طاہر اس کے خیالات کی پختگی سے متاثر ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ طاہر اس کی ذہانت اور تبحر علمی کا معترف تھا۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد

طاہر اور عبد المالک یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ مدّت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

موسیٰ اور نصیر خالص سپاہی تھے۔ انہیں علم و ادب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ فقط عبد العزیز کی شخصیت اور محبت نے انہیں اس ٹولی میں شامل کر دیا تھا اور جس وقت باقی دوست درختوں کے سائے میں بیٹھ کر نہایت اہم مسائل پر گفتگو کر رہے تھے، یہ دونوں ذرا دور بیٹھ کر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

موسیٰ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے جو ہرن شکار کیا ہے وہ وزن میں تمہارے ہرن سے بھاری ہے اور اس کے سینگ تمہارے ہرن سے زیادہ خوب صورت ہیں۔''

نصیر اسے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم نے خواب میں بھی ایسا ہرن شکار نہیں کیا ہو گا۔''

زید کو ان کا جھگڑا علمی مباحث سے زیادہ دلچسپ محسوس ہوا اور وہ اُٹھ کر

ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی بات منوانے سے مایوس ہو کر زید کو اپنا ثالث بنا لیا۔ زید ہرن کی خوبیوں سے زیادہ اس کی وکالت میں نصیر کے جوش و خروش سے متاثر ہوا اور اس نے نصیر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

موسیٰ اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ لیکن نصیر نے کہا۔ ”بس اب ثالث کے فیصلے کے بعد تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔“

موسیٰ نے زید پر اپنا غصّہ یوں اُتارا کہ جب یہ تینوں دریا میں نہا رہے تھے، موسیٰ نے مذاق میں زید کی گردن دبا کر اسے دو تین غوطے دے دیے۔ زید نے باہر نکل کر اُسے کُشتی کے لیے للکارا اور جب موسیٰ مقابلے کی دعوت پر لبیک کہتا ہوا باہر نکلا، مبارک، افضل اور عبدالعزیز، طاہر اور عبد المالک کو چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہوئے۔ زید موسیٰ کو پچھاڑ کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بولا۔ ”اب ان سب کے سامنے اعلان کرو کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ موسیٰ نے تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ہنستے ہوئے

کہا۔ ”میں اعلان کرتا ہوں کہ تمہارا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔“

زید نے کہا۔ ”وعدہ کرو کہ آئندہ پانی میں مجھے غوطہ نہیں دو گے!“

موسیٰ نے وعدہ کیا اور زید نے اسے چھوڑ دیا۔

(۲)

عصر کی نماز کے بعد ان لوگوں نے تیر اندازی کی مشق شروع کر دی لیکن طاہر، عبد العزیز اور عبد المالک دریا کے کنارے سیر کے لیے چل دیے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور وہ خیمے کی طرف لوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ دور سے ایک سوار سرپٹ آتا ہوا دکھائی دیا اور وہ اس طرف دیکھنے لگے۔

سوار کو قریب آتا دیکھ کر عبد العزیز نے کہا۔ ”کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔“ اور طاہر نے اپنے دل میں ایک خلش سی محسوس کی۔ گھوڑا قریب آنے پر خلش پریشانی اور اضطراب میں تبدیل ہونے لگی۔

یہ صفیہ تھی۔ پیشانی اور آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے کچھ فاصلے پر گھوڑا روک لیا اور تذبذب کی حالت میں یکے بعد دیگرے ان تینوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے گھوڑے کو چند قدم آگے بڑھایا اور طاہر پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی آنکھیں کسی تکلیف دہ احساس کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ لڑکی کی ہچکچاہٹ سے متاثر ہو کر عبد المالک نے طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ جاؤ!“

طاہر نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ ”آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ لڑکی نے اپنے تیز تیز سانس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں۔ میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ قاسم۔۔۔۔۔۔ آج رات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

طاہر نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں اس کا فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں قتل کر ڈالے گا۔ لہٰذا ہمیں بغداد سے سو کوس دور نکل جانا چاہیے۔ میرے خیال میں مجھے پہلے بھی آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔“

صفیہ کے دل کو ایک گہرا چرکا لگا اور اس نے کانپتی ہوئی مجروح آواز میں کہا۔

"میں آپ کو بغداد کے بذلہ سنج اور حاضر جواب نوجوانوں سے مختلف سمجھتی تھی۔ بہر حال میں اپنا فرض پورا کرتی ہوں۔ قاسم رات کے وقت پندرہ بیس آدمیوں کے ساتھ کشتی پر یہاں پہنچ کر اچانک آپ پر حملہ کر دے گا۔ آپ یہاں سے چلے جائیں یا اپنی تفریح کے لیے کوئی اور جگہ منتخب کر لیں تو اس میں آپ کی بھلائی ہے۔ ورنہ شاید بغداد میں کوئی یہ نہ پوچھے کہ کون قتل ہوا ہے اور کس نے قتل کیا؟"

طاہر کے شکوک یقین کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے کہا۔ "آپ کی تکلیف کا شکریہ! آپ قاسم سے کہہ دیجیے کہ ایک عقل مند آدمی دوبارہ ایک غلط حربہ استعمال نہیں کرتا۔ میں آپ کو پہلے بھی یقین دِلا چکا ہوں کہ میں اس کا دشمن بننے کی بجائے اس کا دوست بننے کو ترجیح دوں گا لیکن مجھے مرعوب کرنے کے لیے جو طریقے وہ اختیار کر رہا ہے اسے ہر سلیم الفطرت انسان بُرا سمجھے گا۔ میں اسے گلے لگانے کے لیے تیار ہوں۔ اس

کے پاؤں میں رینگنے کے لیے کبھی تیّار نہیں ہوں گا۔"

صفیہ کے لیے طاہر کا زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ اپنے خلوص و ایثار کی تضحیک اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے غصے سے کانپتی ہوئی بلند آواز میں کہا۔ "تم۔۔۔ تم ایک وحشی جاہل اور مغرور بدّو یہ سمجھتے ہو کہ مجھے قاسم نے بھیجا ہے اور میں اس کے کہنے پر یہاں آئی ہوں اور کل بھی تم میرے متعلق یہ رائے لے کر گئے تھے کہ میں اس کی آلۂ کار ہوں اور میں تمہیں مرعوب کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ تم قاسم سے مختلف نہیں۔۔۔۔۔۔ میں بے وقوف تھی۔۔۔۔ اور اب میں تمہیں یہ کہتی ہوں کہ تم رات کے وقت اپنے خیمے میں چراغ جلا کر آرام سے سو جاؤ تاکہ قاسم کو تمہیں تلاش کرنے میں دیر نہ لگے۔"

صفیہ یہاں تک کہہ کر ہچکیاں لینے لگی اور طاہر اس کے الفاظ کی سختی سے زیادہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے کسی پھول کی پنکھڑی پر شبنم کے قطروں میں وہ جاذبیت

نہ دیکھی تھی جو اسے اس کی پلکوں میں اٹکے ہوئے موتیوں میں نظر آرہی تھی۔ اس نے سوچا۔ اگر میں نے اس لڑکی سے متعلق غلط رائے قائم کی ہو تو۔

صفیہ نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں آستین میں چھپالیں اور اس کے بعد طاہر پر ایک ایسی نظر ڈالنے کے بعد جس میں غصّہ بھی تھا اور رحم بھی، گھوڑے کی باگ موڑلی لیکن عبد المالک جو چند قدم پر کھڑا یہ گفتگو سننے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا، تیزی سے آگے بڑھا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”معزّز خاتون! مجھے آپ سے ہم کلام ہونے کا حق نہیں لیکن ایسے موقع پر کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ اور طاہر ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں بہر حال آپ کے آنسو آپ کے خلوص کی شہادت دیتے ہیں۔ طاہر نے شاید آپ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ لیکن آپ اس غلطی کو ناقابلِ معافی نہ سمجھئے۔ وہ بغداد میں ایک اجنبی ہے۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آپ کے متعلق اگر اس نے غلط رائے قائم کی ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ طاہر، قاسم کو

ایک بہادر نوجوان سمجھتے ہوئے اس کے متعلق فوراً بری رائے قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ بغداد کے امراء کی ذہنیت کس قدر گھناؤنی ہے۔ میں قاسم کو جانتا ہوں اور طاہر کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔ آپ کو طاہر کے الفاظ سے یقیناً رنج ہوا ہو گا۔ لیکن آج رات اگر قاسم کے متعلق اس کی خوش فہمی دور ہو گئی تو اس کے بعد آپ سے اس طرح پیش آنے پر اسے جو ندامت اور افسوس ہو گا، شاید آپ اس کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کن مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے یہاں پہنچی ہوں گی۔ آپ نے ہم پر بہت احسان کیا اور میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ہم اس خطرے سے بچ نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اور آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ طاہر کو بھی آپ احسان فراموش نہیں پائیں گی۔ اگر گستاخی نہ ہو تو میرا خیال ہے کہ آپ صفیہ ہیں؟"

صفیہ نے جواب دیا۔ "ہاں! لیکن آپ کو میرے آنے سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو تو آپ اپنی بیوی سے پوچھ لیں۔ اگر آپ عبدالمالک ہیں تو آپ کی

بیوی مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔"

عبد المالک نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیے۔ مجھے آپ کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔"

صفیہ کے غصّے کی آگ سرد ہو چکی تھی۔ طاہر کو ندامت اور افسوس کی حالت میں سر جھکائے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا۔ "جب یہ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوں گے تو مجھے بھی اپنی سخت کلامی پر افسوس ہو گا۔ میں پھر ایک بار کہتی ہوں کہ قاسم رات کے وقت آئے گا۔ آپ باخبر رہیں اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ قاسم کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ آپ وعدہ کیجیے۔"

عبد المالک نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ قاسم کے سر کا بال تک بیکا نہیں ہو گا۔"

طاہر نے گردن اُوپر اٹھائی اور کہا۔ "اگر میں ابھی اپنی ندامت کا اظہار کر دوں تو آپ مجھے قابلِ معافی سمجھیں گی؟"

"نہیں کبھی نہیں۔" صفیہ نے یہ کہتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگادی۔

طاہر خفیف سا ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبدالمالک نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟“

”نہیں۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسے پہلی بار تم نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔“

”کل رات وزیر اعظم کے محل میں۔ لیکن یہ ہے کون؟“

”قاسم کی چچازاد بہن۔ صفیہ!“

”اور اس کے باوجود تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا اندازہ غلط تھا؟“

”تمہارا اندازہ اگر میں غلط سمجھتا ہوں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ قاسم کی چچازاد بہن ہے اور اس کا باپ بغداد کے تمام امراء سے مختلف تھا۔ لیکن چلو نماز کا وقت ہو رہا ہے!“

طاہر ان کے ساتھ چل دیا۔ عبدالعزیز جو اب تک خاموش تھا، طاہر سے

مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ کو اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے آپ کی معذرت کو ٹھکرایا نہیں۔“ پھر وہ عبد المالک سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لڑائی کی صورت میں ہم صرف آٹھ ہونے کے باوجود انہیں بہت اچھا سبق دے سکتے تھے۔ لیکن تم وعدہ کر چکے ہو کہ قاسم کے سر کا بال تک بیکا نہ ہو گا اور جب تلواریں ٹکرانے لگیں تو مدِّمقابل کے بالوں کا لحاظ رکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔“

عبد المالک نے کہا۔ ”میں نے اس کے ساتھ قاسم کی جان کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ یہ وعدہ نہیں کیا کہ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا جائے گا۔“

عبد العزیز نے کہا۔ ”تو ہم اسے آج ایسا سبق دیں گے جو شاید اسے تمام عمر نہ بھولے لیکن تمہیں یقین ہے کہ قاسم رات کے وقت ہم پر حملہ کرے گا؟“

عبد المالک نے جواب دیا۔ ”اس لڑکی کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہے،

میں اس کے پیشِ نظر اس پر یقین نہ کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ قاضی عبد الرحمان اسے قرآن و حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ میری بیوی بھی ان کی شاگرد تھی۔ اس لیے یہ دونوں ایک دوسری کو اچھی طرح جانتی ہیں۔ میری بیوی اس کے متعلق بہت بلند رائے رکھتی ہے۔"

عبد العزیز نے سوال کیا۔ "لیکن تم نے اسے کیسے پہچان لیا؟"

"تم نے غور نہیں کیا۔ اس کے نیچے قاسم کا گھوڑا تھا۔"

(۳)

صفیہ تھکے ہوئے گھوڑے کو کبھی آہستہ اور کبھی تیز رفتار سے بھگاتی ہوئی جارہی تھی۔ اپنے محل سے کوئی نصف کوس کے فاصلے پر اس نے سکینہ کو جالیا۔ سکینہ راستے میں رُک رُک کر کئی بار اُسے غصّے کی حالت میں گالیاں دے چکی تھی اور محبت سے مجبور ہو کر اس کی سلامتی کی دعائیں کر چکی تھی۔ کبھی وہ کہتی۔ "صفیہ تم زندہ سلامت لوٹ آؤ تو میں اتنے دینار خیرات کروں گی۔" اور کبھی وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے یہ کہتی۔ "صفیہ!

تم ایک بار آ جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گی جو تمہیں عمر بھر یاد رہے۔ تمہارے ساتھ سیر کے لیے نکلنا تو در کنار میں کبھی بات تک نہ کروں گی۔ صفیہ! پگلی نادان، بے وقوف، اب شام ہو رہی ہے۔ تم کہاں جا بیٹھی ہو! میں گھر جا کر کیا جواب دوں گی۔ کل تک سارے شہر میں مشہور ہو جائے گا کہ صفیہ غائب ہو گئی۔"

اور جب صفیہ اس کے قریب پہنچ کر کہہ رہی تھی۔ "آپا سکینہ! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ پر خفا ہو جاؤ۔ ذرا میری طرف دیکھو تو میں صفیہ ہوں۔ تمہاری ننھی صفیہ۔" تو سکینہ کے لیے یہ فیصلہ ناممکن تھا کہ اُسے کیا کہنا چاہیے۔

صفیہ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آپا! میری آپا! تمہیں اس قدر خفا دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ میں گھوڑے سے گر کر مر جاتی۔"

"بہت بے وقوف ہو تم۔" سکینہ نے یہ کہتے ہوئے صفیہ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ تھوڑی دور آگے چل کر سکینہ نے

کہا۔ ”اگر تمہیں حسن بن صباح کی جماعت کا کوئی آدمی مل جاتا تو؟“

صفیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”تو میں اسے یہ کہتی۔ تمہاری جنت میں حور بن کر رہنے کی مستحق میں نہیں، سکینہ ہے۔“

سکینہ نے کہا۔ ”اور گھر والوں نے ہماری تلاش شروع کر دی تو کیا بہانہ بناؤ گی؟“

صفیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ابھی تو شام ہوئی ہے۔ چاندنی راتوں میں تو ہم کئی دفعہ عشاء کے وقت گھر لوٹا کرتی ہیں۔“

دریا کے پل کے قریب پہنچ کر صفیہ کو دو کشتیاں دکھائی دیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کشتی پر سوار ہونے والوں کو اچھی طرح نہ دیکھ سکی لیکن کشتیوں کی رفتار دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ قاسم اور اس کے ساتھی ہیں۔

(۴)

اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد قاسم نے طاہر اور اس کے ساتھیوں کے خیمے سے کوئی دو سو گز دُور کشتیاں کنارے پر لگانے کا حکم دیا۔

کنارے پر اُتر کر ان سب نے اپنے چہروں پر نقاب ڈال لیے اور چاند کی روشنی سے بچنے کے لیے سامنے درختوں کے سائے میں پہنچ کر دبے پاؤں خیمے کی طرف بڑھنے لگے۔ خیمے کے قریب وہ ایک گھنے درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی دیر کانا پھوسی کے بعد ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے دبے پاؤں خیمے کے گرد ایک چکر لگانے کے بعد اندر جھانک کر دیکھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔ ”اندر ایک کونے میں آگ جل رہی ہے اور وہ اپنے اوپر چادریں ڈال کر خرگوش کی نیند سو رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ بہترین موقع ہے۔“

قاسم نے کہا۔ ”لیکن ان کے گھوڑے دکھائی نہیں دیتے؟“

ایک شخص نے جواب دیا۔ "گھوڑے اگر انہوں نے جنگل میں چرنے کے لیے کھُلے نہیں چھوڑ دیے تو ان کی بے خبری میں کوئی چُرا کر لے گیا ہو گا۔ اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

قاسم کے اشارے پر سب نے تلواریں نکال لیں۔ لوکس نے آگے بڑھ کر قاسم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ اُنہیں جگا کر بھاگنے یا مقابلے کے لیے مسلح ہونے کا موقع دیں گے۔"

قاسم نے جواب دیا۔ "اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو علیٰحدہ رہ سکتے ہیں۔ آپ کی ضرورت پڑی تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔ لیکن یاد رکھیے۔۔۔ آپ ہماری اس کارگزاری میں حصّہ دار ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ راز محفوظ نہ رہ سکا تو جو جرم ہم پر بہت مشکل سے ثابت ہو گا وہ آپ پر شاید آسانی سے ثابت ہو جائے۔ اگر آپ بغداد میں رہے تو شاید آپ اس جرم سے لاتعلقی ثابت کر سکتے لیکن میں آپ کو اسی لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ اب واپس پہنچ کر یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ ہمارے ساتھ اتنا راستہ چلنے کے بعد آپ کی حیثیت محض ایک تماشائی کی تھی۔ اگر آپ

تلوار نیام سے نہیں نکالنا چاہتے تو آپ کو یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ آپ کی زبان بھی محتاط رہے گی!"

لوکس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میں نے ایک دوست کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا لیکن آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

قاسم نے کہا۔ "مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کھیل کو ذرا دلچسپ بنایا جائے اور آپ کو یہ اعتراض بھی نہ ہو کہ ہم نے انہیں جاگنے کا موقع نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ وہ لڑے بغیر بھاگنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور ہمیں خواہ مخواہ اپنی تلواروں کو ان کے خون سے رنگنا نہ پڑے۔ اگر انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ بغداد میں داخل نہیں ہوں گے تو شاید انہیں خراش تک نہ آئے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کا خیمہ گرا دیا جائے۔ اب ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔"

قاسم کی اس تجویز پر اس کے بعض ساتھیوں نے اسے کھلے دل سے داد دی۔ وہ درخت کے سائے سے نکل کر زمین پر رینگتے ہوئے خیمے کے گرد

جمع ہو گئے۔ قاسم کا اشارہ پا کر انہوں نے بیک وقت خیمے کی تمام رسّیاں کاٹ ڈالیں اور اسے ایک طرف کھینچ کر چوبیں گرا دیں۔ ایک لمحے کے لیے ان سب نے اپنے دلوں میں زبردست دھڑکنیں محسوس کیں۔ ایک ثانیے کے لیے ان کے کان زمین پر بچھے ہوئے کپڑے کے نیچے سے طرح طرح کی آوازوں کے منتظر تھے اور پھر تھوڑی دیر کے لیے ان کی آنکھیں سونے والوں کی کروٹوں کی منتظر رہیں۔

قاسم اور اس کے ساتھیوں کی تشویش اضطراب میں تبدیل ہونے لگی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ کئی جگہ سے کپڑے کی اُبھری ہوئی سطح یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ خیمہ خالی نہیں۔

لوکس نے دبی زبان میں قاسم سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور ہماری تعداد سے سہم گئے ہوں۔ آپ انہیں آواز دے کر جان بخشی کا وعدہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بغداد چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

خیمے میں ایک طرف آگ سلگ رہی تھی۔ قاسم کے ایک ساتھی نے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ گدھے کی نیند سوتے ہیں تو بھی انہیں اب تھوڑی بہت حرارت محسوس کر لینا چاہیے تھی۔“

قاسم نے بلند آواز میں کہا۔ ”اب دھوکے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر بچنا چاہتے ہو تو بغداد جانے کی بجائے یہاں سے سیدھا کسی اور ملک کا رُخ کرو۔ تمہارے سر پر اٹھارہ تلواریں موجود ہیں، خیمے میں آگ لگ چکی ہے۔ جواب دو۔ بغداد چھوڑنے کا وعدہ کرتے ہو یا نہیں؟“

جب کوئی جواب نہ ملا تو قاسم نے آگے بڑھ کر تلوار کی نوک سے ایک اُبھری ہوئی جگہ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اس پر بھی جب سونے والے نے حرکت نہ کی تو اُس نے تلوار کو ذرا زور سے دبایا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ نیچے انسان کی بجائے کوئی سخت چیز ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے دوسرے ساتھی بھی خیمے پر چڑھ گئے۔ اور ایک نے دوسری جگہ اُبھری ہوئی سطح پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”نیچے پتھّر ہیں، انسان

نہیں۔ انہوں نے پتھّروں پر چادریں ڈال کر ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ چلو یہاں سے نکلیں۔"

قاسم نے غصّے کی حالت میں ایک اور اُبھری ہوئی جگہ پر تلوار مارتے ہوئے کہا۔ "وہ ہماری آمد سے باخبر ہو کر بھاگ گئے ہیں۔"

چند قدم کے فاصلے سے ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہم یہیں ہیں۔ آپ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔"

قاسم کے ساتھی کسی غیر متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیّار ہو گئے لیکن آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔

کسی نے پھر کہا۔ "تم سب اس وقت ہمارے تیروں کی زد میں ہو اور یقین کرو کہ ہم میں سے غلط نشانہ لگانے والا کوئی نہیں۔"

قاسم نے محسوس کیا کہ بولنے والا سامنے درخت پر چھپا ہوا ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں کو دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دائیں طرف ہٹنے کا مشورہ دیا۔

درخت سے آواز آئی۔ ”بھاگنے کی کوشش بے سود ہو گی۔ تمہارے پیچھے دریا ہے اور دائیں بائیں اور درختوں پر میرے ساتھی تیر و کمان لیے بیٹھے ہیں۔ اگر تم کو یقین نہیں آتا تو کسی طرف بھی چار قدم اٹھا کر دیکھ لو۔ تم ہمیں دیکھ سکتے نہ تمہارا کوئی ہتھیار ہم تک پہنچ سکتا ہے۔“

قاسم انتہائی بدحواسی کی حالت میں چلّایا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟ ہم صرف دل لگی کے لیے آئے تھے۔“

”ہم بھی صرف دل لگی کے لیے درختوں پر چڑھے ہیں۔“ ”میری بات پر یقین کرو۔ میں تمہیں صرف ڈرانا چاہتا تھا۔“

”تم بھی میری بات کا یقین کرو۔ میں بھی صرف تمہیں ڈرانا چاہتا ہوں۔“

قاسم نے کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم درخت سے نیچے اُتر کر میرے ساتھ بات کرو!“

درخت سے آواز آئی۔ ”نیچے اترنے کی دعوت کا شکریہ۔ میں بھی یہاں بہت تنگ بیٹھا ہوں، لیکن پیشتر اس کے کہ میں نیچے اُتروں تمہیں ایک

تکلیف ضرور اُٹھانی پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"تم اپنے ساتھیوں کو تلواریں پھینکنے کا حکم دو۔"

قاسم نے کہا۔ "کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ تم بات کرتے وقت اپنے اور میرے منصب کا لحاظ کرو!"

درخت سے آواز آئی۔ "گستاخی معاف! تمہارے چہرے پر نقاب ہے اور میں آواز میں تمہیں نہیں پہچان سکا۔"

قاسم نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ہماری آمد کے علم کے بغیر ہی اس قدر محتاط تھے۔"

قدرے توقّف کے بعد آواز آئی۔ "ہم دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے چاندنی رات کا لطف اٹھا رہے تھے۔ شاید تمہاری بد قسمتی تھی کہ ہم نے تمہاری کشتیاں دیکھ کر خطرہ محسوس کرنے میں غلطی نہیں کی۔"

خیمے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ قاسم نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ دیکھتے نہیں خیمہ جل رہا ہے؟ اب اسے گھسیٹ کر پانی کے قریب لے جاؤ۔“

درخت سے گرجتی ہوئی آواز آئی ”ٹھہرو! اگر تم میں سے کسی نے اِدھر اُدھر ہلنے کی کوشش کی تو تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔ ہمیں خیمے کی پرواہ نہیں۔ اگر تم نے ہمیں یہ بوجھ اُٹھا کر واپس لے جانے کی تکلیف سے بچایا ہے تو ہم نے بھی تمہاری ایک مشکل حل کر دی ہے۔ تمہیں کشتیاں واپس لے جانے کی تکلیف نہیں اُٹھانا پڑے گی۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ ہمارے خیمے کی راکھ کسی کے کام نہیں آئے گی۔ لیکن تمہاری کشتیوں سے کوئی مچھیرا فائدہ اٹھا سکے گا۔ اب تم کوئی اور قصّہ شروع کرنے سے پہلے تلواریں پھینک دو!“

قاسم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر تلوار پھینک دی لیکن درخت سے پھر آواز آئی۔ ”ہم سے اتنی دور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر شخص باری باری آگے آئے اور اس درخت کے نیچے اپنی تلوار پھینک

کر واپس اسی جگہ جا کھڑا ہو۔"

قاسم نے کہا۔ "ہم ایسی ہار ماننے کی بجائے لڑنے کو ترجیح دیں گے۔ اگر تم میں جرأت ہے تو نیچے اُتر کر مقابلہ کرو!"

درخت سے آواز آئی۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہمیں آپ نے اس قابل سمجھا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس کُند تلواریں نہیں۔ آپ نے ہماری تلواروں کی تیزی اور اپنی جان کی قیمت کا بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر آپ مقابلے کی دعوت دیتے ہیں تو ہم تیار ہیں۔ آپ میں جس شخص کو اپنے متعلق زیادہ غلط فہمی ہے وہ ذرا آگے آ جائے۔ ہم میں سے بھی ایک نیچے اُتر آئے گا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے آپ میں سے ہر ایک کو زور آزمائی کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس میں اپنا فائدہ نہیں دیکھتے تو میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہتھیار ڈال دینے کے بعد تمہیں جانے کی اجازت ہو گی۔"

قاسم نے پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر ایک طرف

اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور درخت کے نیچے تلوار پھینک کر واپس چلتے ہوئے خیمے کے قریب جا کھڑے ہوا تو ایک شخص نیچے اُترا۔ یہ عبدالعزیز تھا۔ وہ تلوار نیام سے نکال کر آگے بڑھا اور قاسم اور اس کے ساتھیوں کے قریب جا کھڑا ہوا اور ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ”میں عام طور پر آواز پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔ میرے خیال میں مجھے وزیراعظم کے صاحبزادے سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے؟“

قاسم نے اپنے سے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک دیا۔

عبدالعزیز نے آواز دی۔ ”طاہر! عبدالمالک! اب اُتر آؤ یہ قاسم ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ ہم پر کسی دشمن نے چڑھائی کر دی ہے۔“

عبدالعزیز کے ساتھی یکے بعد دیگرے ننگی تلواریں لیے اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

قاسم نے کہا۔ ”تم بہت ہوشیار ہو۔ ہم تو صرف دِل لگی کے لیے آئے تھے۔“

عبدالعزیز نے کہا۔ ”بہت نوازش کی آپ نے! ہم آپ کی باتیں سُن چکے ہیں۔“

قاسم نے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم سے تلواریں رکھوا کر آپ ہمارا راستہ نہیں روکیں گے؟“

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ لیکن میں نے آپ کے ساتھیوں کو نہیں دیکھا۔ آپ انہیں نقاب اُتارنے کا مشورہ دیجیے۔“

قاسم کے اشارے پر انہوں نے کچھ دیر پس و پیش کے بعد نقاب اتار دیے۔ عبدالمالک نے ذرا آگے بڑھ کر ان میں سے چار فوجی افسروں کو پہچانتے ہوئے کہا۔

”عزیز! قاسم کا اثر فوج تک بھی پہنچ چکا ہے۔ انہیں پہچانتے ہو؟ میرے خیال میں ان چار کو اپنے پاس مہمان رکھنا ضروری ہے۔“

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ”میں ان سب کی جان بخشی کا وعدہ کر چکا ہو۔

قاسم تم جاسکتے ہو لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تم نے اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو تمہارے لیے بہت برا ہو گا۔ اگر طاہر کے جسم پر ایک خراش بھی آئی تو میں وزیر اعظم کے محل کے نیچے ۵۰ ہزار سپاہی لے کر پہنچ جاؤں گا اور ہمارے پاس تلواریں اس بات کا ثبوت دے سکیں گی کہ ہمارا دشمن کون تھا؟ اگر وزیر اعظم کے لیے ہمارے دل میں عزّت نہ ہوتی تو آج ہمارا طرزِ عمل اس سے مختلف ہوتا۔ اگر دجلہ کا پانی ہماری لاشوں کو چھپا سکتا ہے تو تمہاری لاشیں بھی اس کے سپرد کی جاسکتی تھیں۔ بہرحال اب تم جاؤ اور آئندہ جب بھی تمہارے دل میں انتقام کی آگ دوبارہ سلگنے لگے تو یہ یاد رکھو کہ کل تک بغداد میں مجھے پندرہ بیس اور ایسے نوجوان مل جائیں گے جو ہمارے بعد بڑی سے بڑی طاقت سے ہمارا انتقام لینے کا حلف اٹھائیں گے۔"

یہ ہے کہ عبدالعزیز اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "زید! نصیر! تم وہ تلواریں اُٹھالو!"

زید اور نصیر نے درختوں کے نیچے جاکر تلواریں اٹھائیں۔ عبدالعزیز نے

اپنے باقی ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ ایک طرف چل دیے۔ قاسم اور اس کے ساتھی انتہائی ندامت اور پریشانی کی حالت میں انہیں درختوں کی آڑ میں روپوش ہوتے دیکھ رہے تھے۔

جنگل میں قریباً آدھ میل چلنے کے بعد عبدالعزیز اور اس کے ساتھی اس جگہ پر پہنچے جہاں درختوں کے ساتھ ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بحث کے بعد سب اس فیصلے پر متّفق ہو گئے کہ انہیں فوراً بغداد پہنچنا چاہیے۔ اور وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

(۵)

قاسم کو کافی دن چڑھے ایک لونڈی نے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے جگایا۔ قاسم نے انگڑائی لے کر آنکھیں کھولیں اور لونڈی کو ڈانٹنے کے بعد پھر بند کر لیں۔

لونڈی نے کہا۔ ”اٹھیے! اب دوپہر ہونے والی ہے۔ آقا آپ کو بلاتے ہیں۔ انہوں نے آپ کو فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔“

قاسم بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا وزیر اعظم کے کمرے میں داخل ہوا۔ وزیر اعظم ایک دریچے کے سامنے کھڑا باہر کی طرف جھانک رہا تھا۔ اس نے مُڑ کر قاسم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”قاسم! رات تم کہاں تھے؟“

ایک لمحے کے لیے قاسم اس غیر متوقع سوال کا جواب نہ دے سکا۔ اس نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”رات کو ایک دوست کے ہاں دعوت تھی۔ مجھے وہاں باتوں میں دیر ہو گئی۔“

وزیر اعظم نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ قاسم نے اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھُکا لیں۔ وزیر اعظم نے قاسم کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تم ابھی تک جھوٹ بولنے کے فن میں اتنے ہوشیار نہیں ہوئے کہ مجھے دھوکہ دے سکو۔ یہ پڑھ لو!“ قاسم نے خط پڑھنے کے بعد اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں یہ پوچھ رہی تھیں کہ اب آپ کا حکم کیا ہے؟

وزیر اعظم نے کمرے کے ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر پڑی ہوئی تلوار

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”طاہر نے اس خط کے ساتھ تمہاری تلوار میرے پاس بھیج دی ہے۔ یہ اس کی شرافت ہے ورنہ اس کے لیے ولی عہد یا خلیفہ تک پہنچنا مشکل نہیں۔ قاسم تم نے بہت بُرا کیا۔ تمہیں اس قدر ہوشیار آدمی پر اس قدر اوچھا وار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

قاسم نے جواب دیا۔ ”ابّا جان! یہ صرف ایک مذاق تھا، طاہر اس قدر ہوشیار نہ تھا۔ مجھے صرف عبدالعزیز کی وجہ سے خفّت اُٹھانا پڑی۔“

وزیر اعظم نے سوال کیا۔ ”وہ کون ہے؟“

”وہ فوج کا معمولی عہدے دار ہے۔“

لیکن باقی سترہ تلواریں سپہ سالار کو پیش کرنے کے بعد وہ کافی اہمیت حاصل کر لے گا۔ فوج میں پہلے بھی تمہارے متعلق کسی کی اچھی رائے نہیں۔ اور اب تم نے اپنی راہ میں نئے کانٹے بو دیے ہیں۔ قاسم! تم نے بہت برا کیا۔ میں طاہر کو تمہارے لیے ایک زینہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنا نائب بنا کر تم چنگیز خان کے دربار میں سفیر بن کر جاسکتے تھے۔ لیکن اب

۔۔۔۔۔۔!“

”لیکن اب؟“ قاسم نے قدرے فکر مند ہو کر سوال کیا۔

”اب میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ اس کو کہیں باہر بھیج کر تمہارے لیے بغداد میں راستہ صاف کروں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ولی عہد نے سپہ سالار سے سفارش کی ہے کہ اسے فوج میں کوئی ذمہ دار عہدہ دیا جائے۔ قاضی فخر الدّین نے خلیفہ کے نام خط لکھ کر اس نوجوان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بغداد میں ترقی کے ہر میدان کی راہ میں وہ اور اس کے دوست کسی دن تمہارا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے۔“

قاسم نے کہا۔ ”تو پھر آپ اسے کسی مہم پر کیوں نہیں بھیج دیتے؟“

”میں یہ کر سکتا ہوں لیکن اس سے قبل میرے متعلق تمہاری اس حرکت سے جو شکوک اس کے دل میں پیدا ہو چکے ہیں میں انہیں دور کرنا چاہتا ہوں، ورنہ وہ ہمیشہ مجھے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا رہے گا۔ ابھی تک

اسے میرے متعلق حسنِ ظن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے تمہاری شکایت کسی اور کی بجائے مجھ سے کی ہے۔"

قاسم نے کہا۔ "آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس سے معذرت کروں؟"

"نہیں۔ اس طرح وہ تم سے اور بد ظن ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ میں اسے اپنے پاس بلاؤں اور اس کے سامنے تم سے باز پُرس کروں لیکن اس سے پہلے میں تمہاری طرف سے اس بات کا اِطمینان چاہتا ہوں کہ تم کوئی اور حماقت نہیں کرو گے۔ فوج سے جو نوجوان تمہارے ساتھ گئے تھے، ان کے متعلق میں سپہ سالار کو لکھ رہا ہوں کہ انہیں فوراً معزول کر دیا جائے۔"

"لیکن ابّا جان وہ میرے دوست ہیں۔ وہ میری مدد کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ان کا کیا قصور؟"

"سر دست میرے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ ان کا قصور تھا یا نہیں۔ طاہر کے دوستوں پر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ مجھے اس کے ساتھ کوئی عداوت

نہیں۔ طاہر ولی عہد، شہزادہ مستنصر اور سپہ سالار تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ خلیفہ نے اگر اسے سلطنتِ مصر کا جاسوس نہ سمجھ لیا تو عین ممکن ہے کہ وہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر اسے کسی عہدے پر فائز کر دیں۔ اس صورت میں اپنے مخالفین کے خلاف اس کا سب سے بڑا حربہ اس کی دولت ہو گی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ایسے شخص کو اپنا دشمن بنالو جس کے بازوؤں کو قدرت نے پہاڑوں کا کلیجہ چیرنے اور آسمان کے تارے نوچنے کی قوّت عطا کی ہے۔ وہ ایک قابلِ قدر اور مخلص نوجوان ہے۔ ایسے شخص کی دوستی فائدہ مند اور دشمنی خطرناک ہوتی ہے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے اور میں اس کے خلاف تمہاری کوئی سفارش برداشت نہیں کروں گا۔ ممکن ہے میرے بعد یہی نوجوان کسی دِن بغداد کا وزیر اعظم بن جائے اور تمہیں اپنی حماقتوں پر پچھتانا پڑے۔ اور بھی ممکن ہے کہ وہ کسی اور امیر کا طرف دار بن جائے اور ہمیں اپنی حماقتوں پر پچھتانا پڑے۔ اور بھی ممکن ہے کہ کسی اور امیر کا طرف دار بن کر میرے عہدِ وزارت کے اختتام کا باعث ہو۔

طاہر بن یوسف

چنگیز خان قراقرم کو اپنا مرکز بنا چکا تھا۔ اس کی مملکت وسیع تھی اور اس کی افواج بے شمار تھیں لیکن عالمِ اسلام پر حملہ کرتے ہوئے اسے اپنی راہ میں ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ چٹان جس کی عظمت اہلِ تاتار کے سیلاب کی لہروں کے لیے حوصلہ شکن تھی۔ علاؤ الدّین محمد خوارزم شاہ کی عظیم الشّان سلطنت تھی جس کی سرحدیں ایک طرف ہندوستان اور بغداد اور دوسری طرف بحیرہ ارال اور خلیج فارس سے ملتی تھیں۔

جب سلطنت بغداد امن کے گہوارے میں سو رہی تھی، مشرق اور مغرب کے حملہ آوروں کے لیے خوارزم اور مصر کی سلطنتیں اسلام کا

بازوئے شمشیر زن تھیں۔

چنگیز خان کو سلطنت خوارزم کی طاقت کا صحیح علم نہ تھا، اس لیے اُس نے حملہ کرنے سے پہلے خوارزم شاہ کے ساتھ دوستانہ تعلق پیدا کر کے خوارزم کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ان دو سلطنتوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوا جس کی بدولت ان کے درمیان تجارتی راستہ کھل گیا۔

خوارزم شاہ کے ساتھ اہلِ تاتار کے تجارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد چنگیز خان کے جاسوسوں کے لیے بہت ہی آسانیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ خوارزم کی سرحد کے ایک گورنر نے بخارا کے چند تاجروں کا مال چھین لیا اور انہیں اس الزام میں قتل کر ڈالا کہ وہ چنگیز خان کے جاسوسوں کو خوارزم کے حالات سے باخبر کر رہے ہیں۔ چنگیز خان نے خوارزم شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر گورنر کی اس حرکت پر احتجاج کیا لیکن بخارا کے تاجر خوارزم شاہ کی رعیّت تھے اور ان کے ساتھ چنگیز خاں کی ہمدردی سے خوارزم شاہ کے یہ شکوک اور زیادہ بڑھ گئے کہ

چنگیز خاں خوارزم میں جو کام تاتاریوں سے نہیں لے سکتا، اس کے لیے اس نے بخارا کے تاجروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ چنانچہ اس نے بر افروختہ ہو کر چنگیز خان کے ایلچی کو قتل کا حکم دے دیا۔

بعض امرا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ بھی ہو، ایلچی کا قتل جائز نہیں۔ لیکن سلطان علاؤ الدّین محمد شاہ ایک خود سر حکمران تھا، اس نے کسی کا کہا نہ مانا۔ ایلچی کو قتل کر کے اس کے باقی ساتھیوں کی داڑھیاں جلانے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا۔ چنگیز خان کے لیے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ وہی واقعہ سن کر اُٹھا اور ایک پہاڑی پر چڑھ کر دیر تک سورج کے سامنے سر بسجود رہا اور پھر بُلند آواز میں پکارا۔ فلک لازوال پر دو سورج نہیں اور اس زمین پر دو خاقان نہیں ہوں گے!

چنگیز خان اور خوارزم شاہ میں جنگ ناگزیر ہو چکی تھی لیکن چنگیز خان کو خوارزم کی افواج سے زیادہ اس بات کا خدشہ تھا کہ سورج پرستوں کے خلاف اگر خدا پرست متحد ہو گئے تو اسے صحرائے گوبی کے ویرانوں میں بھی پناہ نہ ملے گی۔

(۲)

ان واقعات سے قبل خوارزم شاہ اور خلیفہ ناصر میں ناچاقی ہو چکی تھی۔ خوارزم شاہ نے خلیفہ سے مطالبہ کیا تھا کہ سلطنت بغداد کی مساجد میں خلیفہ کے ساتھ اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جائے۔ لیکن جب یہ مطالبہ نہ مانا گیا تو اس نے اپنی سلطنت سے خلیفہ کے نام کا خطبہ منسوخ کر کے بغداد پر چڑھائی کر دی۔ راستے میں غیر متوقع برف باری کو بُرا شگون سمجھ کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اگر چہ دونوں سلطنتوں کے اختلافات رفع ہو چکے تھے لیکن خلیفہ بغداد کی سرحد پر ایک طاقتور سلطان کا وجود اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔

چنگیز خان کو ان اختلافات کا علم تھا لیکن اسے یہ یقین نہ تھا کہ خوارزم پر حملے کی صورت میں بغداد کی رائے عامہ خلیفہ کو غیر جانبدار رہنے دے گی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر خلیفہ نے اپنے اختلافات بھلا کر خوارزم کی حمایت میں اعلانِ جہاد کر دیا تو افریقہ سے لے کر ہندوستان تک تمام اسلامی ممالک کی افواج اسے کُچلنے کے لیے موجود ہوں گی۔ ان تمام

خدشات کے پیشِ نظر چنگیز خان قراقرم میں وسیع پیمانے پر جنگی تیّاریاں کر رہا تھا۔

خوارزم شاہ کے ساتھ ان بن ہو جانے سے پہلے چنگیز خان کو یہ احساس تھا کہ وہ سلطنتِ خوارزم کو تہہ و بالا کیے بغیر تسخیرِ عالم کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا۔ اگر خوارزم شاہ اُسے شکایت کا موقع نہ بھی دیتا تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم کی تباہی چند برسوں کے لیے ٹل جاتی۔ طاقتور ہمسائے کو نظر انداز کرنا یا کمزور ہمسائے پر رحم کرنا چنگیز خان کے مسلک کے خلاف تھا۔

وزیر اعظم کے ساتھ طاہر کی پہلی ملاقات سے چند ہفتے پیشتر خلیفہ ناصر کو خوارزم شاہ کے ہاتھوں چنگیز خان کے ایلچی کے قتل ہونے کی خبر مل چکی تھی اور چند دن سے یہ خبر بغداد میں مشہور تھی۔ شکار سے واپس آکر طاہر نے خوارزم کے سفارت خانے کا رُخ کیا۔

خوارزم کا سفیر عماد الملک جس قدر طاہر کی تیغ زنی سے متاثر ہوا تھا، اس

سے کہیں زیادہ اس کی باتوں سے متاثر ہوا۔ طاہر کے بلند ارادوں سے واقف ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "کاش! بغداد میں آپ جیسے نوجوان اور ہوتے!"

طاہر نے جواب دیا۔ "بغداد میں میرے جیسے کئی نوجوان ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ جس طرح خلیفہ سے بد ظن ہے، اسی طرح بغداد کے عوام سے بھی بد ظن ہیں اور خلیفہ کے متعلق بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ خوارزم پر مصیبت آئی تو اس کے لیے غیر جانبدار رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ کم از کم وزیر اعظم کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ قاسم کا باپ ہونے کے باوجود اپنے پہلو میں ایک مسلمان کا دل رکھتا ہے۔ اور وہ خلیفہ کو غلط مشورہ نہیں دے گا۔"

عماد الملک نے کہا۔ "آپ جیسے خوش فہم انسان کو پانچ سو برس قبل پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اب دنیا بہت بدل چکی ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کے متعلق مجھے غلط فہمی ہو لیکن وزیر

اعظم کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ خوارزم کے لیے اس کی نیّت بری نہیں۔"

عماد الملک نے اپنے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں وزیر اعظم کے متعلق آپ کی غلط فہمی دور کر دوں تو؟"

"آپ مجھے اپنی اصلاح کے لیے ہر وقت آمادہ پائیں گے اور پھر میری جگہ بغداد کی بجائے خوارزم میں ہو گی۔"

"آپ وعدہ کرتے ہیں کہ یہ راز آپ تک محدود رہے گا؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

عماد الملک نے اٹھ کر ایک چھوٹا سا صندوق کھولا اور ایک باریک چمڑے کا ٹکڑا نکال کر طاہر کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"خلیفۃ المسلمین خوارزم شاہ کے ہاتھوں خاقانِ تاتار کے ایلچی کے وحشیانہ قتل کو ایک ناقابلِ معافی جرم قرار دیتے ہیں۔ اور یہ یقین دلاتے ہیں کہ

اگر خاقانِ تاتار اس ظالم بادشاہ کو سزا دینے کا ارادہ کر لے تو عالمِ اسلام سے کوئی آواز اس کی حمایت میں نہیں اُٹھے گی اور عالمِ اسلام کے روحانی پیشوا کی دعائیں اُن کے ساتھ ہوں گی۔

مخلص وحید الدّین۔ وزیرِ خارجہ"

اس عبارت کے نیچے چینی زبان کے چند حروف درج تھے۔ طاہر نے ان حروف پر انگلی رکھ کر عماد الملک سے پوچھا۔ "یہ کیا لکھا ہے؟"

عماد الملک نے جواب دیا۔ "یہ چنگیز خان کے سفیر کی تصدیق ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ کے خادم خاص نے خلیفہ کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے۔"

طاہر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ "آپ کے خیال میں یہ خادمِ خاص کون ہے؟"

عماد الملک نے جواب دیا۔ "وحید الدّین اور کون؟"

طاہر نے کہا۔ "نہیں کوئی اور ہے۔ خلیفہ کا کوئی ایسا معتمد جو بغداد میں

چنگیز خان کی جاسوسی کر رہا ہے۔“

عماد المُلک نے کہا۔ ”اگر وحید الدّین نہیں تو پھر وزیر اعظم ہو گا!“

”نہیں میرے خیال میں وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے علاوہ کوئی اور ہے۔“

”آپ یہ تحریر پہچانتے ہیں؟“

”نہیں، میں نام پڑھ سکتا ہوں۔“

”لیکن سوال یہ ہے کہ وزیر خارجہ نے تاتاری سفیر سے اپنے خط کی تصدیق کروانے کی بجائے اسے اس قسم کا پیغام بھجوانے کے لیے کیوں نہ کہہ دیا؟“

عماد المُلک نے جواب دیا۔ ”اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جب سے جاسوسی کے الزام میں تاجر قتل کیے گئے ہیں۔ ہماری حکومت نے چنگیز خان کے ساتھ بغداد کے تاتاری سفیر کے نامہ وپیام کا راستہ بند

کر دیا ہے۔ اس نے چند بار خود قراقرم جانے کے لیے ہماری حدود سے گزرنے کی اجازت مانگی ہے لیکن ہماری حکومت نے انکار کر دیا ہے۔ اور اب چنگیز خان کے ایلچی کے قتل کے بعد اس کے لیے وہاں پیغام بھیجنے یا خود جانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ ہماری سلطنت میں سے گزرنے کے علاوہ اس کے لیے صرف دو رستے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ مغرب کے ممالک سے گزرتا ہوا روس کا رُخ کرے اور پھر روس کے ان ناقابلِ عبور علاقوں سے گزرے جن کے باشندے حال ہی میں تاتاریوں کی سفاکی دیکھ چکے ہیں۔ وہ کسی تاتاری یا اُن کے کسی ایلچی کو اس کا حسب و نسب پوچھے بغیر قتل کر دیں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ سمندر کے راستے ہندوستان جائے اور وہاں سے قراقرم کا رُخ کرے۔ اس صورت میں اس کے سامنے وہ بلند پہاڑ حائل ہوں گے جہاں سے پرندہ بھی نہیں گزر سکتا۔"

طاہر نے پوچھا۔ "یہ تحریر آپ کے ہاتھ کیسے آئی؟"

عماد الملک نے جواب دیا۔ "خلیفہ ناصر کی فراست نے ہمیں چوکنّا رہنا سکھا دیا ہے۔ انہوں نے اس مہم کے لیے ایک خوارزمی ترک کی خدمات

حاصل کی تھیں اور چمڑا اس کے جوتے کے تلے کے اندر سی دیا گیا تھا لیکن ہماری سرحد کے افسر جاسوسوں کو پہچاننے میں بہتر ماہر ہیں۔ سرحد کے گورنر نے ایلچی کو قتل کر دیا ہے۔ اور اس خط کی نقل سلطان کو اور اصل میرے پاس بھیج دیا ہے۔"

"خلیفہ کو ان واقعات کا علم ہو چکا ہے؟"

"میں وزیرِ اعظم سے مل چکا ہوں۔ اسے میں نے نہیں بتایا کہ اصل خط میرے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں نے اسے صرف ایک نقل پیش کر دی تھی۔"

"تو وزیر اعظم نے آپ کو کیا جواب دیا؟" انہوں نے بے شمار قسمیں کھائیں۔ وزیر خارجہ کو گالیاں دیں اور مجھے اپنے محل میں بٹھا کر سیدھے خلیفہ کے پاس پہنچے اور واپس آ کر مجھے بتایا کہ خلیفہ نے وزیر خارجہ کو بلایا ہے۔ خلیفہ کا ارادہ ہے کہ اسے محل میں بُلا کر گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد اس شام مجھے وزیر اعظم نے دوبارہ اپنے محل میں بلایا اور کہا کہ وزیرِ

خارجہ روپوش ہے اور اس کی تلاش جاری ہے۔"

"ابھی تک وہ ملا ہے یا نہیں؟"

"نہیں"

"اور اس کے باوجود آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خلیفہ اور وزیر اعظم اس سازش میں شریک ہیں؟ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ وزیرِ خارجہ ایک طرف عالمِ اسلام اور دوسری طرف خلیفہ اور وزیر اعظم سے غدّاری کر رہا تھا اور اس کے روپوش ہو جانے کی وجہ بھی یہی ہو سکتی ہے۔"

عماد المُلک نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو اور دوپہر کے وقت خلیفہ کے ایلچی کے اس مطالبے نے کہ آپ فوراً میرے ساتھ چلیں، اسے شک میں ڈال دیا ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خلیفہ کے پاس گیا ہو، خلیفہ اور وزیر اعظم نے اپنی بدنامی کے ڈر سے اسے روپوش کر دیا ہو۔ ممکن ہے اس نے اس شربت کا ایک آدھ گھونٹ پی لیا ہو جسے چکھ لینے کے بعد کوئی شخص خلیفہ کے محل کی بھول بھلیّوں سے زندہ واپس

نہیں نکلتا۔“

”اگر آپ کا خیال درست ہو کہ اس نے یہ سب کچھ خلیفہ یا وزیر اعظم کے حکم سے کیا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے زہر دے کر مروا دیا گیا ہو؟“

”ایسی اہم مہم کی ناکامی کے بعد خلیفہ سے کسی نیک سلوک کا مستحق نہیں سمجھ سکتا۔“ ”اگر مروانے کی بجائے کہیں چھپا دیا گیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ خلیفہ اور وزیر اعظم اس معاملے کی کھلی تحقیقات سے گھبراتے تھے۔ میری تسلّی کے لیے انہیں یقیناً سزا دینی پڑی اور اپنی گردن پر جلّاد کی تلوار دیکھ کر اسے خلیفہ یا وزیر اعظم کا راز چھپانے میں کوئی مصلحت نظر نہ آتی۔ وہ سب کچھ بتا دیتا۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھتے ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ سازش صرف وزیر خارجہ کی تھی اور سزا کے خوف سے چھپ گیا ہے؟“

”میں اس بات کے امکان سے انکار نہیں کرتا لیکن حالات نے ہمیں ہر

بات کے تاریک پہلو کو دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "آپ کو مجھ پر اعتماد ہے؟"

عماد الملک نے جواب دیا۔ "آپ پر اعتماد کرنے کے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ آپ ایک بہادر نوجوان ہیں۔ ایک مجاہد کے بیٹے ہیں۔ جس شخص کے ایمان کی شہادت صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار دے رہی ہو، میں اس کے خلوص پر شک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو یقین ہے کہ چنگیز خان خوارزم پر حملہ کر دے گا؟"

"اگر وزیر خارجہ کا یہ پیغام اس کے پاس پہنچ چکا ہوتا تو وہ شاید اب تک عمل بھی کر چکا ہوتا۔"

"اور اگر وزیر اعظم کی طرف سے اسے یہ پیغام مل جائے کہ حملے کی صورت میں بغداد کا ہر مسلمان خوارزم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے گا تو؟"

"تو مجھے یقین ہے کہ چنگیز خان کو عالمِ اسلام کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں ہو گی۔" "اگر میں وزیر اعظم سے ایسا پیغام حاصل کر لوں تو کیا آپ خوارزم کی حد عبور کرنے میں میری مدد کریں گے؟"

"میں وزیر اعظم کے ہر اقدام کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھوں گا۔ لیکن اگر آپ ایسا پیغام حاصل کر سکیں تو مجھے یہ اطمینان ہو گا کہ قراقرم پہنچ کر ایسے پیغام کا مفہوم بدل نہیں جائے گا۔ لیکن آپ اس بات کی توقع کیوں رکھتے ہیں کہ وزیر اعظم ایسا پیغام بھی بھیجیں گے اور آپ کو ایلچی بھی بنائیں گے؟"

اس سوال نے طاہر کو ایک لمحے کے لیے بدحواس کر دیا۔ "اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا کہ اگر اس نے یہ بتا دیا کہ وزیر اعظم اسے چنگیز خان کے پاس بھیجنے کا ارادہ ظاہر کر چکا ہے تو عماد الملک کے شکوک بڑھ جائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔ میں وزیر اعظم سے یہ مطالبہ کروں گا۔ اگر اس نے انکار کیا تو میں بغداد کی جامع مسجد میں یہ اعلان کروں گا کہ خلیفہ اور وزیر اعظم عالمِ اسلام کو چنگیز خان کے پاس فروخت کر چکے ہیں اور آپ

دیکھیں گے کہ میری یہ آواز بغداد کے ہر بچّے اور بوڑھے کی آواز بن جائے گی۔ میں آپ سے خوارزم سے گزرنے کے اجازت نامے کا مطالبہ صرف اس وقت کروں گا جب آپ کو وزیر اعظم کی تحریر دکھالوں گا۔"

عماد الملک نے جواب دیا۔ "میں وزیر اعظم کی تحریر دیکھے بغیر بھی آپ کو اجازت نام لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔"

طاہر نے اُٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں ابھی نہیں۔ میں وزیرِ اعظم سے ملاقات کے بعد آپ کے پاس پھر آؤں گا۔"

طاہر، عماد الملک کے مکان سے باہر نکلا تو سڑک پر زید آتا دکھائی دیا۔ زید نے بگڑ کر کہا۔ "میں آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ وزیر اعظم کا ایلچی آپ کو بلانے آیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں آپ کو تلاش کر کے فوراً روانہ کر دوں۔ عجیب احمق آدمی تھا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ تم تو بالکل بدُو معلوم ہوتے ہو اور میں نے جب اسے کشتی لڑنے کی دعوت دی تو قہقہے لگاتا ہوا چل دیا۔"

طاہر نے کہا۔ ”ہر ایک کو کشتی لڑنے کی دعوت نہیں دیا کرتے۔“

(۳)

پانچ دن کے بعد ایک شام نمازِ مغرب کے بعد عبد العزیز اور عبد المالک طاہر کے مکان پر پہنچے۔ طاہر ایک کمرے میں بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ عبد العزیز نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ میرا خیال تھا کہ آپ سفر کا سامان درست کر رہے ہوں گے؟“

طاہر نے اُٹھ کر ان کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ ”سفر کی تیّاری تو میں کل سے کر رہا ہوں لیکن آج وزیر اعظم نے خلیفہ کا حکم سنا دیا کہ پرسوں ماہِ رمضان شروع ہونے والا ہے۔ مجھے روزوں کے ساتھ سفر میں تکلیف ہو گی۔ اس لیے عید سے اگلے دن مجھے یہاں سے روانہ ہونے کی اجازت مل جائے گی۔“

عبد العزیز نے کہا۔ ”تعجّب ہے کہ خلیفہ آپ کی تکلیف کا اس قدر احساس رکھتے ہیں۔ کیا آپ چنگیز خان کے نام ان کا مکتوب حاصل کر لیا ہے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”وہ خط وزیر اعظم کے پاس ہے۔ میں اس کا مضمون پڑھ چکا ہوں اور اس پر خلیفہ کہ مہر دیکھ چکا ہوں۔ وزیر نے عماد الملک کو بھی وہ خط دکھا دیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ رخصت کے دن مجھے وہ خط مل جائے گا۔“

عبد المالک نے کہا۔ ”لیکن آپ کے سفر کے التوا کے لیے ماہِ رمضان کا بہانہ مجھے تسلّی بخش نظر نہیں آتا۔ کیا آپ نے نہیں کہا کہ آپ روزہ رکھ کر بھی سفر کرسکتے ہیں؟“

طاہر نے کہا۔ ”میں نے تو بہت زور دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ جو شخص عرب کی تپتی ہوئی ہواؤں میں روزے رکھنے کا عادی ہو، اسے شمال مشرق کے پہاڑوں کی سرد ہوا میں سفر کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اس کے علاوہ اس سفر کی اہمیت ایسی ہے کہ مجھے معمولی تکالیف کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ لیکن وزیر اعظم نے کہا عید کے دن خلیفہ چوگان اور نیزہ بازی کا مُقابلہ دیکھیں گے اور اُن کی خواہش ہے کہ میں بھی اس میں ضرور حصّہ لوں؟“

عبد المالک نے کہا۔ ”یہ بہانہ اس سے بھی زیادہ نامعقول ہے۔ عزیز! تم بتاؤ جب چنگیز خان کی افواج خوارزم کی شمال مشرقی سرحد پر نقل و حرکت کر رہی ہیں اور خلیفہ اسے متنبہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو طاہر کو ایک ماہ اور یہاں روکنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔“

عبدالعزیز نے اپنی کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”خلیفہ اور وزیر اعظم کی مصلحتیں سمجھنا آسان نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رمضان کے آخر تک وہ اپنا ارادہ بدل دیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے خلیفہ کی قوّتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے اور اتنی بڑی چھلانگ لگانے سے پہلے ان کے لیے ایک ماہ یا ایک برس سوچنا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں مجھے ایک بات کا خدشہ ہے۔ طاہر تمہارے ساتھ اور کون جا رہا ہے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں نے تم دونوں کے متعلّق کہا تھا۔ لیکن وزیر اعظم نے میرے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ میں اپنے ساتھ تین چار نوکر لے جا سکتا ہوں۔“

عبد العزیز نے سوال کیا۔ ”ان نوکروں کا انتخاب آپ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا یا وزیر اعظم اپنی پسند کے آدمی بھیجیں گے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”یہ خدشہ خوارزم کے سفیر نے بھی ظاہر کیا تھا کہ میرا کوئی ساتھی وہاں جا کر خلیفہ کی طرف سے کوئی اور پیام نہ سُنا دے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ خلیفہ کا خط دیکھنے کے بعد چنگیز خان کسی معمولی آدمی کی بات پر اعتبار کر لے گا۔ اس کے علاوہ احتیاط کے طور پر عماد الملک راستے کی چوکیوں کو مطلع کر دے گا کہ میرے سوا کسی اور کو تلاشی لیے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ میں خود بھی ان کی دیکھ بھال کرتا جاؤں گا۔“

عبد المالک نے کہا۔ ”اگر ان میں سے کسی نے تاتاری سفیر کی کوئی نشانی وہاں جا کر پیش کر دی تو؟“

طاہر نے کہا۔ ”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں نے یہاں تک انتظام کر لیا ہے کہ مملکت تاتار میں داخل ہونے سے پہلے ان کا لباس اور جوتے تک تبدیل کر دیے جائیں۔“

عبدالعزیز نے کہا۔ لیکن پھر بھی آپ ہوشیار رہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خوارزم کی سرحد عبور کرنے کے بعد آپ کسی سرائے میں رات کے وقت سو رہے ہوں اور جب صبح کے وقت بیدار ہوں تو آپ کے ساتھی خلیفہ کے خط سمیت غائب ہو چکے ہوں۔ آپ انہیں تلاش کرتے رہیں اور وہ قراقرم پہنچ چکے ہوں۔"

طاہر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ انہیں کم از کم یہ احساس ضرور ہو گا کہ وہ میرے بغیر واپس نہیں آ سکیں گے۔"

"لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں قراقرم کی آب و ہوا بغداد سے زیادہ پسند آ جائے۔ اس لیے کم از کم زید کو ضرور ساتھ لیتے جائیں۔" طاہر نے جواب دیا۔ "زید کو میں گھر کی حفاظت کے لیے یہاں ٹھہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیے۔ یہاں سے خواہ میرے ساتھ کیسے ہی آدمی کیوں نہ جائیں۔ وہ ایک منزل طے کرنے کے بعد خلیفہ یا وزیر اعظم کی بجائے میرے زیرِ اثر ہوں گے۔ اگر انعام کی ہوس کسی آدمی کو غدّار بنا

سکتی ہے تو زیادہ انعام کی ہوس اسے راہِ راست پر بھی لا سکتی ہے۔“

عبد المالک نے کہا۔ ”میں موجودہ وزیرِ خارجہ مہلب بن داؤد کو ایک خطرناک آدمی سمجھتا ہوں۔ دو سال پہلے وہ بغداد میں بالکل اجنبی تھا لیکن چند ماہ پہلے یہ حالت ہے کہ دن میں ایک بار خلیفہ سے اس کی ملاقات ضرور ہوتی ہے۔ وحید الدّین کے روپوش ہونے سے پہلے وہ اس کا نائب تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وحید الدّین سے زیادہ خلیفہ کے ساتھ اس کی ملاقاتیں ہوتی تھیں اور بعض ملاقاتوں میں وہ چنگیز خان کے سفیر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ اس کا کوئی آدمی آپ کے ساتھ نہ جائے۔“

طاہر نے کہا۔ ”میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مہلب بن داؤد کہاں سے آیا ہے؟“

عبد المالک نے جواب دیا۔ ”یہ کسی کو معلوم نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے اور خلیفہ اور شہزادہ مستنصر کو بیش قیمت

تحائف پیش کر چکا ہے۔"

(۴)

صفیہ علی الصبح گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ کمرے کی دھندلی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے مغموم سی صورت بنا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آج پھر وہ ایک سہانا سپنا دیکھ چکی تھی۔ آج پھر اس نے دلکش فضاؤں میں پرواز کی تھی جہاں آزاد پرندے محبت کے گیت گاتے تھے۔ اس نے خاموش نگاہوں سے کسی کے سامنے التجائیں کی تھیں اور کسی نے ان التجاؤں کے جواب میں یہ کہا تھا۔ "صفیہ! نادان نہ بنو۔ ہماری زندگی کے راستے مختلف ہیں!"

صفیہ نے اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "میرے بدّو! تم بہت ضدّی ہو!"

وہ دوبارہ آنکھیں کھول کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز کے بعد اس نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی

اور حسب معمول آج بھی اُس کی دُعا کا آخری فقرہ یہ تھا۔ ”میرے اللہ! اسے ہر آفت سے بچانا!!!“

دُعا ختم کرنے کے بعد صفیہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دریچہ کھول کر بائیں باغ کی طرف جھانکنے لگی۔ پھر میٹھے اور ہلکے سروں میں ایک گیت گاتی ہوئی دوسری دیوار کے ساتھ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز جو موسم بہار کے پرندوں سے کہیں زیادہ شیریں تھی، آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد آئینے میں ایک اور صورت دیکھ کر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

اس نے جلدی سے پیچھے مُڑ کر قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”قاسم تم؟“

قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”صفیہ! تم خاموش ہو گئیں؟“

”تمہاری آواز۔۔۔۔!!“

صفیہ نے تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میری آواز بہت

اچھی ہے لیکن تمہیں چوروں کی طرح میرے کمرے میں آنے کا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ تشریف لے جاؤ ورنہ سکینہ کو آواز دیتی ہوں!“

قاسم نے کہا۔ ”صفیہ! میں نے کیا خطا کی ہے۔ تمہیں مجھ سے اس قدر نفرت کیوں ہے اور تمہارے یہ نغمے اگر میرے لیے نہ تھے کس کے لیے تھے؟“

”صفیہ! مجھے اس قدر نہ ستاؤ۔ تم جانتی ہو میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ میں۔۔۔!“

صفیہ نے غصّے سے لال پیلی ہوتے ہوئے کہا۔ ”قاسم جاؤ! ابھی تک تمہارے دماغ پر رات کی شراب کا اثر باقی ہے۔“

قاسم نے غصّہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”صفیہ! تمہیں معلوم ہے کہ میں شراب ترک کر چکا ہوں لیکن اگر میری کوئی عادت بُری بھی ہو تو زندگی کے طویل سفر میں ہم دونوں ایک کشتی پر سوار ہوں گے۔ اس لیے مجھے اس قدر ناقدانہ نظروں سے دیکھنے کی عادت ترک کر دو۔ ہم دونوں کے

لیے بہتر ہو گا۔"

صفیہ نے تنک کر جواب دیا۔ "قاسم جاؤ! میں تمہاری کشتی میں سوار ہونے کی بجائے دریا کے بھنور میں ڈوب مرنے کو ترجیح دوں گی۔"

قاسم نے خفیف سا ہو کر کہا۔ "اس قدر سرد مہری ٹھیک نہیں۔ مجھ میں ہزار خامیاں ہوں لیکن میں تمہارا ہوں۔ میں تمہاری ایک مسکراہٹ کے لیے موت سے کھیل سکتا ہوں۔ آگ میں کود سکتا ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے۔۔۔۔!"

صفیہ نے کہا۔ "ہاں ہاں رُک کیوں گئے؟ کہو میں تمہارے لیے آسمان کے تارے نوچ سکتا ہوں۔ سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر موتی نکال سکتا ہوں۔ بڑے بڑے جابر شہنشاہوں کے تاج اُتار سکتا ہوں۔ آندھیوں سے لڑ سکتا ہوں۔ طوفانوں سے کھیل سکتا ہوں لیکن ایک انسان نہیں بن سکتا۔ قاسم تمہیں یہ غلط فہمی کب سے ہوئی کہ تم ایک شاعر بھی ہو؟"

قاسم نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "صفیہ! میرے جذبات

کی توہین نہ کرو۔ میں شاعر نہیں۔"

"تمہارے جذبات! وہ اِس قابل بھی نہیں کہ ان کی توہین کی جائے۔ تم اگر یہاں ٹھہرنے پر مُصر ہو تو میں جاتی ہوں۔ لیکن میرا پیچھا کیا تو میں سیدھی چچا کے پاس جاؤں گی؟"

صفیہ یہ کہہ کر قاسم کی طرف غصّے اور نفرت سے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

محل کے باغ سے چند پھول توڑنے کے بعد صفیہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچی، شاخوں سے شبنم کے قطرے گِر رہے تھے لیکن صفیہ کو ان کا احساس تک نہ تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں طاہر کے ساتھ تنہائی میں اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور جب سے طاہر خلیفہ کا پیغام لے کر قراقرم کی طرف روانہ ہوا تھا، باغ کا یہ گوشہ اس کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ ان درختوں کے پتّے، پھول اور پھل اُسے دوسرے درختوں سے مختلف نظر آتے تھے۔

آج قاسم کی ملاقات کے بعد وہ اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر یہاں آئی تھی۔ سورج کی ابتدائی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ صفیہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی مغموم آواز میں کہا:

"طاہر! تمہیں شاید معلوم بھی نہ ہو کہ میں کون ہوں اور تم میرے لیے کیا بن چکے ہو۔

خلیفہ کا ایلچی

خوارزم کی حدود عبور کرنے کے بعد طاہر اور اس کے ساتھیوں کو مملکتِ تاتار کی سرحدی چوکی پر کچھ مدّت رُکنا پڑا۔ چوکی کے افسر نے انہیں ہر ممکن سہولت پہنچانے کی کوشش کی۔ تاہم طاہر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی ایک خیمے میں نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ انہیں آس پاس کی پہاڑیوں پر گھومنے کی اجازت نہ تھی۔ طاہر ٹوٹی پھوٹی تاتاری زبان میں کسی سپاہی سے کوئی سوال پوچھتا تو اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ چوکی کے افسر کے سوا کسی کو ان کے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تاتاری جاسوس ان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے تھے۔ طاہر نے چوکی کے افسر کو بارہا یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ چنگیز خان کے نام

خلیفۂ بغداد کی طرف سے ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہے لیکن اسے ہر بار یہی جواب ملتا۔ خانِ اعظم کے پاس پیغام بھیج دیا گیا ہے۔ ان کی ہدایات ملتے ہی آپ کو روانہ کر دیا جائے گا۔

تقریباً تین ہفتوں کے بعد ایک تاتاری افسر چند سپاہیوں کے ہمراہ اس چوکی پر پہنچا اور اس نے طاہر کی گزشتہ تکالیف پر اظہارِ معذرت کے بعد بتایا کہ خانِ اعظم نے آپ کو شرفِ باریابی بخشا ہے۔

چند ہفتے اس افسر کی رہنمائی میں دشوار گزار پہاڑی راستے طے کرنے کے بعد طاہر اور اس کے ساتھی ایک دن کوہِ قراقرم کی اس وادی میں داخل ہوئے جس میں حدِّ نگاہ تک چنگیز خان کی افواج کے خیمے دکھائی دیتے تھے اور اس وادی کے چاروں اطراف بلند پہاڑ تھے۔

بغداد سے وزیر اعظم نے طاہر کے ساتھ تین آدمی روانہ کیے تھے۔ دو ایرانی تھے جن میں سے ایک کا نام کمال اور دوسرے کا نام ابو اسحاق تھا۔ تیسرے کا نام جمیل تھا اور وہ عراقی تھا۔ یہ تینوں سفر کے دوران وزیر

اعظم کی ہدایات کے مطابق نہایت مستعدی سے طاہر کے احکام کی تعمیل کرتے رہے۔ راستے میں کئی بار ان کی تلاشی لی جا چکی تھی۔ اس لیے طاہر کو یہ اطمینان تھا اگر ان میں سے کوئی خلیفہ یا وزیرِ اعظم کی طرف سے کوئی خفیہ پیغام بھی لے کر آیا ہو تو بھی چنگیز خان کو اپنی صداقت کا یقین دِلانے کے لیے وہ کوئی نشانی پیش نہیں کر سکے گا۔

لیکن مملکتِ تاتار میں داخل ہوتے ہی طاہر کو اس بات کی پریشانی ہوئی کہ اس کے ساتھیوں میں سے ابو اسحاق تاتاری زبان میں کافی دسترس رکھتا تھا اور چنگیز خان کی جائے قیام تک اپنے اپنے تاتاری افسر سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ سفر کے دوران اس نے کئی مرتبہ تاتاری افسر اور ابو اسحاق کو باقی قافلے سے آگے نکل کر نہایت رازدارانہ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔

خیموں کے اس شہر میں داخل ہونے کے بعد یہاں چنگیز خان اور اس کی افواج تسخیرِ عالم کی تیّاریوں میں مصروف تھیں، تاتاری افسر ایک کشادہ خیمے کے سامنے رُکا اور گھوڑے سے اُتر کر طاہر سے مخاطب ہوا۔ آپ اس

خیمے میں آرام کریں۔ میں خانِ اعظم کو اطلاع دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے چند سپاہیوں کو جو خیمے سے باہر کھڑے ان کی راہ دیکھ رہے تھے، اشارہ کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر طاہر اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور وہ گھوڑے سے اُتر کر ایک اور افسر کی رہنمائی میں خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ یہ خیمہ مخمل کے پردوں اور ایرانی قالینوں سے سجا ہوا تھا۔

طاہر اور اس کے ساتھیوں نے عصر کی نماز ادا کی۔ دُعا کے بعد طاہر نے ابو اسحٰق سے سوال کیا۔ ”تم راستے میں اس تاتاری افسر کے ساتھ کیا باتیں کر رہے تھے؟“

ابو اسحاق نے ایک معنی خیز تبسّم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”کچھ نہیں، وہ مجھے چنگیز خان اور میں اسے اپنے خلیفہ کے متعلق بتا رہا تھا۔“

”تم تمام راستے مجھ سے یہ بات کیوں چھپاتے رہے کہ تم تاتاری زبان

جانتے ہو؟"

"اگر آپ مجھ سے پوچھتے تو میں آپ کو بتا دیتا۔"

"وزیر اعظم کو معلوم تھا کہ تم تاتاری زبان جانتے ہو؟"

اسحاق نے قدرے پریشان ہو کر جواب دیا۔ "وزیر اعظم مجھے جیسے معمولی آدمی کے متعلّق اس قدر واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں؟ آپ کو یہاں کسی کے ساتھ ہم کلام ہونے پر اعتراض ہو تو میں آئندہ نہیں بولوں گا۔"

"مجھے تمہارے ہم کلام ہونے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر تم سے کوئی بغداد کے متعلق سوال کرے تو سوچ سمجھ کر جواب دینا!"

ابو اسحاق نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے فرض کا احساس ہے۔"

تھوڑی دیر بعد تاتاری افسر اُن کے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے طاہر سے کہا۔

”خان اعظم صبح آپ سے ملاقات کریں گے۔ میں نے آپ کے خورد و نوش کا انتظام ایک ایرانی ملازم کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ آپ کا مسلمان بھائی ہے۔ اور آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔“

جس وقت طاہر تاتاری افسر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ابو اسحاق خیمے سے اُٹھ کر باہر نکل گیا اور جب یہ افسر رخصت ہوا تو طاہر اٹھا اور خیمے کے دروازے میں کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ ابو اسحاق چند قدم کے فاصلے پر تاتاری افسر سے باتیں کر رہا تھا۔

شام کے وقت طاہر کے تینوں ساتھی وادی میں چکر لگانے کے بہانے باہر نکل گئے اور اس وقت واپس آئے جب وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کا ارادہ کر رہا تھا۔

طاہر نے انہیں سخت سست کہا تو ابو اسحاق بولا۔ ”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو گی۔ یہ تاتاری لوگ بڑے وحشی ہیں۔ ہم سیر کے لیے نکلے تھے کہ ایک خیمے کے پاس ہمیں چند سپاہیوں نے گھیر لیا

اور زیر دستی ہم تینوں کے سر مونڈ کر ہماری کھوپڑیوں پر سیاہی مل دی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔" یہ کہتے ہوئے ابو اسحاق نے اپنا عمامہ اتار دیا اور کہا۔ "دیکھیے۔ انہوں نے ہماری کیا گت بتائی ہے۔"

ابو اسحاق اور اس کے ساتھیوں کے سر واقعی منڈے ہوئے تھے اور بالوں کی جگہ ان پر سیاہ روغن چمک رہا تھا۔

طاہر نے کہا۔ "عجب احمق ہیں یہ لوگ۔ میں چنگیز خان کے سامنے اس بد سلوکی پر احتجاج کروں گا!"

ابو اسحاق نے کہا۔ "یہاں سر مونڈنا نئی بات نہیں۔ ایک افسر کہہ رہا تھا کہ مہمان کا سر مونڈنا بھی یہاں مہمان نوازی میں داخل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اپنے خنجروں کی تیزی کی آزمائش کے لیے ہمارے سروں کے بال ہی منتخب کیے ورنہ ایک تاتاری کے ہاتھ کو اپنی شاہ رگ سے اس قدر قریب دیکھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔"

(۲)

اگلی صُبح چنگیز خان کے ایلچی کے ساتھ شاہی ایوان کی طرف چل دیا۔۔۔ شاہی ایوان اس وادی کے ایک سرے پر چند خوبصورت خیموں پر مشتمل تھا۔ پہاڑی کے اوپر جانے والی سڑک کے نچلے سرے پر دائیں اور بائیں انسانی کھوپڑیوں سے دو بلند مینار تعمیر کیے گئے تھے اور سڑک کے دونوں کناروں پر نیچے سے اوپر تک کھوپڑیوں کی قطاریں بنائی گئی تھیں۔ طاہر کے چہرے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے تاتاری افسر نے کہا۔

”یہ صرف بڑے بڑے سرداروں کی کھوپڑیاں ہیں۔ انہیں ان کی حیثیت کے مطابق جگہ دی گئی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی کھوپڑیاں یہاں نہیں لائی گئیں۔ اوپر خانِ اعظم کے خیمے کے سامنے آپ ان حکمرانوں اور فوجی رہنماؤں کی کھوپڑیوں کا انبار دیکھیں گے جنہوں نے ہماری عظمت کے سامنے سربسجود ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اونچے گھرانوں کی حسین بیگمات جنہوں نے خانِ اعظم اور شہزادوں کی خدمت سے انکار کر دیا تھا، ان کی کھوپڑیوں سے ایک چھوٹا سا مینار ملکہ تاتار کے خیمے کے سامنے تعمیر

کیا گیا ہے۔"

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھیے اس پہاڑی پر خانِ اعظم کا عالیشان محل تعمیر ہو رہا ہے۔ ان پہاڑوں میں اعلیٰ قسم کے پتھر نایاب ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بغداد، بخارا اور سمرقند کی عمارتوں میں بہترین قسم کے سرخ اور سفید پتھر لگائے گئے ہیں۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "لیکن وہ پتھّر خوب صورت ہونے علاوہ سخت بھی ہیں۔ آپ کے خانِ اعظم انسانی کھوپڑیوں کا محل تعمیر کیوں نہیں کرتے؟"

"اگر انسانی کھوپڑیاں اینٹوں کا کام دے سکتیں تو ہمارے لیے یہ کام مشکل نہ تھا۔ شمال مغرب اور شمال مشرق کے شہروں میں کھوپڑیوں کے کئی انبار بے کار پڑے ہوئے ہیں۔"

پہاڑی کی چوٹی پر ایک کشادہ اور ہموار میدان میں بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور اس میدان کے تین اطراف خیموں کی قطاریں تھیں۔ جا

بجا پہرے دار ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ ایلچی درمیان کے ایک خیمے کے سامنے رُکا اور طاہر کو باہر ٹھہرا کر اندر داخل ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر طاہر کو اندر لے گیا۔

دو کشادہ کمروں میں گزرنے کے بعد طاہر تیسرے اور نسبتاً چھوٹے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک طرف کوئی چار بالشت اُونچا چبوترا تھا جس پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ چبوترے کے بیچ ایک قطار میں چند تاج رکھے تھے۔

کمرے میں ایک عمر رسیدہ شخص جو اپنے جُبّہ و دستار سے ایک مسلمان عالم معلوم ہوتا تھا، کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر طاہر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا میں خاقانِ تاتار کی مملکت میں اپنے ایک مسلمان بھائی کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

طاہر نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی اور قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ”آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟“

خاقانِ تاتار جوہر شناس بھی ہیں اور فیاض بھی۔ میں یہاں تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ آیا تھا۔ خاقانِ اعظم کو ایک مترجم کی ضرورت تھی۔ انہوں نے مجھے چند ماہ کے لیے اپنے پاس ٹھہرالیا لیکن اس کے بعد ان کی قدر افزائی نے مُجھے ہمیشہ کے لیے خرید لیا ہے۔ خاقانِ اعظم تشریف لانے والے ہیں، میں آپ کو چند باتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ زیادہ خوشامد پسند نہیں کرتے لیکن بے تکلّفی اور گستاخی کو قطعاً قابلِ معافی نہیں سمجھتے۔ اگر آپ تاتاری زبان میں بات کریں گے تو وہ آپ سے بہت خوش ہوں گے، اگر آپ تاتاری زبان میں بات کرنا نہ جانتے ہوں تو انہیں چینی زبان بھی پسند ہے۔ ان دونوں زبانوں کے بعد خاقانِ معظم فارسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس زبان کے چند الفاظ سیکھ چکے ہیں لیکن عربی زبان سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”مشورے کا شکریہ۔ لیکن میں تاتاری اور چینی زبان سے ناواقف ہوں۔ فارسی جانتا ہوں لیکن مجھے خطرہ ہے کہ آپ کی ترجمانی کے باوجود اپنی فراست سے کام لے کر میرا مطلب سمجھنے میں

غلطی نہ کریں۔ اگر آپ کو عربی زبان کا ترجمہ کرنے میں دقّت ہوتی ہے تو اور بات ہے ورنہ میں اظہارِ مُدعا کے لیے عربی زبان کو زیادہ موزوں سمجھتا ہوں اور اگر وہ ترکی اچھی طرح سمجھتے ہیں تو میں وہ بھی جانتا ہوں۔"

کہیں یہ غضب نہ کر بیٹھنا۔ جب سے خوارزم شاہ نے خانِ موصوف کے ایلچی کو قتل کیا ہے۔ انہیں ترکی سے سخت نفرت ہو گئی ہے اور دورانِ گفتگو میں یہ خیال رکھیے کہ آپ کی آواز خاقانِ اعظم کی آواز سے زیادہ بلند نہ ہو۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ خاقانِ اعظم نے آپ کو تخلیے میں شرفِ ملاقات بخشا ہے۔ تخلیے میں ان کا دستِ مبارک دربار کی نسبت زیادہ فیاض ہوتا ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "میں آپ کے نیک مشوروں کا پھر ایک بار شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن آپ میرے متعلق غلطی فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں یہاں پیٹ کی خاطر نہیں آیا۔"

(۳)

مترجم اپنی خفت مٹانے کے لیے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن چبوترے کے عقب سے دروازے کا پردہ اٹھا اور اس نے طاہر کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ”خانِ اعظم تشریف لا رہے ہیں۔“

ایک لمحے بعد طاہر چبوترے پر اس جابر و قاہر انسان کو دیکھ رہا تھا جس کی وحشت اور بربریت کے افسانے مشرق و مغرب میں مشہور ہو چکے تھے۔ مترجم دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر رکوع کی حالت میں کھڑا تھا۔ چنگیز خان نے ایک نگاہ غلط انداز سے طاہر کی طرف دیکھا اور چبوترے پر بیٹھ گیا۔ مترجم سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اس بات پر اظہارِ ملال کر رہی تھیں کہ طاہر نے اس کی تقلید نہیں کی۔ طاہر بدستور چنگیز خان کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ ایک ایسی گستاخی تھی جسے بھرے دربار میں شاید تاتاری سردار برداشت نہ کرتے اور تخلیے میں مترجم برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر کار اس نے آہستہ سے کہہ ہی دیا۔ ”نگاہیں نیچی رکھو!“

لیکن طاہر پر اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد خلیفۂ بغداد کے ایلچی اور تاتاریوں کے شہنشاہ کی گفتگو کی ابتدا یوں ہوئی۔

مترجم: (چنگیز خان سے مخاطب ہو کر) "خلیفۂ بغداد کا ایلچی خاقانِ اعظم شہنشاہِ تاتار کو جن کی شفقت کا ہاتھ دوستوں کے لیے باعث رحمت ہے اور جنگی تلوار دشمن کے سر پر صاعقہ بن کر کوندتی ہے، نہایت ادب و احترام کے ساتھ سلام عرض کرتا ہے۔"

چنگیز خان: "ہم بغداد کے ایلچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اسے اطمینان دلایا جائے کہ یہاں اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔"

مترجم: (طاہر سے مخاطب ہو کر عربی زبان میں) "شہنشاہِ والا تبار آپ کی آمد پر اظہارِ مسرت فرماتے ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہاں آپ کی گھبراہٹ بلا وجہ ہے۔ آپ کو الطافِ خسروانہ سے مالا مال کر کے واپس بھیجا جائے گا۔"

طاہر: "میں انعامات کی تمنّا لے کر یہاں نہیں آیا۔ اگر شاہِ تاتار اس قدر

مہربان ہیں تو مجھے خلیفہ کا خط پیش کرنے کے بعد اسلام کی تبلیغ کا موقع دیں۔ یہ میرے لیے سب سے بڑا انعام ہو گا۔

مترجم: ”خلیفہ کا قاصد خاقانِ تاتار کی نظرِ عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہے اور خلیفۂ بغداد کا خط پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔“

چنگیز خان: ”اجازت ہے۔“

مترجم: ”خاقانِ اعظم حکم دیتے ہیں کہ خلیفہ کا مکتوب پیش کیا جائے۔“

طاہر نے آگے بڑھ کر حریر میں لپٹا ہوا مکتوب پیش کیا۔ چنگیز خان نے اسے کھولا اور مترجم کو دیتے ہوئے پڑھ کر سنانے کا حکم دیا۔ عربی زبان میں خط کا مختصر مفہوم یہ تھا۔

”تاتاریوں کے بادشاہ چنگیز خان کو واضح ہو کہ ہم پر خدا اور رسول کی طرف سے عالمِ اسلام کے تمام مسلمانوں کی عزّت و آبرو اور آزادی کا فرض عائد ہوتا ہے۔ شاہِ خوارزم کے ساتھ ہمارے چند اختلافات ہیں لیکن عالمِ اسلام پر کسی بیرونی خطرے کی مدافعت کے لیے ہم صرف

خوارزم شاہ کی حمایت کا اعلان کرنے پر مجبور ہوں گے بلکہ اس کے جھنڈے تلے معمولی سپاہیوں کی حیثیت سے لڑنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ اگر یہ درست ہے کہ شاہِ تاتار خوارزم کی سرحد پر افواج جمع کر رہا ہے تو ہم اسے متنبہ کرتے ہیں کہ خوارزم کے خلاف اس اعلانِ جنگ کو عالمِ اسلام کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا۔ اس خط کے جواب میں ہم شاہِ تاتار کا یہ اعلان سُننا چاہتے ہیں کہ ان کی افواج خوارزم پر حملہ نہیں کرے گی۔ " منجانب خلیفۃ المسلمین ابو العباس احمد الناصر الدّین اللہ "

مترجم نے کسی خاص ردوبدل کے بغیر اس خط کا تاتاری زبان میں ترجمہ کر دیا۔

طاہر حیران تھا کہ چنگیز خان کی پیشانی پر ایک معمولی شکن تک نمودار نہیں ہوئی۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ طاہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ اس نے اس خط کو ایک دلچسپ مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔

چنگیز خان: ”اپنے خلیفہ کو ہماری طرف سے پیغام دو کہ ہمیں عالمِ اسلام سے کوئی دشمنی نہیں۔ خوارزم شاہ نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، اس کے باوجود ہم اس پر چڑھائی کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

مترجم: ”آپ خلیفہ کے پاس خاقانِ تاتار کا یہ پیغام لے جائیں کہ آپ کی سفارش پر خاقانِ اعظم خوارزم شاہ کی خطائیں معاف کرتے ہیں اور عالمِ اسلام پر چڑھائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔“

طاہر: ”میں یہ پیغام خلیفہ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ خلیفہ کا مکتوب بغداد کے عوام کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کے دل میں اپنی فوجی قوّت کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ عام طور پر ہر وعدے اور ہر معاہدے پر غالب آ جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اس وعدے کی خلاف ورزی کی اور

خوارزم پر حملہ کر دیا تو سارا بغداد اور اس کے ساتھ مشرق و مغرب کی دوسری اسلامی سلطنتیں آپ کے خلاف صحرا کی آندھیوں کی طرح اُٹھ کھڑی ہوں گی۔"

مترجم: "خلیفہ کا ایلچی نہایت ادب و احترام کے ساتھ خانِ اعظم کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہے کہ حضور کا پیغام خلیفہ کے گوشِ گزار کر دیا جائے گا۔ آپ کا یہ وعدہ اسلامی دنیا کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے لیکن اگر آپ نے خوارزم پر حملہ کر دیا تو بغداد اور دوسری اسلامی سلطنتوں کے عوام اپنی حکومتوں کو خوارزم کا ساتھ دینے پر مجبور کریں گے اور ان سب کو تاتاری افواج کے سیلِ رواں کے سامنے المناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

چنگیز خان: "ہم کسی کو دوست کہنے کے بعد اس کی طرف سے بد اعتمادی پسند نہیں کرتے۔"

مترجم: (طاہر کی طرف گھورتے ہوئے) "خانِ اعظم اس اظہارِ بد اعتمادی

پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اس لیے براہ کرم خاموش رہو!"

طاہر: "بہت اچھا۔ اب میں خانِ اعظم کے سامنے تبلیغ کی اجازت چاہتا ہوں!"

مترجم (متذبذب سا ہو کر) "خلیفہ کا ایلچی اہلِ تاتار کے مذہبی عقائد سے بہت متاثر ہوا ہے اور اس بات کی اجازت چاہتا ہے کہ اسے اسلام کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔"

چنگیز خان: "اسے ہماری طرف سے یقین دلایا جائے کہ ہم وفا دار مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے۔"

مترجم: (طاہر سے مخاطب ہو کر) "خان اعظم بہت مصروف ہیں اور آپ کو رخصت کی اجازت دیتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ وفادار مسلمانوں سے انہیں کوئی پرخاش نہیں۔"

طاہر نے پریشان ہو کر مترجم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر وہ اس وقت مصروف ہیں تو مجھے کسی اور وقت تبلیغ کا موقع دیا جائے۔"

چنگیز خان نے پوچھا۔ ”خلیفہ کا ایلچی کیا کہتا ہے۔“

مترجم نے کہا۔ ”یہ حضور کا شکریہ ادا کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اگر حضور کسی بات پر خفا ہو گئے ہوں تو اسے معاف کیا جائے۔“

چنگیز خان نے کہا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ ہماری مصروفیات میں زیادہ دیر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ خلیفہ کا ایلچی کافی دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ پوچھا جائے کہ وہ کب روانہ ہونا چاہتا ہے؟“

مترجم نے طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”خان موصوف فرماتے ہیں کہ ہم بہت مصروف ہیں اس لیے دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ سردیاں شروع ہونے والی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ تم فوراً بغداد روانہ ہو جاؤ۔ یہاں بہت سے مسلمان علما ایسے ہیں جو ہمیں اسلام کے متعلق بتاتے رہتے ہیں۔“

چنگیز خان عقب کے کمرے میں چلا گیا۔

(۴)

خیمے سے باہر چنگیز خان کے لڑکے اور چند تاتاری سردار ایک قالین پر دھوپ میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان کے استفسار پر مترجم نے طاہر کو ان کے ساتھ متعارف کرایا۔ انہوں نے طاہر کو اپنے پاس بٹھالیا اور بغداد کے متعلق سوالات شروع کر دیے۔ طاہر نے بعض سوالات کا جواب دیا لیکن جب اس سے بغداد کی فوج کی تعداد اور قلعوں کی مضبوطی کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے کہا ”میں ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔“

چنگیز خان کے ایک بیٹے نے کہا۔ ”آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم نے یہ سوالات کسی بُرے ارادے سے نہیں پوچھے۔ بغداد کے ساتھ ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں اور ہم اپنے دوستوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں آپ کو بھی یقین دلاتا ہوں کہ باہر کی دنیا کے متعلق ہماری معلومات اس قدر ناقص نہیں۔ یہ دیکھیے!“

چنگیز خان کے بیٹے نے اپنی جیب سے رومال نکال کر طاہر کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ ”شاید آپ نے بغداد کا اس سے زیادہ مکمل نقشہ پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔“

رومال پر بنا ہوا نقشہ اس قدر مکمل تھا کہ طاہر کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ایک تاتاری سردار نے طاہر کی طرف معنی خیز تبسّم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا:

”اب آپ ہمارے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتے ہیں۔“

طاہر ابھی تک نقشہ دیکھ رہا تھا کہ ایک خادم نے آکر تاتاری زبان میں کچھ کہا اور یہ لوگ اُٹھ کر خیمے کی طرف چل دیے۔ طاہر جب یہ رومال واپس دینے لگا تو چنگیز خان کے بیٹے نے کہا۔ ”اگر آپ کو یہ نقشہ پسند ہو تو آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میرے پاس اور نقشے موجود ہیں۔“

طاہر نے جواب دیا ”نہیں۔ بغداد کا نقشہ میرے دل پر لکھا ہوا ہے۔“

جب لوگ ایک خیمے کے اندر داخل ہو رہے تھے مترجم نے طاہر سے کہا:

"آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ بھلا اس شخص کے دل میں اسلام کے لیے کیا جگہ ہو سکتی ہے؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "مجھے اس کی اعتنائی کا افسوس نہیں لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ مجھے اپنا فرض پورا کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

مترجم نے کہا۔ "آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے خانِ اعظم پر آپ کے بہت سے الفاظ کی تلخی ظاہر نہیں ہونے دی۔"

طاہر نے چونک کر کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ آپ میری باتوں کا مفہوم بدلنے کی کوشش کرتے رہے ہیں؟"

مترجم نے ایک منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں۔ میں نے آپ کے بعض خیالات کی ترجمانی ذرا مہذّب طریقے سے کر دی تھی۔"

طاہر نے پوچھا۔ "مہذّب طریقے سے آپ کی مراد فدویانہ طریقہ ہے؟"

مترجم نے جواب دیا۔ "مہذّب طریقے سے میری مراد وہ طریقہ ہے جس کی بدولت آج ہمیں دھکے دے کر دربار سے نہیں نکالا گیا۔ آپ کے ساتھ تو شاید رعایت برتی جاتی، مجھ پر غصّہ ضرور نکالا جاتا۔"

طاہر نے کہا۔ "جب میں یہ کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کی کسی ایک سلطنت پر حملے کی صورت میں تاتاریوں کے خلاف ساری دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں گے تو چنگیز خان کی مسکراہٹ یہ ثابت کرتی تھی کہ اسے یا تو اپنی فوجی قوّت پر بہت ناز ہے اور یا وہ میرے الفاظ کو ایک کھوکھلی دھمکی سمجھتا ہے۔"

مترجم نے کہا۔ "خانِ اعظم موت کے دروازے پر کھڑا ہو کر بھی مسکرانے کی ہمّت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جانتا ہے کہ اقوام کی قسمت کا فیصلہ الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے ہوتا ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو بغداد واپس پہنچ کر تاتاریوں کی فوجی قیادت کے متعلق خلیفہ کی غلط فہمی دور کرنا اپنا فرض سمجھتا۔ آپ نے ابھی تک کچھ دیکھا نہیں۔ میرے ساتھ آیئے!" طاہر مترجم کے ساتھ پہاڑی کے گرد چکر لگاتا ہوا دوسری طرف

پہنچا۔ اس طرف بھی پہاڑی کے نیچے ایک وسیع وادی میں چھوٹے چھوٹے بے شمار خیمے نصب تھے۔ مترجم نے ایک جگہ رُک کر ان خیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ پہاڑ کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ اس قسم کی کتنی اور وادیوں میں تاتاریوں کی ٹڈی دل بکھری ہوئی ہیں۔ میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افواج خوارزم پر حملہ کریں گی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر خانِ اعظم نے خوارزم شاہ سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا ارادہ نہیں بدل سکے گی اور خوارزم شاہ کی حمایت کے لیے اگر تمام اسلامی سلطنتوں کی افواج بھی میدان میں آ گئیں تو بھی تاتاریوں کا سیلاب انہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ وہ پہاڑی ندی کے سیلاب کے سامنے ریت کا ایک ڈھیر ثابت ہوں گے۔ اس لیے آپ کو بغداد کے ساتھ ہمدردی ہے تو خلیفہ کو ایسے شخص کے ساتھ بگاڑنے کا مشورہ نہ دیں جو اپنے دشمنوں پر خدا کا قہر بن کر نازل ہوتا ہے۔“

طاہر نے برہم ہو کر جواب دیا۔ ”آپ ضرورت سے زیادہ چنگیز خان کا حق

نمک ادا کر رہے ہیں۔ مجھے ان سب طریقوں کا علم ہے جو چنگیز خان اپنے حریفوں کو مرعوب کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انتشار کی وجہ سے عالمِ اسلام بہت کمزور ہو چکا ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود ہم برسوں مغرب کے نصرانیوں کی ٹڈی دل افواج کو پے در پے شکستیں دے چکے ہیں۔ اور چنگیز خان کی افواج ان سے زیادہ نہیں اور نہ خوارزم اور بغداد کی فوجیں مصر اور شام کی افواج سے کم ہوں گی۔ مغرب کی ٹڈی دل افواج کے مقابلے کے لیے ہم شام، فلسطین اور مصر کے کسی میدان میں پچاس ہزار سے زیادہ افواج لا سکے لیکن تاتاریوں کے مقابلے کے لیے بغداد سے تین لاکھ اور خوارزم سے چار لاکھ افواج میدان میں لا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے مجھے خلیفہ کا خیر خواہ سمجھ کر اسے تاتاریوں کی طاقت سے مرعوب ہونے کا مشورہ دیا ہے تو میں آپ کو چنگیز خان کا وفادار سمجھ کر مشورہ دیتا ہوں کہ عالمِ اسلام کی قوّت مدافعت کے متعلق اس کی غلط فہمی دور کریں!"

مترجم نے جواب دیا۔ "چنگیز خان احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جانے والے

انسانوں میں سے نہیں لیکن خلیفۂ بغداد اپنے احساسِ کمتری کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ خلیفہ کو صرف احساس ہے کہ خوارزم شاہ خانِ اعظم کے حملے کی تاب نہ لا سکے گا بلکہ اسے یہ بھی یقین ہے کہ خلیفہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔۔۔ اگر خوارزم اور بغداد کی فوجی قوّت پر اعتماد ہوتا تو وہ چنگیز خان کو آپ کی وساطت سے یہ درخواست نہ بھیجتا کہ خوارزم پر حملہ نہ کرو۔ ایک طاقت ور انسان اپنے حریف سے کبھی یہ نہیں کہتا کہ مجھ پر حملہ نہ کرو ورنہ اس کے نتائج بُرے ہوں گے۔ اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکے گا۔"

طاہر نے کہا۔ "اس پیغام سے خلیفہ کا یہ مقصد تھا کہ خوارزم شاہ اور بغداد کے عوام کی یہ غلط فہمی دور کی جائے کہ دولتِ عباسیہ درپردہ خوارزم شاہ کے خلاف تاتاریوں سے ساز باز کر رہی ہے۔"

مترجم نے پھر ایک بار منافقانہ مسکراہٹ سے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خوارزم شاہ کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی غلط فہمی دور ہو گی یا نہیں۔ لیکن آپ نے خانِ اعظم کی ایک غلط فہمی دور کر دی ہے۔

چلیے میں آپ کو آپ کے خیمے میں چھوڑ آؤں۔"

طاہر نے جلدی سے سوال کیا۔ "پہلے یہ بتائیے کہ وہ غلط فہمی کیا تھی جسے میں نے دور کیا؟"

مترجم نے کہا۔ "آپ کو آنے والے حالات اس سوال کا جواب دیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"نہیں آپ کہہ چکے ہیں کہ میں چنگیز خان کا وفادار ہوں اور میری وفاداری کا تقاضا ہے کہ میں ایسی باتیں ظاہر نہ کروں۔"

اس نے یہاں تک کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "آپ کی بعض باتیں میرے لیے نا قابلِ برداشت تھیں لیکن نہ معلوم میں اپنے دل میں آپ کے لیے ہمدردی کیوں محسوس کرتا ہوں۔ آپ کو میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں کسی اور کے ساتھ بے تکلّف ہونے کی کوشش نہ کریں اور جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ اب

مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھیے!"

ایک انکشاف

واپسی پر مملکتِ تاتار کی حدود عبور کرنے کے بعد طاہر اور اس کے ساتھی خوارزم کی سرحد پر ایک چھوٹے سے شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شہر فوقند کے جنوب مشرق میں کوئی سو میل کے فاصلے پر خوش حال کاشت کاروں اور تاجروں سے آباد تھا۔ آس پاس کی سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اس شہر میں قریب پانچ ہزار سپاہی رہتے تھے۔

بغداد سے قراقرم جاتے ہوئے بھی طاہر اس شہر سے گزرا تھا اور شہر کے عامل کے علاوہ شہر کے چند معززین کو اس کے ساتھ گہری عقیدت ہو چکی تھی۔ شہر کے عامل نے پہلے کی طرح اب کی بار بھی اسے اپنے گھر پر ٹھہرایا۔ شہر کے باشندے تاتاریوں کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔

چنانچہ طاہر کی آمد کی خبر سنتے ہی شہر کے چند سرکردہ فوجی افسر اور تاجر گورنر کے مکان پر آموجود ہوئے۔ طاہر نے ان کے سامنے مختصر حالات بیان کیے اور انہیں تسلّی دی کہ خلیفہ کے پیغام کے باوجود اگر تاتاریوں نے سلطنت خوارزم پر حملہ کیاتو بغداد اپنے تمام ذرائع سے خوارزم کی مدد کرے گا۔

ایک تاجر نے سوال کیا۔ ”کیا آپ کو چنگیز خان کے وعدے پر یقین ہے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں اہلِ بغداد کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے بہت جلد وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔“

گورنر نے سوال کیا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”کہیے!“

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشکل کے وقت خلیفہ ہمارے لیے نیک

دعاؤں سے زیادہ کچھ نہ کریں گے۔ ہمارے لیے ان کی طرف سے یہ بھی ایک بہت بڑی مدد ہو گی۔ لیکن چند لوگ ایسے بھی ہیں جو شک کرتے ہیں کہ خلیفہ نے چنگیز خان کے نام تازہ پیغام اس لیے بھیجا ہے کہ ان کا ایک خط جس میں انہوں نے چنگیز خان کو خوارزم پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی، پکڑا جا چکا ہے۔ خلیفہ کو یہ ڈر پیدا ہوا ہے کہ اس خط کی خبر مشہور ہوتے ہی نہ صرف عالمِ اسلام میں ان کی رہی سہی عزّت ختم ہو جائے گی، بلکہ بغداد کے عوام میں بھی بے چینی پھیل جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف بغداد میں خوارزم کے سفیر اور دوسری طرف آپ جیسے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے آپ کو دوسرا پیغام دے کر روانہ کر دیا اور اب شاید وہ موقع پا کر چنگیز خان کو یہ پیغام بھیجنے کی کوشش کریں گے کہ میں نے حالات سے مجبور ہو کر دھمکی دی تھی۔ تم میری طرف سے مطمئن رہو۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "خلیفہ کے خلاف ایسے شبہات کا اظہار آپ کو زیب نہیں دیتا۔ تاہم اگر خدانخواستہ آپ کے خدشات صحیح بھی ہوں تو بھی میں

آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حالات خلیفہ کو اپنی بات پر قائم رہنے پر مجبور کر دیں گے۔ میں قراقرم میں انسانی کھوپڑیوں کے انبار دیکھ چکا ہوں۔ اب بغداد کی مساجد میں کھڑے ہو کر میرے لیے لوگوں کو یہ بتانا مشکل نہیں ہو گا کہ تاتاری انسانیت کے کس قدر دُشمن ہیں اور اگر خوارزم پر کوئی سیلاب آیا تو اس کی لہریں بغداد سے دور نہیں ہوں گی اور اگر مجھے خلیفہ یا وزیر اعظم میں سے کسی کی نیّت پر شبہ ہوا تو بغداد کی جامع مسجد میں لوگ میری زبان سے یہ اعلان سنیں گے تمہارے محافظ چنگیز خان کے ساتھ تمہاری عزّت و ناموس کا سودا کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہاں تک نوبت نہیں آئے گی۔ خلیفہ کو اگر خوارزم کے ساتھ ہمدردی نہ بھی ہو تو بھی بغداد کو بچانے کے لیے وہ یقیناً خوارزم شاہ کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہو گا۔"

اگلے دن طاہر روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن عامل شہر نے کہا۔ "آج جمعہ ہے۔ شہر کے لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ آپ جمعہ کی نماز پڑھائیں۔ اس لیے آج ضرور شہر جائیں۔ اتنی دیر میں راستے کی چوکیوں کو آپ کے سفر کے

لیے گھوڑے تیّار رکھنے کی اطلاع مل جائے گی۔"

گورنر کے اصرار پر طاہر نے منظور کر لیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد گورنر نے طاہر کے ساتھ نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی زبان میں جادو ہے۔ کاش بخارا اور سمرقند کی مساجد کے خطیب آج یہاں موجود ہوتے؟"

عوام اپنی عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے طاہر کو گورنر کے محل تک چھوڑنے کے لیے جلوس کی شکل میں اس کے ساتھ ہو لیے۔

(۲)

اسی روز طاہر عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے گورنر کے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسے شہر کا کوتوال ملا اور اس نے کہا۔ "میں گورنر کے مکان سے آپ کو تلاش کر کے آ رہا ہوں۔"

طاہر نے کہا۔ "خیر تو ہے؟"

کوتوال نے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو آپ میرے ساتھ چلیں۔“

طاہر نے گورنر سے مصافحہ کیا اور کوتوال کے ساتھ ہو لیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے سوال کیا۔ ”کیا کوئی بات ایسی ہے جو آپ مجھے یہاں نہیں بتا سکتے؟“

”میں نے لوگوں کے سامنے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ یہ کہتے ہوئے کوتوال نے اپنی جیب سے ریشمی کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی نکالی اور طاہر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اسے پہچانتے ہیں؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ اس میں کیا ہے؟“

کوتوال نے جواب دیا۔ ”اسے کھول کر دیکھیے۔ شاید کوئی ایسی شے مل جائے جسے آپ پہچانتے ہوں۔“

طاہر نے تھیلی کھول کر دیکھا۔ اس میں تین ہیرے چمک رہے تھے۔ طاہر نے وضاحت طلب نگاہوں سے کوتوال کی طرف دیکھا اور اس نے طاہر کی

پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہیرے آپ کے ایک نوکر سے ملے ہیں۔“

طاہر نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”آپ نے اس کی تلاشی لی تھی؟“

کوتوال نے جواب دیا۔ ”آپ برا نہ مانیں، یہ میرا فرض تھا۔ آپ کا نوکر ابھی ابھی ایک تاجر کی دکان پر کھڑا اسے ایک ہیرا دکھا کر قیمت دریافت کر رہا تھا اور وہ تاجر کل آپ کے ساتھ ملاقات سے اور آج آپ سے تقریر سن کر آپ کا گرویدہ ہو چکا ہے۔ اسے شک گزرا کہ معمولی حیثیت کے آدمی کے پاس ایسے قیمتی ہیرے نہیں ہوتے۔ اس نے مجھے آ کر بتایا کہ شاید آپ کے نوکر نے آپ کی چوری کی ہے۔ چنانچہ میں تلاش کے لیے نکلا تو وہ ایک اور تاجر کی دکان پر ہیرے کی قیمت دریافت کر رہا تھا۔ ہیرے کی قیمت جاننے کے متعلق اس کی بے قراری یہ ظاہر کرتی تھی کہ یہ اس نے حال ہی میں کہیں سے حاصل کیا ہے۔ چنانچہ میں اسے پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ وہاں اس کی تلاشی لی تو اس تھیلی سے دو اور ہیرے بھی نکل آئے۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ ہیرے کہاں سے لیے ہیں؟“

کوتوال نے جواب دیا۔ ”وہ ابھی تک کوئی جواب نہیں دیتا اور آپ کو اس واقعے سے آگاہ کرنے سے پہلے میں نے اس بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

طاہر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

کوتوالی کے قریب پہنچ کر طاہر نے کہا۔ ”آپ نے اس کا نام پوچھا؟“

کوتوال نے جواب دیا۔ ”وہ اپنی نام کمال بتاتا ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”بہتر ہے کہ میں تنہائی میں اس کے ساتھ بات کروں۔“

کوتوال نے کہا۔ ”چلیے آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیں، میں اسے وہاں لے آؤں گا۔“

طاہر کو ایک کمرے میں بٹھا کر کوتوال تھوڑی دیر میں کمال کو لے آیا اور

اسے طاہر کے پاس چھوڑ کر نکل گیا۔

طاہر نے کمال کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت ایک لُٹے ہوئے تاجر سے مختلف نہ تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر طاہر کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ ہیرے میرے ہیں۔“

طاہر نے اُٹھ کر تھیلی اس کے ہاتھ میں دے دی اور کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے کہاں سے لیے ہیں۔“

”میں۔۔۔ میں نے۔۔۔ مجھے یہ تھیلی۔۔۔ تاتاریوں کے خیمے میں ملی تھی۔“

”تو پھر یہ مجھے دے دو۔ تاتاریوں کی چیز ان کے پاس پہنچادی جائے گی۔“

”نہیں نہیں یہ میرے ہیں۔ یہ میرے ہیں۔“

”تو پھر تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ تمہیں یہ کس نے دیے۔“

”کسی نے نہیں۔ مجھ تو یہ راستے میں ملے تھے۔“

طاہر نے ایک ہاتھ سے اس کا گلا دباتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس اس کے منہ پر زور سے چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتاؤ۔ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں!“

کمال نے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بے قصور ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

طاہر نے اس کے منہ پر ایک اور چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ ہیرے تمہیں چنگیز خان نے دیے ہیں۔“

کمال نے چلا کر کہا۔ ”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ ابو اسحاق مجھے مار ڈالے گا۔“

طاہر نے کہا۔ ”اس وقت میرے ہاتھ ابو اسحاق کے ہاتھوں کی نسبت تمہاری شہ رگ کے زیادہ قریب ہیں۔ تمہیں بتانا پڑے گا!“

”مجھے یہ چنگیز خان کے ایک نوکر نے دیے تھے۔“

طاہر نے اس کی گردن چھوڑ دی اور پوچھا۔ ”کیا یہ درست نہیں کہ تم نے اس رات جب تم سر منڈوا کر آئے تھے، چنگیز خان سے ملاقات کی تھی؟“

کمال نے اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ ہم اس سے نہیں ملے۔“

طاہر نے کہا۔ ”اپنی ٹوپی اُتار دو۔“

کمال اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ طاہر نے آگے بڑھ کر اس کی ٹوپی اُتارنے کی کوشش کی لیکن اس نے ٹوپی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پر دباتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لیے مُجھ پر رحم کرو۔ ابو اسحاق مجھے مار ڈالے گا۔“

طاہر نے اس کے منہ پر ایک اور چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ”شور نہ کرو۔“

اور اس کی ٹوپی اتار کر پھینک دی۔ کمال کی کھوپڑی سے سیاہ روغن کسی حد تک اُتر چکا تھا اور چھوٹے چھوٹے بالوں میں طاہر کو سُرخ رنگ کے چند

عجیب و غریب نشانات دکھائی دیے۔ غور سے دیکھنے پر اسے یہ نشانات عربی دُھندلے حروف نظر آنے لگے۔ چند لمحات کے لیے طاہر کا خون منجمد سا ہو کر رہ گیا۔ سرخ رنگ کی تمام تر تحریر پڑھے بغیر وہ محسوس کر رہا تھا کہ بغداد سے عالمِ اسلام کو خون کے سمندر میں غسل دینے کی سازش مکمل ہو چکی ہے۔ اور اسے اپنی تمام احتیاط کے باوجود اس ناپاک مقصد کے لیے آلہ کار بنایا گیا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کمال کی ٹوپی اس کے سر پر رکھ دی اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکل آیا۔ کوتوال باہر کھڑا تھا۔ طاہر نے اس سے کہا۔ ”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

کوتوال نے کہا۔ ”آپ اپنے مجرم کو سزا دینے یا معاف کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن میں آپ کو ایسے ساتھیوں سے محتاط رہنے کا مشورہ دوں گا۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”آپ یقین کیجئے کہ میں ایسے مجرموں کو معاف کرنے کا عادی نہیں۔“

باہر نکل کر طاہر نے گورنر کے محل کے قریب ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کمال سے کہا۔ ”اپنا سر دھو کر صاف کرو!“

کمال تذبذب کی حالت میں تھوڑی دیر کھڑا رہا لیکن طاہر نے اپنا خنجر نکالتے ہوئے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جلدی کرو ورنہ میں یہ قیمتی تحریر پڑھنے کے لیے تمہارا سر اتارنے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔“

کمال نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ روغن پانی سے نہیں اُترے گا۔“

”تو اپنا سر ریت مل کر صاف کرو۔“

تھوڑی دیر بعد طاہر کمال کے سر پر دھندلی تحریر کا مفہوم سمجھنے میں کامیاب ہوا ”دنیائے اسلام میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ خوارزم شاہ کو تیّاری کا موقع نہ دیں۔ خلیفۃ المسلمین اور اہلِ بغداد کی دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ ایلچی اس پیغام میں تاخیر کی وجہ بیان کر دے گا۔ خلیفہ کی طرف سے طاہر جو کچھ کہے اس سے غلط فہمی نہ ہو۔ اسے صرف راستے کی

مشکلات کے پیشِ نظر بھیجا جا رہا ہے۔

دولت عباسیہ کا نمک خوار اور آپ کا خادم خاص وحید الدّین وزیر خارجہ

(۳)

جب طاہر نے کمال کو دوبارہ سر پر ٹوپی رکھ کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو اس نے انتہائی عجز کے ساتھ کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ میرے سر پر کیا لکھا گیا تھا۔ وہ صُبح سے شام تک میرے سر پر تیز سوئی چبھوتے رہے۔ میں تکلیف کے باعث تین راتیں سو نہ سکا۔ میرے ساتھ واپسی پر انہوں نے انعام کا وعدہ کیا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر رحم کیجیے۔“

طاہر نے کہا۔ ”تم صرف سچ بول کر اپنے آپ کو رحم کا حق دار ثابت کر سکتے ہو۔“

”آپ جان بخشی کا وعدہ کریں، میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔“

”میں تمہاری جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ بتاؤ اس سازش میں کون

کون شریک ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ ابو اسحاق ماہِ رمضان سے چند دن قبل میری آنکھوں پر پٹّی باندھ کر ایک مکان میں لے گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا۔ جمیل سے میری ملاقات اسی تہہ خانے میں ہوئی۔ ہم دونوں کے سر مونڈ کر کھوپڑیوں پر کچھ لکھا گیا اور جب دوبارہ چھوٹے چھوٹے بال آئے تو ابو اسحاق نے کہا۔ ”جب تمہاری ضرورت ہو گی میں تمہیں اپنے ساتھ اہم مہم پر لے جاؤں گا۔ سرِ دست تمہیں وزیر اعظم کے پاس ملازم رکھوا دیتا ہوں۔“

”چنانچہ ہم وزیرِ اعظم کے اصطبل میں ملازم ہو گئے۔ یہاں آ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ابو اسحاق اصطبل میں داروغہ ہے۔ ابو اسحاق نے ہمیں پانچ پانچ سو دینار دیے تھے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر یہ راز کسی پر ظاہر ہو گیا تو ہم دونوں کے سر کاٹ دیے جائیں گے۔“

طاہر نے سوال کیا۔ ”اس دوران میں تم نے کبھی وزیر اعظم سے ملاقات

کی؟"

"اسے دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا لیکن کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ صرف آخری دن جب آپ وزیر اعظم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ابو اسحاق ہمیں ان کے پاس لے گیا اور جو باتیں انہوں نے ہمارے ساتھ کیں، آپ سن چکے ہیں۔"

"اصطبل میں ملازم ہونے سے پہلے جس تہہ خانے میں رکھے گئے تھے، وہ وزیر اعظم کے محل سے کتنی دور تھا۔"

"ہمیں وہاں سے رات کے وقت آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر نکالا گیا تھا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ مکان دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔"

"تم وحید الدّین سابق وزیر خارجہ کو پہچانتے ہو؟"

"میں نہیں پہچانتا لیکن تہہ خانے میں ہمارے سروں پر جس شخص نے تحریر لکھوائی تھی اس سے متعلق جمیل کا خیال تھا وہ وزیرِ خارجہ کے دفتر کا

کوئی بڑا عہدے دار ہے۔"

"اصطبل میں ملازم ہونے کے بعد تم نے کبھی اس کو دوبارہ دیکھا؟"

"نہیں!"

"ابو اسحاق نے کبھی تمہیں وزیر اعظم کے سامنے پیش کر کے تمہارے سروں پر لکھی ہوئی تحریر دکھائی؟"

"نہیں۔ ہمیں سوائے اس دن کے جب کہ آپ وہاں موجود تھے، کبھی ان کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔"

طاہر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ کم از کم اُسے یہ اطمینان تھا کہ وزیر اعظم اس سازش میں شریک نہیں اور یہ سارش وزیرِ اعظم کی لا علمی میں وزیرِ خارجہ کی طرف سے ہو رہی تھی۔ اور وزیر اعظم کے اصطبل کا داروغہ اس کا آلہ کار تھا۔ رخصت کے وقت اُسے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ میں باہر سے کوئی آدمی دینے کی بجائے اپنے نوکروں میں سے دو تین آدمی آپ کو دے رہا ہوں۔ وحید الدّین کی پہلی سازش پکڑی جا چکی تھی لیکن

رفو چکر ہونے سے پہلے دوسری سازش کا مسودہ تیار کر چکا تھا۔ طاہر خلیفہ کے متعلق بھی اپنے دل کو تسلّی دے رہا تھا کہ اسے بھی وزیر اعظم کی طرح اس سازش کا کوئی علم نہیں۔ لیکن اس کے ذہن میں تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا اور وہ جس قدر سوچتا تھا، اسی قدر پریشان ہوتا تھا۔ جب خوش فہمی بدگمانی میں تبدیل ہونے لگتی تو وہ یہ سوچتا۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ وزیر اعظم کے ایما پر ہوا ہو اور اس نے احتیاطاً ان لوگوں کو اپنے آپ سے دور رکھا ہو تاکہ اگر یہ پہلے ایلچی کی طرح پکڑے جائیں تو کوئی ایسا ثبوت نہ دے سکیں جس سے وزیر اعظم کی اس سازش میں شرکت ثابت کی جاسکے۔ لیکن اس کے دل کی فیاضی وزیر اعظم کے خلاف ایسے شبہات کی تردید کر دیتی تھی۔

اس نے پھر کمال سے پوچھا۔ ”کیا اس دوران میں تم نے کبھی خلیفہ سے ملاقات کی!“

”نہیں!“ ”اس شام تمہیں چنگیز خان کے سامنے پیش کیا گیا تھا؟“

”ہاں۔ ابو اسحاق ہمیں چنگیز خان کے مسلمان ملازم کے پاس لے گیا اور اس نے سر منڈوانے کے بعد ہمیں چنگیز خان کے سامنے پیش کر دیا۔“

”تم نے جمیل اور ابو اسحاق کے سر پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی ہو گی؟“

”جمیل کے سر پر اس تحریر کا فارسی ترجمہ ہے اور ابو اسحٰق کے سر پر چینی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ بھی شاید اسی کا ترجمہ ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”تم چلو، میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔ لیکن اگر ابو اسحاق پر کوئی بات ظاہر کرنے یا بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے لیے بہت بُرا ہو گا!“

کمال کوئی بات کہے بغیر طاہر کے آگے چل دیا۔

طاہر ایک گہری سوچ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا حاکم شہر کے محل میں داخل ہوا۔ اپنے کمرے کی بجائے وہ دوسرے کمرے کے دروازے پر جہاں اس کے ساتھ ٹھہرائے گئے تھے، رُک گیا۔ دروازے کا ایک کواڑ بند اور ایک کھلا تھا۔ کمال طاہر کا اشارہ پا کر اندر داخل ہوا تو ابو اسحاق

نے چلّا کر کہا۔ ”تم بہت بے وقوف ہو۔ ہم نے سارا شہر چھان مارا۔ آخر کہاں تھے تم؟“

کمال نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں یہیں تھا۔“

”تم نے طاہر کو دیکھا؟“

”طاہر کو۔۔۔۔ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟“

”تم جدھر جی چاہتا ہے، منہ اٹھا کر چل دیتے ہو۔ اگر ہم پر کوئی مصیبت آئی تو وہ تمہاری وجہ سے ہو گی!“

طاہر چپکے سے کمرے میں داخل ہوا۔ ابو اسحاق نے جلدی سے کہا۔ ”ہم آپ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ آپ کہاں تھے؟ میں بہت پریشان تھا۔“

طاہر نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ ”میں اور تمہارے ساتھیوں کو صفائی سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟ میرے خیال میں ابھی

تک تم میں سے کسی نے سر دھو کر وہ سیاہ روغن اُتارنے کی کوشش نہیں کی؟"

ابو اسحاق نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم تاتاریوں کا یہ تحفہ بغداد لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر وہاں کوئی تاتاری ملے گا تو بغداد کے باشندوں سے مطالبہ کریں گے کہ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔"

طاہر نے کہا۔ "ذرا اپنی ٹوپی اُتارو۔"

ابو اسحاق نے قدرے تذبذب ظاہر کرنے کے بعد اپنی ٹوپی اُتاری اور پھر جلدی سے اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میری احتیاط کے باوجود یہ روغن اُتر چکا ہے۔"

"بغداد میں سیاہ روغن کی کمی نہیں۔ تم یہاں اپنا سر دھو کر صاف کر لو اور بغداد پہنچ کر سر پر تازہ سیاہی مل لینا۔ اور جمیل! ذرا تمہارا سر بھی دیکھوں!"

جمیل نے ابو اسحاق کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر ٹوپی اتار کر پھر جلدی سے سر پر رکھ لی۔

طاہر نے کہا۔ ”کمال! تم نے بھی شاید اپنا سر نہیں دھویا۔“

کمال نے یکے بعد دیگرے ابو اسحاق، جمیل اور باہر کی طرف دیکھا اور طاہر کا اشارہ پا کر جھجکتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار دی۔

ابو اسحاق اور جمیل ایک لمحے کے لیے مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔ طاہر نے کہا۔ ”ابو اسحاق! کمال کے سر پر شاید کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذرا پڑھ کر و تو سُناؤ!“

ابو اسحاق نے کہا۔ ”تو آپ سب کچھ جان گئے ہیں۔“ طاہر نے کہا۔ ”نہیں ابھی تک تم دونوں کی کھوپڑیاں میری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔“

ابو اسحاق اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ خنجر کے دستے پر تھا۔ طاہر نے جلدی سے اپنا خنجر نکالتے ہوئے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بیٹھ جاؤ! تمہاری طرف سے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ میری یہ رائے نہیں بدل

سکے گا کہ غدّار بزدل ہوتے ہیں۔"

ابو اسحاق اب طاہر کی بجائے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمال کی بے حسی اس کے لیے حوصلہ شکن تھی۔ جمیل نے چند بار اُٹھنے کی کوشش کی لیکن طاہر کی نگاہوں نے اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

طاہر نے کہا۔ "سلطنت خوارزم کے لیے تمہارے سر بہت اہم ہیں۔ اگر یہ ضبط کر لیے گئے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے باقی دھڑ بغداد پہنچا دیے جائیں گے۔"

کمال نے کہا۔ "لیکن میرے ساتھ آپ کا وعدہ۔۔۔۔۔"

طاہر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم خاموش رہو۔"

ابو اسحاق نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ اور ہم سب خلیفہ کے خدمت گزار ہیں۔ جیسا نیک نیتی کے ساتھ آپ نے اپنا پورا فرض کیا ہے۔ اسی نیک نیتی کے ساتھ ہم نے وہ اپنا فرض پورا کیا۔ بغداد پہنچ کر اس جھگڑے کا فیصلہ خلیفہ کو سونپ دیں۔"

طاہر نے کہا۔ ”تم جھوٹ کہتے ہو۔ خلیفہ تمہاری اور وزیر خارجہ کی سازش میں شریک نہیں۔“

”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے بغداد پہنچ کر خلیفہ سے پوچھ لیں؟ اگر ان کی گواہی۔۔۔۔“ ابو اسحاق طاہر کے عقب میں نیم وا دروازے سے باہر کسی کو کھڑا دیکھ کر رُک گیا اور پھر اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ خوارزم سے انعام کے لانے میں ہمیں پھنسا کر خود نہیں بچ سکتے۔۔۔ آپ نے خلیفہ سے انعام حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے ناپاک مقاصد کا آلہ کار بنایا۔ اب آپ خوارزم کی خاطر ہمیں فروخت کر رہے ہیں۔“

”کاش ہمیں پہلے یہ علم ہوتا کہ آپ ہماری کھوپڑیوں پر کیا لکھوا رہے ہیں۔ ہمیں آپ نے صرف یہ بتایا کہ ہم بغداد کی بہت بڑی خدمت سر انجام دینے والے ہیں۔ اور ہم اس کے سلسلے میں مالا مال کر دیے جائیں گے۔“

طاہر نے آگے بڑھ کر ابو اسحاق کے منہ پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے

کہا۔ ”خاموش! ذلیل انسان تم یہ کس پر ثابت کرنا چاہتے ہو تمہاری ناپاک سازش میں میں بھی شریک تھا؟“

ابو اسحاق نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم پر۔۔۔ تم پر جس نے ہمیں پیسوں کا لالچ دے کر ذلّت کی انتہا تک پہنچا دیا۔ میں اس شہر کے گورنر کے سامنے جا کر چلّاؤں گا کہ یہ مساجد میں تقریریں کرنے والا انسان اپنے وقت کا سب سے بڑا دشمنِ اسلام ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”تم اس یادہ گوئی سے مُجھے مرعوب نہیں کر سکتے۔ تمہارے جیسے غدّار کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے میں اگر خود بھی سولی پر چڑھ جاؤں تو مجھے پروانہ ہو گی۔“

کمرے کا دروازہ کھلا اور شہر کا گورنر چند نوکروں کے امرا کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

”ان سب کو حراست میں لے لو۔“ گورنر یہ کہتے ہوئے طاہر سے مخاطب ہوا۔ ”میں آپ کی گفتگو سن چکا ہوں۔ یقین کیجیے ان سب باتوں کے

باوجود مجھے آپ کے متعلق اپنی رائے بدلتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ تاہم آپ کو کچھ عرصہ نظر بند رکھنے پر مجبور ہوں۔“

طاہر نے کہا۔ ”ابو اسحاق نے اپنا لہجہ آپ کو دروازے کے پیچھے کھڑے دیکھ کر تبدیل کیا تھا۔ مجھے آپ جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ لیکن میرے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں۔“

”اگر آپ اپنے ساتھیوں کے الزامات کی تردید کرسکیں تو مجھے یقیناً ایک روحانی مسرّت ہوگی، لیکن ایسے سنگین مقدمے کا فیصلہ فوقند کے حاکم اعلیٰ صادر فرماسکیں گے۔“

(۴)

عاملِ شہر نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ طاہر کے ساتھیوں کو بیڑیاں پہنادیں اور طاہر کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

طاہر کا طویل بیان سُننے کے بعد اس نے کمال کو پیش کرنے کا حکم دیا اور اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد طاہر سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”جہاں تک

میرا تعلق ہے آپ کے بارے میں شبہات بہت حد تک دور ہو چکے ہیں۔ لیکن میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حاکمِ اعلیٰ کے احکامات حاصل کیے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں آج ہی ان کے پاس اپنا ایلچی روانہ کر رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ کو بیڑیاں نہ پہنائی جائیں۔ لیکن آپ کو قلعے میں نظر بند رکھنے پر مجبور ہوں۔ آپ کے ساتھیوں کو ان کے سروں کا معائنہ کرنے کے بعد قید خانے میں بھیجا جائے گا۔"

شام کے وقت گورنر کا ایلچی فوقند کے حاکمِ اعلیٰ کے پاس اس شہر کے عامل کا پیغام لے کر روانہ ہو چکا تھا۔ حاکمِ شہر نے اپنی مکتوب میں ملزم کی وکالت کے الزام سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی معصومیت کا اعتراف کیا تھا۔

قریباً ڈیڑھ ہفتہ کی نظر بندی کے بعد طاہر کو چند سپاہی تلواروں کے پہرے میں عاملِ شہر کے پاس لے آئے اور اس نے طاہر کو بتایا کہ فوقند کے حاکم اعلیٰ تیمور ملک کا جواب آ گیا ہے۔ آپ کو وہاں جانا پڑے گا۔

”اور میرے ساتھی؟“

حاکم شہر نے جواب دیا۔ ”وہ بہت دور جا چکے ہیں۔“

”آپ کا مطلب؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ تیمور ملک نے ان کی بجائے، ان کے سروں کا مطالبہ کیا تھا اور میں اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔“

”نہیں۔ آپ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ بغداد میں اس سازش کے تمام بانیوں کو پکڑنے کے لیے ان کا زندہ رہنا ضروری ہے۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس حکم کی تعمیل کر چکا ہوں۔“

”لیکن کمال اور شاید جمیل اس سزا کا مستحق نہ تھا۔“

”میں ان کے بدلے اپنا سر کٹوانے کو تیار نہ تھا اور اس کے علاوہ آپ کی بھلائی بھی اسی میں تھی۔ آپ خوامخواہ اپنے ساتھیوں کو صفائی پیش کر رہے ہیں۔ تیمور ملک آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کانوں کی تصدیق کی

ضرورت محسوس کرنے کا عادی نہیں۔ اور اگر آپ کو یہ خیال ہے کہ کمال آپ کی صفائی پیش کر سکتا تھا تو اس کی کمی میں نے پوری کر دی ہے۔ میں نے تیمور ملک کو دوسرا خط لکھ دیا ہے۔"

تیمور ملک

علاؤ الدّین محمد خوارزم شاہ پہلے درجہ کا ضدّی اور خود سر حکمران تھا۔ خوارزم کی شمالی اور مشرقی سرحدوں پر تاتاریوں کے اِکا دُکا حملوں اور لوٹ مار کی خبر سُنتے ہی اس نے دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا۔ جلال الدّین اس کا ہونہار، ذہین، بہادر اور دور اندیش بیٹا اس تجویز کے خلاف تھا۔ اس نے امراء سلطنت کے اجلاس میں کھڑے ہو کر اپنے باپ سے کہا۔ ’’اگر آپ مجھے اپنی فوج کے سپاہی کی حیثیت میں بولنے کا حق دیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہمیں افواج سرحد پر جمع کر کے تاتاریوں کی پیش قدمی کا انتظار کرنا چاہیے۔ سرحد کے بعض مقامات پر ان کے دستے اگر کبھی کبھی لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے ہیں تو اس سے

ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کمزور ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اشتعال میں آ کر ان دشوار گزار برفانی پہاڑوں کی طرف پیش قدمی کر دیں جن کی تنگ گھاٹیاں ان کے لیے ناقابلِ تسخیر قلعوں کا کام دے سکتی ہیں۔ میدان میں ہم انہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیں گے۔ لیکن پہاڑی علاقے کی طرف پیش قدمی کرنا ہمارے لیے خطرناک ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ اور کسی ایسے مقام پر اچانک ہمارے گرد گھیرا ڈال لیں گے جہاں ہمارے آگے پیچھے تباہی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔"

تجربہ کار فوجی افسروں نے جلال الدّین کی تائید کی لیکن خوارزم شاہ نے بعض خوشامدی سرداروں کے زیرِ اثر اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اس کی پہلی اور آخری دلیل یہی تھی کہ تاتاری ڈاکوؤں کو سزا دینے میں ہماری طرف سے کسی قسم کا تذبذب دنیا پر ظاہر کر دے گا کہ ہم کمزور ہو چکے ہیں اور آج تک ہم نے اپنے ہر دشمن پر ثابت کیا ہے کہ ہم کمزور نہیں۔ ہمیں اطمینان ہے کہ تاتاری اگر پر لگا کر ہوا میں اُڑنے لگیں تو بھی ہم ان

پر غالب آئیں گے۔"

جب جلال الدّین کو اپنے باپ کا ارادہ بدلنے میں کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو اس نے کہا۔ "اگر آپ کا یہی ارادہ ہے تو میں درخواست کرتا ہوں کہ اس مہم پر مجھے روانہ کیا جائے اور آپ باقی فوج کے ساتھ ملک کے اندر رہیں۔"

خوارزم شاہ نے اپنے دور اندیش بیٹے کی یہ تجویز بھی رد کر دی اور اسے ملک کی حفاظت کا کام سونپ کر شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کر دی۔

جلال الدّین کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔۔۔۔ دو لاکھ مسلمانوں کے سیلاب کے سامنے تاتاریوں کے منتشر دستے چاروں اطراف سے سمٹ کر پیچھے ہٹنے لگے اور خوارزم شاہ اپنی طاقت کے نشے میں سرشار چند تجربہ کار سرداروں کے مشورے کے خلاف آگے بڑھتا گیا۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بعض مقامات پر تاتاریوں کی افواج معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلیں۔ تاتاریوں کی اس چال نے شاہ خوارزم کو خطرات سے اور

زیادہ بے پروا کر دیا۔ ایک صبح ایک وادی میں جس کے تین اطراف اُونچے پہاڑ اور ایک طرف گھنا جنگل تھا۔ خوارزم کی افواج کا تاتاریوں کے چند دوستوں سے تصادم ہوا۔ تاتاری مدافعانہ جنگ لڑتے ہوئے جنگل کی طرف بڑھتے گئے۔ اور باقی تین طرف کے کے پہاڑوں پر تاتاریوں کا ٹڈی دل لشکر نمودار ہونے لگا۔ خوارزم شاہ نے اپنی غلطی کا احساس اس وقت کیا جب چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس تنگ میدان میں تُرک نیزہ بازوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا۔ گھنے جنگل کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ تیروں کی بارش کے علاوہ تاتاریوں کے بے شمار دستے پہاڑوں سے نیچے اُتر کر خوارزم شاہ کی افواج میں تباہی مچا رہے تھے۔ اس تباہی سے بچنے کے لیے ترک افواج نے جنگل میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن یہاں بھی ہر درخت کے پیچھے ایک تاتاری تیر انداز موجود تھا۔ تیسرے پہر تک خوارزم کی افواج نے تاتاریوں سے تمام جنگل کو صاف کر دیا اور تاتاری پہاڑوں پر سے آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے۔ لیکن ترکوں کے نقصانات اس قدر زیادہ تھے کہ شام کے وقت خوارزم شاہ کی فوج کے افسر میدان میں لاشیں گننے کی

بجائے زندہ آدمیوں کی گنتی کر رہے تھے۔

اس تباہی کے بعد خوارزم شاہ کو اپنی رہی سہی افواج کے ساتھ آگے بڑھنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اور جب وہ واپس آ رہا تھا تو اسے راستے میں خبر ملی کہ شمال کی طرف سے تاتاریوں کا لشکر فوقند کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ فوقند کے حاکمِ اعلیٰ تیمور ملک نے یہ کہلا بھیجا کہ اس وقت میرے پاس پانچ ہزار سپاہی ہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ میں ایک مدّت تک تاتاریوں کا طوفان روک سکوں گا۔ لیکن اگر سلطان مجھے بیس ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دے تو ممکن ہے کہ عالمِ اسلام کے متعلق تاتاریوں کے ارادے ہمیشہ کے لیے بدل دوں۔

خوارزم شاہ گزشتہ جنگ میں غیر متوقع تباہی کے باعث اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ اس نے غصّے سے کانپتے ہوئے تیمور ملک کا خط پھاڑ ڈالا اور ایلچی سے کہا۔ ”اگر تیمور ملک یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہماری نسبت زیادہ تجربہ کار ہے تو وہ بیوقوف ہے۔“

لیکن بعض افسروں کے سمجھانے پر خوارزم شاہ نے تیمور ملک کو یہ پیغام بھیجا کہ میں بیس ہزار سپاہی بھیجنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے پانچ ہزار سپاہیوں سے تاتاریوں کو کب تک روک سکتے ہو۔"

(۲)

قوقند کے قید خانے میں طاہر کو دو مہینے گزر گئے۔ قید خانے کے داروغہ سے اس نے بارہا یہ درخواست کی کہ اُسے شہر کے حاکم اعلیٰ کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے ہر بار یہ جواب ملتا کہ جب انہیں فرصت ہو گی وہ خود بلائیں گے۔ طاہر نے داروغہ سے خط لکھنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے جواب دیا کہ جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہونے والوں کے لیے یہ سہولت مہیّا نہیں کی جا سکتی۔ طاہر کو کسی دوسرے قیدی سے ملنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ وہ قید خانے سے باہر دنیا کے تمام حالات سے بے خبر تھا۔ وہ بے قرار ہو کر دن میں کئی مرتبہ یہ سوچتا تھا۔ آخر مجھے اب تک کیوں نہیں بلایا گیا؟ قید خانے سے باہر کیا ہو رہا ہے؟ کیا تاتاریوں نے حملہ کر دیا ہے؟ حاکمِ اعلیٰ کو میرے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں ملی؟ کیا وہ

میرا بیان لیے بغیر مجھے عمر قید کی سزا دے چکے ہیں۔

ایک دن چند سپاہی اسے ننگی تلواروں کے پہرے میں قید خانے سے نکال کر فوقند کے گورنر تیمور ملک کے محل میں لے گئے۔ تیمور ملک ایک خوش وضع اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اس کی شجاعت اور شرافت کی داستانیں دور دور تک مشہور تھیں۔ اس نے نہایت اطمینان سے طاہر کی سرگزشت سُنی۔ طاہر نے اپنا بیان ختم کرنے کے بعد خوارزم کے سفیر کو وہ خط پیش کیا جس میں اس نے طاہر کی نیک نیتی پر اعتماد ظاہر کیا تھا۔ اس خط میں صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار کا بھی ذکر تھا۔

تیمور ملک نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد اپنی عقابی نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میری رائے کا تعلّق ہے میری رائے تمہارے خلاف نہیں۔ لیکن سلطانِ معظّم کا حکم ہے کہ اس قسم کے سارے مقدمات ان کے پاس بھیجے جائیں۔ تمہاری گرفتاری کی اِطّلاع اُن تک پہنچ چکی ہے اور میں ان کے حکم کا انتظار کر رہا ہوں۔“

طاہر نے کہا۔ ”مجھے قید میں دو مہینے گزر چکے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میں بہت جلد بغداد پہنچنا چاہتا ہوں، وہاں کے لوگوں کو صحیح حالات سے باخبر کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تاتاری آپ کی سلطنت پر کسی دن اچانک حملہ کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ بغداد کی مداخلت یہ حملہ روک سکے گی۔ اگر یہ نہ ہو سکا تو کم از کم خوارزم کی مدد کے لیے بغداد کے لوگوں کو منظّم کر سکوں گا۔ مجھے صرف چند دن کی رخصت دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بغداد کے لوگوں تک پیغام پہنچا کر آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔ ایک قیدی کی زبان سے ایسی درخواست آپ شاید مضحکہ خیز سمجھیں لیکن میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمانوں کی عزّت اور آزادی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ خدا کے لیے میرے وعدے پر یقین کیجیے۔ ورنہ کم از کم مجھے فوراً خوارزم شاہ کے پاس بھیج دیجیے۔“

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”نوجوان! تاتاریوں کے ساتھ ہماری جنگ

شروع ہو چکی ہے اور اب تک تو ہماری بدترین شکست کی خبر شاید بغداد بھی پہنچ چکی ہو۔ ممکن ہے کہ اسلام پر کفر کی پہلی فتح کی خبر سُن کر خلیفۃ المسلمین کے محل میں چراغاں بھی کیا جا چکا ہو۔ ان حالات میں مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر تم نیک نیّت ہو تو بغداد میں خلیفہ کا محل تمہارے لیے قوقند کے قید خانے سے زیادہ خطرناک ہو گا۔ انہوں نے تم سے جو کام لینا تھا، وہ لے چکے ہیں۔ اب شاید وہ تمہارے زندہ رہنے کی ضرورت محسوس نہ کریں، اور سلطانِ معظّم کے دل و دماغ پر تازہ شکست نے جو اثر کیا ہے، اس کے پیشِ نظر میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید وہ جاسوس کا لفظ سننے کے بعد تفصیلات میں جانا پسند نہ کریں۔"

شکست کی خبر سُن کر طاہر ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جسے نیند کی حالت میں سمندر میں پھینک دیا گیا ہو۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد اپنے حواس پر قابو پا کر کہا۔ "مجھے اپنی موت کی پرواہ نہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ میں معصوم ہوں۔ مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ موت سے پہلے اس غلطی کا کفّارہ ادا کر

سکوں اور بغداد کے بغیر میں یہ کفّارہ ادا نہیں کر سکتا۔ آپ کا اصلی مجرم وحید الدّین سابق وزیر خارجہ ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں چند دنوں تک اس کا سر آپ کے پاس پہنچاؤں گا اور میرا سر حاضر ہو گا۔"

تیمور ملک نے کہا۔ "ہمارے اصلی مجرم خلیفہ اور وزیر اعظم ہیں، وزیر خارجہ صرف ان کا آلہ کار ہوتا ہے۔ اگر تم ان کا سر لانے کا وعدہ کرو تو میں شاہد تمہاری آزادی کی کوئی تدبیر سوچ سکوں۔"

"نہیں نہیں۔" طاہر نے چلّا کر کہا۔ "وہ ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں ان کے خلاف ایسی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ جس دن عالمِ اسلام کے یہ ستون اس قدر کھوکھلے ہو جائیں گے، اس دن دنیا کا کوئی خطہ ہمارے لیے محفوظ نہ ہو گا۔ کیا آپ کے خیال میں وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ خوارزم تاتاریوں کے سیلاب کے سامنے آخری چٹان ہے۔ اگر یہ چٹان گر گئی تو بغداد تباہی سے نہیں بچ سکے گا؟"

تیمور ملک نے کہا۔ ”یا تم خود بے وقوف ہو یا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ اب تک خلیفہ کے کئی جاسوس پکڑے جا چکے ہیں؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”ان تمام سازشوں میں وزیر خارجہ کا ہاتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خلیفہ اور وزیر اعظم کو کسی بات کا علم نہ تھا۔“

تیمور ملک نے کہا۔ ”اگر تم نے ایسی ہی مستعدی سے سلطان المعظّم کے سامنے خلیفہ اور وزیر اعظم کی صفائی پیش کی تو مجھے یقین ہے کہ تم فوراً اپنے تین ساتھیوں سے جا ملو گے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں اپنی جان کے خوف سے کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے لیے تیّار نہیں۔“

تیمور ملک اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایک فوجی افسر نے اندر آکر اطلاع کی کہ سلطان معظّم کا ایلچی ملاقات کی اجازت چاہتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک ترک افسر اندر داخل ہوا اور اس نے تیمور ملک کو ایک خط پیش کیا۔ تیمور ملک نے خط پڑھنے کے بعد پہلے ایلچی اور پھر طاہر

کی طرف دیکھا اور انتہائی مغموم آواز میں کہا۔ ”تمہارے متعلّق سلطانِ معظّم کا حکم آگیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب میرے بس میں کچھ نہیں۔ تم یہ پڑھ سکتے ہو۔“

تیمور ملک نے خط طاہر کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اس نے آگے بڑھ کر خط لینے کی بجائے کہا۔ ”اس خط کی تحریر میں آپ کے چہرے سے پڑھ سکتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں کب تک زندہ ہوں؟“

”کل تک!“ تیمور ملک نے یہ کہہ کر سر جھکالیا۔

طاہر کے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ تیمور ملک نے تھوڑی دیر بعد گردن اُوپر اٹھائی۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں:

”نوجوان! مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے لیکن میں بے بس ہوں۔“

طاہر نے کہا۔ ”اگر یہ فیصلہ آخری ہے تو کیا میں ایک باعزّت موت کی توقع رکھ سکتا ہوں؟“ تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”سلطانِ معظّم کا حکم ہے

کہ تمہیں لوگوں کے سامنے پھانسی پر لٹکایا جائے!"

تیمور ملک کوئی اور بات کیے بغیر اُٹھ کر محل کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

(۳)

طاہر کی ننگی تلواروں کے پہرے میں محل سے باہر نکالا گیا۔ دروازے کی سیڑھیوں کے نیچے لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ لوگ طاہر کو دیکھتے ہی انتقامی جذبے کے تحت نعرے لگانے لگے۔ قوم کا غدّار، خلیفہ کا جاسوس، دشمنِ اسلام، پکڑلو، مار ڈالو۔ سپاہی ہجوم کا اشتعال دیکھ کر دروازے میں رک گئے۔ ہجوم میں سے چند نوجوان نکل کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگے لیکن سپاہیوں نے انہیں تلواروں اور نیزوں سے ڈرا دھمکا کر روک دیا۔ تاہم ہجوم کا اشتعال ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ کسی نے پتھّر پھینکا لیکن یہ پتھّر طاہر کو لگنے کی بجائے ایک سپاہی کے ماتھے پر لگا اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر دبا کر بیٹھ گیا۔ چند اور پتھر اور تین چار سپاہی زخمی ہو گئے۔ ایک فوجی افسر نے

آگے بڑھ کر یہ کہنے کی کوشش کی اس کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہے لیکن اس کی آواز لوگوں کے نعروں میں دب گئی اور ایک پتھّر کھانے کے بعد اس نے چلّا کر کہا۔ ”قیدی کو محل میں واپس لے جاؤ اور دروازہ بند کر دو!“

لیکن طاہر نے پہرے دار کی ننگی تلواروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”مسلمانو! ایک غدّار اور جاسوس کے خلاف نفرت کا یہ جذبہ تم میں زندگی کا ثبوت ہے۔ لیکن تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میری موت کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ مجھے کل تمہارے سامنے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور اس کے بعد میرا مقدمہ ایک بڑی عدالت میں پیش ہو گا جہاں ہر مظلوم دادرسی کی توقع رکھتا ہے۔“

لوگوں کا شور کم ہو رہا تھا اور وہ نفرت اور حقارت کے جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود طاہر کی زبان سے کُچھ سننا چاہتے تھے۔ لیکن ایک سپاہی نے طاہر کی گردن پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کا کوئی حق نہیں۔“ کسی نے پیچھے سے آ کر سپاہی کا ہاتھ

پکڑ لیا۔ سپاہی نے مڑ کر دیکھا تو اس کے سامنے تیمور ملک کھڑا تھا۔ تمام سپاہی ادب و احترام کے ساتھ گورنر کی طرف دیکھنے لگے۔

ایک لمحے کے بعد لوگوں کی آوازیں پھر آہستہ آہستہ بُلند ہونے لگیں۔ تیمور ملک نے آگے بڑھ کر ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ "سلطانِ معظّم کے حکم سے اس شخص کو کل تمہارے سامنے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کیا ایک شخص جو صرف ایک دِن کا مہمان ہے تمہاری طرف سے بہتر سلوک کا حق دار نہیں؟"

تیمور ملک پہرے داروں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ لوگوں نے فوراً اِدھر اُدھر سمٹ کر راستہ چھوڑ دیا۔ سپاہی طاہر کے گرد حلقہ باندھ کر اس کے ساتھ چل دیے۔ چند قدم چلنے کے بعد تیمور ملک رُک کر ہجوم سے مخاطب ہوا۔

"میں بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے پار تاتاریوں کے دستے دیکھے گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ جنوب کے اور شہروں کی طرح وہ قوقند پر بھی اچانک

حملہ نہ کر دیں۔ اس لیے نعرے لگانے کا وقت نہیں۔ تلواریں تیز کرنے کا وقت ہے۔ تم نے میرے دو سپاہیوں کو زخمی کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرے پاس زیادہ سپاہی نہیں۔ اب اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم راستے میں سپاہیوں کو تنگ نہیں کرو گے تو میں واپس جا کر زیادہ اہم امور پر توجہ دے سکوں گا، ورنہ مجھے قید خانے تک ان کے ساتھ جانا پڑے گا۔" ایک نوجوان نے بلند آواز میں کہا۔ "بھائیو! یہ کیا حماقت ہے۔ ہم ایسے نازک موقع پر اپنی محبوب حاکم کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اب تمہاری تسلّی ہو چکی ہے کہ مجرم کو عبرتناک سزا ملے گی۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟ چلو یہاں سے!"

لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منتشر ہونے لگے۔ تیمور ملک نے محل کی طرف لوٹتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔ "قیدی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ شمال کی سرد ہوا سے طاہر کا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اپنی پوستین اُتار کر طاہر کے کندھوں پر ڈال دی۔

طاہر نے اس کی طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھا اور پوستین اتار کر واپس کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ! ایک دن کے مہمان کو اس کی ضرورت نہیں۔"

(۴)

اگلے دن برف باری سے قوقند کے بازاروں میں ردائے سیمیں بچھی ہوئی تھی۔ طاہر قید خانے سے باہر ایک چبوترے کے اوپر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس سے دو قدم آگے پھانسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ ارد گرد کھلے میدان میں برف باری کے باوجود سینکڑوں آدمی جمع تھے۔

موت کو اس قدر قریب دیکھنے کے باوجود طاہر کے چہرے پر ایک غیر معمولی سکون تھا۔ قید خانے کے داروغہ کا اشارہ پا کر جلّاد چبوترے کے اُوپر چڑھا اور اس نے پھانسی کا پھندا ہاتھ میں لیتے ہوئے آگے بڑھ کر طاہر کو لکڑی کے تختے پر کھڑا ہونے کے لیے اشارہ کیا۔ طاہر نے تختے پر چڑھ کر

اِدھر اُدھر دیکھا۔ تماشائیوں میں اب وہ پہلا سا جوش و خروش نام کو نہ تھا۔ جلّاد نے پھانسی کا پھندا طاہر کے گلے میں ڈال دیا۔ قید خانے کے داروغہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے۔ اگر کوئی ایسی خواہش ہو جسے ہم پورا کر سکتے ہوں تو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو اس سوال کا جواب پہلے دے چکا ہوں۔ ایسے موقعوں پر خدا پرست انسانوں سے توقعات وابستہ نہیں کیا کرتے۔ میں نے جو کچھ مانگتا تھا، خدا سے مانگ چکا ہوں۔ اگر میری دعائیں مستجاب نہیں ہوئی تو تم میرے لیے کُچھ نہیں کر سکتے۔“

داروغہ نے لاجواب سا ہو کر کہا۔ ”پھر بھی اگر تم بغداد میں کسی عزیز کو کوئی پیغام دینا چاہو تو شاید ہم کوئی بندوبست کر سکیں۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”خدا اور رسول کا نام لینے والا میرا عزیز ہے۔ اور میں ہر ایک کو ایک ضروری پیغام دینا چاہتا تھا۔ خدا کو اگر مجھ سے کام لینا منظور ہے تو مجھے یقیناً موقع دے گا ورنہ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد وہ کسی بہتر

انسان کو اس مقصد کے لیے منتخب کرے گا۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ وہ پیغام کیا ہے؟"

"وہ پیغام یہ ہے کہ اس وقت کفر اسلام کے خلاف اپنی ساری طاقتیں منظّم کر رہا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دین کی حفاظت کے لے منظّم اور متحد ہو جائیں!"

داروغہ نے کہا۔ "اب صرف چند لمحات باقی ہیں۔ تم کوئی دُعا مانگنا چاہتے ہو تو مانگ لو۔"

طاہر نے سفیدی مائل بادلوں میں چھُپے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور وُہ دُعا جسے وہ رات کے وقت کئی بار دہرا چکا تھا۔ ایک بار پھر دہرانے لگا۔ "میرے اللہ! کیا میں تیرے دین کے کسی کام نہیں آ سکتا؟ میں نے تیری راہ میں جہاد کی نیّت سے نیزوں اور تلواروں سے کھیلنا سیکھا تھا۔ کیا میرے مقدر میں ایک کریہہ موت کے سوا کُچھ نہیں؟ میں نے صلاح الدّین ایوبی کی تلوار کا حق بھی ادا نہیں کیا! میرے مولا! انسانوں کے غلط فیصلے منسوخ

کرنا تیری قدرت سے بعید نہیں!"

جلّاد نیچے سے تختہ کھینچنے کے لیے داروغہ کے اشارہ کا منتظر تھا۔

تماشائیوں میں سے اب بعض ایسے بھی تھے جو طاہر کی طرف غصّے یا بے اعتنائی کی بجائے ہمدردی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

اچانک شہر کی طرف سے لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ چند سوار گھوڑے بھگاتے ہوئے آئے اور اُن میں ایک نے بلند آواز میں کہا۔ "تاتاری آ رہے ہیں۔ شہر کی حفاظت کے لیے تیّار ہو جاؤ!"

اس اعلان نے ایک لمحے کے لیے لوگوں کو مبہوت کر دیا اور دوسرے لمحے وہ تاتاری آ رہے ہیں! تاتاری آ رہے ہیں! کہتے ہوئے اپنے گھروں کا رُخ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب داروغہ کے حواس درست ہوئے اور اسے اپنے فرض کا دوبارہ خیال آیا تو میدان خالی ہو چکا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد جلّاد کو تختہ کھینچیے کا اشارہ کیا تو ایک طرف سے کسی نے بارعب

آواز میں کہا۔ ''ٹھہرو!''

تیمور ملک کی آواز پہچان کر داروغہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تیمور ملک گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے ساتھ چند اور سپاہی بھی تھے۔ وہ چبوترے کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اُترا اور چبوترے پر چڑھ کر طاہر کی گردن سے پھندا اُتارنے کے بعد اپنے خنجر سے طاہر کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ طاہر نے جلدی سے سوال کیا۔ ''تاتاری کتنی دور ہیں؟''

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ''کوئی دس کوس کے فاصلے پر۔ تمہارے پاس شہر سے نکل جانے کے لیے کافی وقت ہے۔''

''کہاں جانے کے لیے؟'' طاہر نے اِطمینان سے سوال کیا۔

''بغداد کی طرف۔ تم بغداد ہی جانا چاہتے تھے نا؟''

''نہیں۔ اب بغداد کی نسبت یہاں زیادہ کام ہے۔''

''بہت اچھا۔ تم میرے ساتھ چلو۔'' تیمور ملک نے یہ کہہ ایک سپاہی کو اپنا

گھوڑااور تلوار طاہر کے سپرد کرنے کا حکم دیا۔

(۵)

خوارزم شاہ کی پہلی شکست کے بعد سرحد کے اور بہت سے شہروں کی طرح قوقند کی آبادی کا بہت سا حصّہ مغرب کے شہروں کی طرف ہجرت کر چکا تھا۔ اس کے بعد جب تیمور ملک کو سلطان نے مزید سپاہی دینے سے انکار کر دیا تو اس نے رہے سہے لوگوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچّوں، بوڑھوں اور عورتوں کو شہر سے نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا دیں۔ لیکن اس کے باوجود قوقند کی آبادی کا قریباً تیسرا حصّہ ابھی تک شہر میں موجود تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ خوارزم شاہ کی شکست کا باعث اس کی فوج کی کمزوری کی بجائے پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز سے ناواقفیت تھی اور تاتاری اپنی فتح کے باوجود قوقند کی طرف بڑھنا پسند نہیں کریں گے۔ لیکن تاتاریوں کے سرحد عبور کرنے کی خبر سے شہر کے لوگوں میں افراتفری پھیل گئی اور وہ اپنی عورتوں اور بچّوں کو ساتھ لے کر برف باری کے طوفان کے باوجود اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ تیمور ملک کی فوج نے آس

پاس کی پہاڑیوں میں مورچے بنا کر تاتاری فوج کے ہر اول دستے کو تین دن تک قوقند سے دور رکھا۔ حملہ آور تاتاریوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ ان تین دن کے معرکوں میں تیمور ملک کے جانبازوں نے جان توڑ حملوں سے کئی دفعہ تاتاریوں کو پیچھے دھکیلا لیکن ان کی کثرت کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ چوتھے روز جب تیمور ملک کے ساتھ صرف ایک ہزار جاں نثار رہ گئے، اسے جاسوسوں نے خبر دی کہ چنگیز خان کا بیٹا روچی سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔

اب ملک کی آخری جائے پناہ دریا کے درمیان ایک ٹاپو تھا جس کی حفاظت کے انتظامات وہ کئی ماہ پیشتر کر چکا تھا۔ کسی زمانے میں قوقند کے حکمران اور اُونچے طبقے کے لوگ اسی ٹاپو میں رہتے تھے۔ قدیم قلعہ اور چند اُجڑی ہوئی عمارات اب تک موجود تھیں۔ تیمور ملک نے رات کے وقت اپنی فوج اور شہر کے رہے سہے باشندوں کو جو اس کے ساتھ جینا اور مرنا قبول کر چکے تھے، کشتیوں کے ذریعے اس ٹاپو پر اتار دیا اور چند سواروں کو

خوارزم کے پاس کمک بھیجنے کی آخری درخواست کے ساتھ روانہ کر دیا۔

ٹاپو کے قریب دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا تھا کہ دونوں کناروں سے حملہ آوروں کی کمان سے نکلے ہوئے تیر مشکل سے یہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ تیمور ملک نے چند ماہ کے لیے سامانِ رسد بھی اس ٹاپو پر جمع کر رکھا تھا۔ روچی نے محسوس کرتے ہوئے کہ یہ ٹاپو جلد فتح نہیں ہو سکے گا۔ یہ مہم اپنے ایک نائب کے سپرد کر دی اور آدھی فوج اس کی قیادت میں دے کر خود باقی فوج کے ساتھ جنوب مغرب کا رُخ کیا۔

تاتاری قرب وجوار کی تمام آبادیوں کے باشندوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے آئے اور انہیں دریا کے کنارے سے ٹاپو کے سرے تک پتھروں سے راستہ بنانے کے کام پر لگا دیا۔ ہزاروں بچے، بوڑھے عورتیں اور مرد تاتاریوں کی ننگی تلواروں کے پہرے میں پتھر اُٹھا کر لاتے اور دریا میں پھینک دیتے۔ دریا کے کنارے سے پتھروں کا یہ راستہ آہستہ آہستہ ٹاپو کی طرف بڑھنے لگا۔ تیمور ملک نے اس خطرے کو فوراً محسوس کیا۔ اس نے چند بڑی بڑی کشتیوں کے گرد لکڑی کے تختوں کے مورچے

بنوائے اور ان کے اندر اپنے بہترین تیر انداز بٹھا کر کنارے پر جمع ہونے والے تاتاریوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں سے شروع شروع میں تاتاریوں کا بہت نقصان ہوا۔ بعض اوقات ان کے خوف سے راستے کی تعمیر کے لیے پتھر اُٹھانے والے لوگ تاتاریوں کو کشتیوں پر حملے کرنے والوں کی طرف متوجہ پا کر اچانک ان پر پتھروں کی بارش شروع کر دیتے۔ اور اس کے بعد زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر دریا میں چھلانگیں لگا دیتے۔ کسی کی جان حملہ آوروں کی کشتیوں کے باعث بچ جاتی اور کوئی تیر کر جزیرے تک جا پہنچتا لیکن اکثر دریا کی موجوں یا تاتاریوں کے تیروں کا شکار ہو جاتے۔

ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے تاتاری کشتیوں کے خلاف منجنیقیں استعمال کرنے لگے جن سے پتھروں کی بجائے وہ کھولتے ہوئے تیل یا جلتی ہوئی گندھک کی ہانڈیاں پھینکتے اور کشتیوں کو آگ لگا دیتے۔ تیور ملک نے اس نئے حربے کا مقابلہ کرنے کے لیے کشتیوں پر چھتیں ڈلوا دیں اور ان کے اوپر مٹی کا پلستر کرا دیا اور اندر بیٹھنے والے تیر اندازوں کے لیے

چھوٹے چھوٹے سوراخ چھوڑ دیے لیکن مدافعت کی ان تمام کوششوں کے باوجود تاتاریوں کی بے شمار فوج کے سامنے تیمور ملک کی کوئی پیش نہ گئی اور دریا کے کنارے سے ٹاپو کی طرف راستہ بڑھتا گیا۔

علاؤ الدّین محمد خوارزم شاہ تاتاریوں سے پہلی شکست کے بعد اس قدر بد دل ہو چکا تھا کہ اس نے تیمور ملک کے متعدد پیغامات کے باوجود کوئی کمک نہ بھیجی بلکہ اُسے یہ حکم دیا کہ وہ ٹاپو کی مدافعت کا خیال چھوڑ کر اس سے آ ملے۔ لیکن تیمور کی غیرت نے اپنے ساتھیوں کو مُصیبت میں چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ جب راستہ ٹاپو کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ تاتاری ٹاپو کے مورچوں پر منجنیق سے پتھر اور آتش گیر مادہ پھینک سکتے تھے تو تیمور ملک کے لیے ٹاپو خالی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

(٦)

ایک شام تیمور ملک نے اپنے ساتھیوں کو جزیرہ خالی کرنے کی تیّاری کا حکم دیا۔ رات کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ تیمور ملک کے تمام

ساتھی کشتیوں کے بیڑے پر سوار ہو کر زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ تیمور ملک نے بادلوں کے باعث رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی کو اپنے لیے تائید غیبی سمجھا تھا لیکن بارش ہونے کے بعد جب بجلی بھی چمکنے لگی تو اُسے خدشہ ہونے لگا کہ اگر کنارے کی چوکیوں کے تاتاری باخبر ہو گئے تو اسے بہت بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آدھی رات کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کا خدشہ غلط نہ تھا۔ بجلی کی چمک میں اسے دونوں کناروں پر تاتاری سواروں کے دستے دکھائی دیے۔ تھوڑی دور آگے جا کر ان کے ہمراہ سپاہیوں کی ایک اچھی خاصہ تعداد دکھائی دی۔ تیمور ملک کی کشتی پر اس کی فوج کے چیدہ چیدہ افسر سوار تھے۔ اس نے ان کا مشورہ طلب کیا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ گھنے جنگل میں پہنچ کر کشتیاں کنارے لگا دی جائیں۔ تاریکی میں اگر تاتاریوں سے مقابلہ ہوا بھی تو بعض آدمیوں کو چھُپ کر اِدھر اُدھر بھاگ جانے کا موقع مل جائے گا۔ تیمور ملک نے سب کی رائے سُننے کے بعد کہا۔ ”طاہر اب تک خاموش ہے۔ میں اس کی رائے بھی سُننا چاہتا ہوں۔“ کشتی کے کونے سے جواب ملا۔ ”میرے خیال میں ہمارے لیے دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم

کنارے پر کسی جگہ پاؤں جما کر آخری دم تک لڑیں۔ جنگل ہو یا میدان۔ یہ تمام علاقہ تاتاریوں سے پٹا پڑا ہے اور ہمارے لیے بھاگنے کے راستے بہت کم ہوں گے۔ ایسی صورت میں میں اگر ایک جان کے بدلے دو نہیں تو ایک جان لینے کا قائل ہوں۔ اگر کسی ایک جگہ دریا کے کنارے اترنے کے بعد اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے دشمن کے تیروں کا شکار ہونا ہے تو بہتر یہی ہے کہ ہم ان کے تیر پیٹھ پر کھانے کی بجائے سینے پر کھائیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہر ایک یا آدھ کوس پر ایک کشتی پیچھے چھوڑ دی جائے۔ اور جب دوسری کشتیاں آگے جائیں تو اس کے سوار اترتے جائیں اور خالی کشتی کو پانی میں دھکیلتے جائیں۔ تاتاری یقیناً باقی بیڑے کے ساتھ چلتے رہیں گے اور پیچھے رہنے والی کشتیوں کے سواروں کو جان بچانے کا موقع مل جائے گا۔ تعاقب کرنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے ہم بیڑے پر سے بجلی کی روشنی میں تیر چلاتے رہیں گے۔ اس صورت میں طلوعِ سحر تک ہمیں اِدھر اُدھر بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ آخری چند آدمیوں کو شاید اپنی کشتیاں کنارے تک لگانے کا وقت نہ ملے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ بہترین تیر اک ہوں۔"

طاہر کی دوسری تجویز کے ساتھ سب نے اتفاق کیا لیکن تیمور ملک نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ خالی کشتی جب دریا میں دھکیلی جائے گی تو ممکن نہیں وہ باقی بیڑے کی طرح منجدھار میں چلتی رہے۔ بیڑے کی تعداد برقرار رکھنے کے لیے اسے بیڑے کے ساتھ شامل کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے باقی بیڑے کی رفتار کم کی جا سکتی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کنارے سے دور رہے اور کشتی خالی ہونے کی صورت میں یہ دونوں باتیں مشکل ہیں۔ تھوڑی دیر کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ہر کشتی پر ایک رضاکار ایسا ہو جسے تیرنا آتا ہو اور جو سواریوں کو کنارے پر اُتار کر خالی کشتی لے آئے۔

بارش تھم چکی تھی۔ بادلوں کی پھٹی ہوئی سیاہ چادر میں سے کہیں کہیں ستارے جھانک رہے تھے۔ ایک گھنے جنگل میں پہنچ کر پہلی کشتی کو پیچھے چھوڑ دیا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کشتی اپنی سواریوں کو کنارے پر چھوڑ کر بیڑے سے آملی اور اس میں سوار ہونے والے رضاکار نے اپنے ساتھیوں کے بچ نکلنے کا یقین دلایا تو دوسری کشتی پیچھے چھوڑ دی گئی۔

رات کے آخری پہر پیڑے کی کشتیوں پر صرف تیس رضا کار سوار تھے اور باقی کناروں پر اُتر چکے تھے۔ کناروں پر تعاقب کرنے والے تاتاری سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بدستور آرہی تھی۔ تیمور ملک نے رضا کاروں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یکے بعد دیگرے دریا میں کود کر کنارے پر پہنچنے کا حکم دیا اور جب تمام کشتیاں خالی ہوئیں تو اس نے اپنے آخری ساتھی سے جو اس کشتی میں سوار تھا کہا۔

”طاہر! اب وقت ضائع نہ کرو۔ کشتیاں منتشر ہو رہی ہیں، ان میں سے کوئی کنارے جا لگی تو تاتاری باخبر ہو جائیں گے۔ اب جلدی کرو۔ اگر تم تیرنا نہیں جانتے تو ایک کشتی کنارے پر لگالو!“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں تیرنا جانتا ہوں لیکن آپ؟“

تیمور ملک نے مغموم آواز میں کہا۔ ”مجھے ڈوبتے ہوئے جہاز کے ملّاح کا فرض ادا کرنے دو۔ جب تم کنارے پر جاؤ گے تو میں بھی اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔“

طاہر کو تذبذب کی حالت میں دیکھ کر تیمور ملک نے کہا۔ ”میں حکم عدولی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جلدی کرو۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کرتا، لیکن میری ایک خواہش ہے۔“

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”میں اب کسی خواہش کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو۔ لیکن وقت ضائع نہ کرو۔ اب پو پھٹنے والی ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ وعدہ کریں کہ اس کے بعد اگر زندگی میں کبھی مجھے آپ سے کوئی درخواست کرنے کا موقع ملے تو آپ اسے رد نہیں کریں گے۔“

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”تم اپنے آپ کو ایسے وعدے کا حق دار ثابت کر چکے ہو۔ جاؤ میں ایک کی بجائے تمہاری دو درخواستیں قبول کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

طاہر خدا حافظ کہ کر آہستہ سے پانی میں اُترا اور کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ رات بھر کی سردی اور بے آرامی سے اس کا جسم شل ہو رہا تھا۔ دریا کا پانی نا قابلِ برداشت حد تک ٹھنڈا تھا۔ وہ جوں توں کر کے کنارے پر پہنچا تو اسے ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ چند سوار کنارے پر سے گزر رہے تھے۔ طاہر کنارے پر گرے ہوئے ایک درخت کی جڑ پکڑ کر کچھ دیر پانی میں چھپا رہا اور جب یہ سوار گزر گئے تو اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن اب اسے پیادہ سپاہیوں کے چند دستے دکھائی دیے۔ طاہر کا جسم بالکل سُن ہو چکا تھا۔ جب وہ بھی گزر گئے تو ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر اُسے پھر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ طاہر کی قوّت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا، ایک درخت کے تنے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کنارے پر گھنے درختوں اور تاریکی کی وجہ سے تاتاری یکے بعد دیگرے منتشر اور غیر منظم صورت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

طاہر نے کچھ سوچ کر نیام سے تلوار نکال لی۔ جب پندرہ بیس سوار گزر گئے تو اُسے کنارے سے ایک طرف زیادہ گھنے درختوں کے درمیان ایک

گھوڑے کی آہٹ سُنائی دی۔ وہ درختوں کی شاخوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا دبے پاؤں آگے بڑھا۔

سوار اپنے ساتھیوں کو آوازیں دے رہا تھا اور اس کے جواب میں وہ اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ طاہر نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور جس طرف سوار کے گھوڑے کا رُخ تھا۔ اس طرف بڑھ کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک ثانیے کے بعد طاہر کا ایک ہاتھ گھوڑے کی باگ پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی تلوار سوار کو موت کے گھاٹ اُتار چکی تھی۔ طاہر نے جلدی سے نیچے گر کر تڑپتے ہوئے تاتاری کی ٹوپی اور پوستین اُتار کر پہن لی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا اور دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

(۷)

صُبح کے آثار نمودار ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ تیمور ملک اپنی کشتی چھوڑ کر پانی میں تیرتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا تو اسے درخت کی آڑ سے

آواز سنائی دی۔ ”تیمور!“

اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور فوراً تلوار نیام سے نکال کر خطرے کے مُقابلے کے لیے تیّار ہو گیا۔

درخت کی آڑ سے پھر کسی نے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں طاہر!“

تیمور ملک جلدی سے درخت کے قریب پہنچا۔ طاہر گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ تیمور ملک نے جلدی سے کہا۔ ”گھوڑا حاصل کر لینے کے بعد بھی تم یہاں کھڑے ہو؟“

طاہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ گھوڑا آپ کے لیے ہے۔ اب جلدی کریں۔“

تیمور نے جواب دیا۔ ”میں اپنے مقدر کی دلدل سے نکلنے کے لیے کسی کی لاٹھی چھیننا نہیں چاہتا۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”آپ میری دو درخواستیں قبول کرنے کا وعدہ کر

چکے ہیں اور یہ پہلی درخواست ہے۔"

تیور ملک نے لاجواب سا ہو کر کہا۔ "یہاں بحث کرنا ٹھیک نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

طاہر اپنے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھامے تیمور کے ساتھ چل دیا۔ کنارے سے کوئی تین سو گز دور پہنچ کر تیمور رُکا اور کہنے لگا۔ "کیا مجھ سے وعدہ لیتے وقت تمہاری نیّت یہی تھی؟"

"ہاں!"

"تمہیں یقین تھا کہ تمہیں گھوڑا مل جائے گا اور تم مجھے پیش کرو گے؟"

"یہ میرا ارادہ تھا، خدا کا شکر ہے کہ پورا ہوا۔"

تیمور ملک نے طاہر کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑی اور اس پر سوار ہو کر کہا۔ "تم میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "اس طرح ہم دونوں رہ جائیں گے۔"

تیمور ملک نے کہا۔ ”خدا پر اس قدر بھروسہ رکھنے والے انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ شاید تمہاری وجہ سے میں بھی بچ جاؤں۔ جلدی کرو تاتاریوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ شاید انہوں نے خالی کشتیاں دیکھ لی ہیں۔“

طاہر فوراً تیمور ملک کے پیچھے بیٹھ گیا۔ کوئی دو کوس جنگل عبور کرنے کے بعد پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ طاہر نے گھوڑے کی تھکاوٹ محسوس کر کے چند بار اُترنے کی خواہش ظاہر کی لیکن تیمور ملک نے ایک نہ سُنی۔

سورج کی پہلی شعاع کے ساتھ ایک تنگ گھاٹی سے گزرتے ہوئے طاہر نے پیچھے ہو کر دیکھا تو تاتاری سواروں کا ایک گروہ سرپٹ آتا ہوا دکھائی دیا۔

طاہر نے کہا۔ ”وہ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے اُتار دیجیے۔ میں اس گھاٹی پر انہیں روک سکتا ہوں۔ آپ کو بچ نکلنے کا موقع مل جائے گا۔“

تیور ملک نے گھوڑا روکے بغیر پوچھا۔ ”وہ کتنے ہیں؟“

”سات“

”تو میں بھی تمہارے ساتھ اُتر تا ہوں۔“

”لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے پیچھے لشکر نہیں ہو گا؟“

”یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ میری دو درخواستیں پورا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں اور میری دوسری درخواست ہے کہ آپ مجھے اتار دیں۔“

”لیکن میں اپنے لیے تمہارے اس ایثار کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”خوارزم تاتاریوں کے سیلاب کے سامنے آخری چٹان ہے اور اس چٹان کو آپ جیسے محافظ کی ضرورت ہے۔ میں آپ پر احسان نہیں کرتا عالمِ اسلام کی ایک خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ خوارزم شاہ کو چند بزدل مُشیروں نے ناکارہ بنا دیا ہے۔ آپ اس میں زندگی کی روح

پھونک سکتے ہیں۔" تیمور ملک نے جواب دیا۔ "میں صرف سپاہی ہوں۔ تلوار سے کاٹنا جانتا ہوں۔ قوم میں زندگی کی روح پھونکنا تم جیسے لوگوں کا کام ہے۔ تم جاؤ۔ میں گھوڑے سے اُتر کر ان کا راستہ روکتا ہوں۔"

طاہر نے کہا۔ "اپنا وعدہ نہ بھولیے۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ ہم ایک بار پھر ملیں گے۔" طاہر یہ کہہ کر بھاگتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اُتر گیا۔ تیور ملک نے گھوڑا روک لیا اور کہا تمہارے ترکش میں کتنے تیر ہیں؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "پانچ۔"

تیمور ملک نے اپنا ترکش اُتار کر اس کی طرف پھینک دیا اور کہا۔ "چھ سات اس میں بھی ہوں گے۔ کاش خوارزم کی فوج میں تمہارے جیسے پانچ سو سپاہی اور ہوتے؟"

تیمور ملک نے گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا اور طاہر تنگ گھاٹی کے موڑ کے قریب چند گز پہاڑی کے اوپر چڑھ کر ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

(۸)

جب پہلا سوار گھاٹی کے موڑ پر گزر کر چند گز آگے نکل گیا تو طاہر نے تیر چلا دیا اور وہ تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے گر پڑا۔ اتنی دیر میں دوسرا سوار موڑ نکل کر طاہر کے تیر کی زد میں آ چکا تھا۔ طاہر کا دوسرا تیر بھی نشانے پر لگا لیکن تین اور سوار ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ طاہر نے ان میں سے ایک کو گرا لیا تو باقی دو گھوڑے روک کر مُڑنے کی کوشش کی لیکن اوپر سے یکے بعد دیگرے دو تیر آئے اور ایک تاتاری زخمی ہو کر گر پڑا۔ دوسرے نے اپنے گھوڑے کی پناہ لے کر جان بچائی۔ اور بلند آواز سے پیچھے آنے والے ساتھیوں کو باخبر کر دیا۔ جب تک طاہر نے دوسرا تیر چڑھایا تاتاری گھوڑے سے کود کر ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ چکا تھا اور بدستور بلند آواز سے پیچھے آنے والے ساتھیوں کو پکار رہا تھا۔

طاہر اپنا مورچہ چھوڑ کر پتھروں کی آڑ لیتے ہو پہاڑی کے اوپر سے کھائی کے موڑ کی دوسری طرف جا پہنچا۔ نیچے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر دو سوار گھوڑے روک کر موڑ کے دوسرے سرے سے پکارنے والے

ساتھی کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ طاہر پتھر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

یہ دونوں سوار ایک دوسرے سے تاتاری زبان میں کچھ کہنے کے بعد گھوڑوں سے اتر پڑے اور انہیں ایک جھاڑی سے باندھنے کے بعد دونوں پہاڑی کی ایسی ڈھلوان پر پہنچ چکے تھے جس پر چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اچانک طاہر کی کمان سے یکے بعد دو تیر نکلے وہ دونوں لڑھکتے ہوئے کئی گز نیچے چلے گئے۔ طاہر پتھر کی آڑ سے سر نکال کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے ایک متحرک سایہ دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اپنے جسم میں ایک کپکپاہٹ محسوس کی۔ دائیں ہاتھ چار پانچ قدم کے فاصلے پر ایک تاتاری ہاتھ میں تلوار لیے اس پر کودنے والا تھا۔

طاہر جلدی سے کمان پھینک کر اٹھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تلوار کے قبضے تک نہ پہنچا تھا کہ تاتاری نے جست لگا کر اس پر وار کر دیا۔ طاہر اچانک ایک طرف جھکا اور تاتاری کی تلوار اس کے جسم کے ساتھ مس کرتی ہوئی پتھر سے جا ٹکرائی۔ تاتاری کے دوسرے وار سے پہلے طاہر ایک طرف کود کر اپنی تلوار نیام سے نکال چکا تھا۔

چند بار دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں اور تاتاری اپنے حریف کو خطرناک سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس نے چند بار پاؤں جما کر لڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی پیش نہ گئی۔ چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر طاہر کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے ایک کھڈ میں جا گرا۔ طاہر ایک لمحہ کے توقف کے بغیر پہاڑی سے اترا اور جھاڑی کے ساتھ بندھے ہوئے دو گھوڑوں میں سے ایک پر سوار ہو گیا۔ جب وہ موڑ پر سے گزر رہا تھا تو اس کے تیروں سے زخمی ہونے والے تاتاریوں میں سے ایک نیم بسمل اپنا سر پتھر کے ساتھ پٹخ رہا تھا۔ طاہر نے گھوڑے سے اُتر کر اس کے ترکش سے تیر نکال کر اپنے ترکش میں ڈال لیے اور پھر سوار ہو گیا۔

طاہر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا وادیوں اور پہاڑوں سے گزر رہا تھا۔ بعض دشوار گزار پہاڑوں میں اسے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کرنا پڑی۔ راستے کے متعلق اسے کُچھ علم نہ تھا۔ پہاڑی ندیوں میں پانی کی کمی نہ تھی لیکن وہ بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ رات بھر کی سردی نے اس کے

اعضاء شل کر دیے تھے اور اب صبح کی دھوپ کے باوجود سرد ہوا کے جھونکے ناقابلِ برداشت تھے۔ راستے میں چند ایسی بستیاں آئیں جہاں جلے ہوئے مکانات اور عورتوں، مردوں اور بچوں کی بے گور و کفن لاشیں تاتاریوں کی بربریت کی شہادت دے رہی تھیں۔

دوپہر کے وقت طاہر ایک وسیع میدان میں سے گزر رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور سردی ہر لحظہ زیادہ ہو رہی تھی۔ تیسرے پہر برف گرنے لگی۔ طاہر کا گھوڑا قریباً جواب دے چکا تھا اور گردن ڈھیلی چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ برف کے طوفان میں طاہر کو معلوم نہ تھا کہ اس کا رُخ کس طرف ہے لیکن اس نے رُکنے کی بجائے آگے بڑھنا مناسب سمجھا۔ عصر کے وقت گھوڑے نے برف پر گر کر دم توڑ دیا۔

طاہر نے بمشکل کوئی دو کوس راستہ پیدل طے کیا اور اس کی قوّت برداشت جواب دے گئی۔ برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا اور رات سر پر کھڑی تھی۔ طاہر کے دماغ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ برف پر لیٹ کر سو جائے لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ نیند اس کی آخری نیند

ثابت ہو گی۔ وہ دل مضبوط کر کے تیزی کے ساتھ چلنے لگا لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کے اعضاء پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ نڈھال سا ہو کر برف پر بیٹھ گیا لیکن انسان کی فطرت میں زندہ رہنے کی خواہش آخری وقت تک مایوسیوں سے جنگ کرتی ہے۔ طاہر ایک بار پھر اٹھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی عاجزی کے ساتھ دعا کی۔

"اے زمین و آسمان کے مالک! میری زندگی کا کوئی مقصد ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ اب مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمّت نہیں۔ میں تیری پناہ لینا چاہتا ہوں اور تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔ لیکن اگر میرے مقدر میں موت کے سوا کچھ نہیں تو مجھے ایک مومن کا حوصلہ عطا کر!"

اس دعا کے بعد طاہر نے محسوس کیا کہ وہ زندگی کے بوجھ سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ وہ بیٹھنے کو تھا کہ اچانک ایک آواز نے اس کی رگوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا کر دی۔ یہ ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز تھی۔ طاہر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی پانچ قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑا کان کھڑے کر کے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

طاہر بھاگتا ہوا گھوڑے کے قریب پہنچا۔ گھوڑا ایک دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سینے سے اپنا منہ رگڑنے لگا۔ اس پر برف میں اٹی ہوئی زین دیکھ کر طاہر نے محسوس کیا کہ کسی مسلمان مجاہد کا رفیقِ کارزار رہ چکا ہے۔

طاہر زین سے برف جھاڑ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ گھوڑا چند قدم آگے چل کر پھر اپنی جگہ آرُکا اور ایک ابھری ہوئی جگہ پر سُم مارنے لگا۔ طاہر نے جلدی سے نیچے اُتر کر برف اِدھر اُدھر ہٹائی تو نیچے ایک انسان کی لاش تھی۔ اس کی پسلی اور پیٹھ میں دو تیر پوست تھے۔ طاہر نے اناللہ وانا الیہ راجعون کہہ کر اس کا جسم پھر برف میں چھپا دیا اور گھوڑے کو تھپکی دے کر پھر اس پر سوار ہو گیا۔

زندگی کی نئی اُمّید نے طاہر کے رگ وریشے میں ایک نئی حرارت پیدا کر دی تھی۔ اس نے کچھ دور چل کر گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں گوشت اور پنیر کے چند ٹکڑے تھے۔

پیٹ بھرنے کے بعد طاہر نے قدرے تقویت محسوس کی۔ گھوڑا آہستہ

آہستہ اپنی مرضی سے جا رہا تھا۔ طاہر نے اس کا رُخ بدلنے یا اسے روکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

ثریا

شام کے دُھندلکے میں طاہر ایک ویران بستی میں داخل ہوا۔ اُجڑے ہوئے مکان گواہی دے رہے تھے کہ تاتاریوں کے سیلاب کی کوئی لہر اس بستی سے گزر چکی ہے۔ گھوڑے کی رفتاری ظاہر کر رہی تھی کہ آس پاس کا کوئی مکان اس کی منزلِ مقصود نہیں۔ طاہر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی مکان کے روزن سے روشنی کی جھلک تلاش کر رہا تھا۔ اکثر مکانوں کے دروازے کھلے تھے اور ان کے سامنے برف کے ڈھیر ہی ظاہر کر رہے تھے کہ ان کے اندر کوئی نہیں۔

ایک مکان کے بند دروازے کے قریب پہنچ کر طاہر نے تلوار کی نوک سے ایک کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلا، دروازہ کھل گیا لیکن اندر سے گلی

سڑی لاشوں کی ناقابلِ برداشت بدبُو نے طاہر کا راستہ روک لیا۔

گھوڑے نے کان کھڑے کر کے گردن ہلائی اور آگے بڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ طاہر نے گھوڑے کو تھپکی دے کر اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور کہا۔ ”میرے دوست! اب میری ہمّت جواب دے رہی ہے۔ اگر تمہیں کوئی گوشۂ عافیت معلوم ہے تو جلدی پہنچو!“

جب گھوڑا بستی سے باہر نکل رہا تھا، طاہر کو آخری بار خیال آیا کہ شاید گھوڑے کی فراست پر اعتماد کرنا عقل مندی نہ ہو۔ رات کی تاریکی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی۔ طاہر نے ایک بار گھوڑے کو روکا اور بلند آواز سے پکارنے لگا۔ ”کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“

اس کی آواز رات کے سنّاٹے میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد ایک طرف سے بھیڑیوں کی چیخوں نے اس خیال کی تردید کر دی۔ اس کا گھوڑا پہلی بار ایک جھرجھری لینے کے بعد ہنہنایا۔ اس کی ہنہناہٹ اپنے سوار سے یہ کہہ رہی تھی۔ ”مایوس کیوں ہوتے ہو منزل آچکی ہے۔“

طاہر نے پھر گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ بستی سے تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑا گھنے درختوں میں گزرتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ برف باری اور تاریکی میں طاہر کے لیے دو قدم آگے دیکھنا بھی مشکل تھا۔

ٹیلے کی چوٹی پر ایک دیوار کے قریب پہنچ کر گھوڑا مُڑا اور دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف ہو لیا اور چند قدم پر وہ ایک کھلے دروازے سے گزر کر ہنہناتا ہوا اندر داخل ہوا۔

طاہر کے سامنے ایک بلند مکان تھا۔ وہ قوّتِ ارادی جس کے باعث وہ یہاں پہنچا تھا، اب جواب دے چکی تھی۔ جلتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے لیٹ کر سو جانا اس کی سب بڑی خواہش تھی۔

مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ کھُلا تھا لیکن روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ گھوڑا ڈیوڑھی میں داخل ہو کر رک گیا۔ طاہر گھوڑے سے اترا۔ اس کے پاؤں سُن ہو چکے تھے۔ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے سوچا شاید اس مکان میں بھی کوئی نہ ہو۔ شاید گھوڑے نے اس کی

آخری منزل کے لیے اس بستی کے اُجڑے ہوئے مکانوں میں سے بہترین مکان منتخب کیا ہو۔ وہ اپنی ساری طاقت کے ساتھ چلّانے لگا۔ ”کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“ اور اس کی آواز پتھر کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آنے لگی۔ اس نے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دیواروں کو ٹٹولتا اور بدستور چلّاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ڈیوڑھی عبور کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوا اور اس کمرے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا دوسرے سرے تک جا پہنچا لیکن کہیں سے اسے اپنی آواز کا جواب نہ آیا۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہ ریت پر اُمّیدوں کا محل تعمیر کر رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی انسان ہوتا تو مکان کے تمام دروازے کھلے نہ ہوتے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ اس وقت آگ کی ایک چنگاری میری جان بچا سکتی ہے لیکن آگ جلانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اچانک اس نے اپنے پاؤں کے نیچے کوئی نرم شے محسوس کی۔ اس نے جھک کر ہاتھوں سے ٹٹولا تو یہ ایک پوستین تھی۔ اس نے فرش پر بیٹھ کر پوستین اپنے گرد لپیٹ لی اور جلد ہی یہ محسوس کیا اس کی بدولت اس کی کھوئی ہوئی حرارت واپس نہیں آسکتی۔ لیکن چند گھڑیاں پیشتر اس نے گھوڑے کو تائید غیبی سمجھا تھا۔ اب بھی اس

کا ضمیر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تنہا چھوڑ دے گا۔ اسے یقین تھا کہ خدا نے اسے اپنی رحمت سے یہاں تک پہنچایا ہے۔ خدا سے اس نے ایک اعلیٰ مقصد کے لیے زندہ رہنے کی دُعا کی تھی اور یہ مقصد یہاں بیٹھ کر پورا نہیں ہوتا۔ یہ مکان اس کی آخری منزل نہیں۔ قدرت فقط اس کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ مایوس ہونا مومن کی شان نہیں۔ یہ رات گزر جائے گی۔ صُبح کو سورج کی حرارت اسے نئی زندگی کا پیغام دے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مکان کے کسی گوشے میں کوئی اللہ کا بندہ آگ جلا کر اس کا انتظار کر رہا ہو۔ اس ذہنی کشمکش کے دوران اسے نماز کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے تیمّم کیا اور اپنی رہی سہی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

نماز کی نیّت کا ارادہ کر کے ہی اس کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے کوئی اس مکان کے کسی گوشے میں تاتاریوں کے خوف سے چھپ کر بیٹھا ہو! اس نے بلند آواز میں اذان دی اور ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد کسی کی آمد سے مایوس ہو کر نماز کی نیّت باندھ لی۔

نماز میں محو ہونے کے بعد جسمانی تکلیف کا احساس آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ نماز ختم کر کے دعا کے وقت کمرے میں اچانک دھندلی سی روشنی دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

(۲)

ایک آٹھ سال کا بچہ ہاتھ میں مشعل لیے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ نوجوان کے چہرے میں غایت درجہ کی جاذبیت تھی۔ لباس سے وہ ایک ترک سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ طاہر نے اپنی زندگی میں کسی انسان کا اس سے زیادہ دلفریب چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اس کی طرف مبہوت سا ہو کر دیکھتا رہا۔ کمسن لڑکے اور اس نوجوان کی صورت میں کافی مشابہت تھی۔

طاہر نے یہ محسوس کیا کہ خدا نے اس کی رہنمائی کے لیے آسمان سے دو فرشتے بھیجے ہیں۔ دونوں پریشانی کی حالت میں اس کی طرف گھور رہے تھے۔ طاہر نے السّلام علیکم کہا۔ کمسن لڑکے اور نوجوان نے ایک ساتھ

اس کے سلام کا جواب دیا۔ لیکن لڑکے سے زیادہ نوجوان کی آواز کا ترنّم تھوڑی دیر کے لیے اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔

نوجوان نے عربی زبان میں کہا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ عرب ہیں؟“

طاہر نے حیران ہو کر سوال کیا۔ ”آپ نے کیسے پہچانا؟“

”آپ کی اذان سن کر۔ آپ کا لہجہ عربی تھا۔“

طاہر نے کہا۔ ”اور اگر میں بھی غلطی نہیں کرتا تو آپ کا لہجہ بھی عربوں سے زیادہ مختلف نہیں۔“

نوجوان کے چہرے پر ایک ہلکی سی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔ ”میری ماں عرب تھی لیکن یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں۔ آپ برف کے طوفان سے گزر کر آئے ہیں۔ آیئے ہمارے ساتھ چلیے۔“

نوجوان کی آواز میں ایک موسیقی تھی۔ وہ موسیقی جو کانوں کے راستے

دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔

طاہر اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیّار ہو گیا۔ نوجوان نے دو تین قدم اٹھانے کے بعد رُک کر پوچھا۔ ”لیکن رات کے وقت آپ یہاں کیسے پہنچے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”مجھے یہاں سے چند کوس دُور برف میں پڑے ہوئے ایک مسلمان سپاہی کا گھوڑا مل گیا اور اس گھوڑے نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔“

نوجوان کے چہرے پر رنج و افسوس کے آثار ظاہر ہوئے اس نے کہا۔ ”آپ نے اچھی طرح دیکھا ہے، وہ سپاہی زخمی تھا یا برف کے طوفان کے باعث ہلاک ہوا ہے؟“

”وہ زخمی تھا، اگر وہ آپ کا کوئی عزیز تھا تو مجھے افسوس ہے۔“

نوجوان نے کہا۔ ”وہ ہمارا پُرانا خادم تھا۔ میں نے آج اُسے ایک ضروری پیغام دے کر سمرقند روانہ کیا تھا لیکن آپ کے ہونٹ نیلے ہو رہے ہیں۔

آیئے ہمارے ساتھ۔ یہ جگہ محفوظ نہیں۔“

کمسن لڑکا شمع لیے ہوئے آگے چل دیا۔ دو کمروں میں سے گزر کر یہ لوگ ایک تنگ کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ نوجوان نے اس کوٹھڑی کے ایک کونے سے پتھر کے فرش کی ایک سِل اُٹھائی۔ سل کے نیچے ایک شگاف تھا جس میں سے ایک آدمی با آسانی نیچے اُتر سکتا تھا۔ اس شگاف سے لکڑی کی سیڑھی نیچے اترتی تھی۔ پہلے کمسن لڑکا اور اس کے بعد طاہر اس سیڑھی سے نیچے اُتر کر ایک تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ سب سے آخر میں نوجوان نے سیڑھی پر پاؤں رکھ کر اوپر کا شگاف اسی سِل سے بند کر دیا۔

تہہ خانے کے ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ فرش پر ایک خوب صورت قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف تین چار پوستینیں پڑی ہوئی تھیں۔ نوجوان نے طاہر کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ ہمارے پاس گوشت کے چند سوکھے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں۔“

"مجھے آپ کے ملازم کے تھیلے سے کھانے کو بہت کُچھ مل گیا تھا۔ اس وقت مجھے آگ سے زیادہ کسی شے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے طاہر نے اپنے موزے اُتار کر آگ کے سامنے پاؤں پھیلا دیے۔ کمرہ کافی گرم تھا۔ طاہر بیٹھے بیٹھے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ نوجوان نے اُٹھ کر اس پر پوستین ڈال دی۔

(۳)

ایک میٹھی اور دلکش آواز سن کر طاہر نے آنکھیں کھولیں اور پریشانی کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کہاں ہوں؟" اور پھر شمع کی روشنی میں جگانے والے نوجوان کو پہچان کر اپنے سوال کا جواب انتظار کیے بغیر بولا۔ "کیا صُبح ہو گئی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "اب تو دوپہر ہونے والی ہے۔ آپ بہت دیر سوئے ہیں۔"

"لیکن ابھی تک کافی اندھیرا ہے۔"

”آپ اس مکان کے تہہ خانے میں ہیں۔ دِن کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچتی۔“

طاہر کی آنکھوں سے نیند کا خُمار آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔ لیکن گزشتہ جسمانی کوفت کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”رات کے وقت آپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن مجھے اچانک نیند نے آدبایا۔ اب آپ بتایئے، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور وہ آپ کا نوکر آپ کو چھوڑ کر کہاں جا رہا تھا؟ میرے خیال میں یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ ہمیں بہت جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں بھی آپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن یہ اچھا ہوا کہ آپ کو فوراً نیند آ گئی۔ میرے والد اس شہر کے حاکم تھے، سلطان کی شکست کے بعد آس پاس کی دوسری بستیوں کی طرح اس شہر میں بھی خوف وہراس پھیل گیا اور لوگ اپنے بال بچوں کے ساتھ بلخ، بخارا اور سمرقند کی طرف ہجرت کر گئے۔ میں نے اپنے باپ کے ساتھ رہنے پر اصرار کیا لیکن انہوں نے میرے چھوٹے بھائی اسماعیل کی خاطر مجھے ایک

قافلے کے ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ بلخ میں میرے نانا ایک مشہور تاجر ہیں۔ ہمارے قافلے کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ اس شہر سے کوئی بیس کوس کے فاصلے پر رات کے وقت ہمارے قافلے پر تاتاریوں کے ایک دستے نے حملہ کر دیا۔ مردوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ وہ سب ایک ایک کر کے کٹ گئے۔ بعض عورتوں نے بھی لڑ کر جان دی اور باقی زندہ پکڑ لی گئیں، میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسماعیل کو بچانا تھا۔ دہشت کی حالت میں اس کی چیخیں میرے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ والد نے مجھے اپنے اصطبل کا بہترین گھوڑا دے رکھا تھا۔ میں نے اسماعیل کو خچر سے اتار کر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔ گھنے جنگل اور رات کی تاریکی کے باعث تاتاری میرا پیچھا نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اپنی بہنوں کی وہ جگر دوز چیخیں جو میں نے فرار ہوتے وقت سُنی تھیں کبھی نہ بھولیں گی۔"

نوجوان یہاں تک کہہ کر رُک گیا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ طاہر اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ کمسن لڑکا چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مغموم چہرے پر گزشتہ

واقعات کی یاد کے تکلیف دہ آثار پیدا ہو رہے تھے۔ طاہر نے بیٹھے بیٹھے اس کی طرف ہاتھ پھیلا دیے۔ لڑکے نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ تذبذب کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور چند سسکیاں لینے کے بعد بھاگ کر طاہر کے ساتھ لپٹ گیا۔ تھوڑی دیر اس نے ہونٹ بھینچ بھینچ کر سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن جب طاہر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

طاہر نے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ ہم بہت جلد کسی محفوظ مقام پہنچ جائیں گے۔“

لڑکے نے کہا۔ ”لیکن راستے میں تاتاری ہوں گے۔ وہ بچوں کو کھا جاتے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔“

نوجوان نے طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اسماعیل مجھے تسلیاں دیا کرتا تھا۔ آج خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔“

طاہر نے نوجوان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ ”اگر میں

غلطی نہیں کرتا تو آپ اسماعیل کی بہن ہیں، بھائی نہیں۔"

نوجوان کے چہرے پر اچانک زردی چھا گئی اور اس نے آنکھیں جھکالیں۔

طاہر نے کہا۔ "گھبرایئے نہیں۔ آپ کی عزّت اور حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ نے اپنی سرگزشت ابھی ختم نہیں کی۔"

جب لڑکی نے دوبارہ طاہر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کاش! اس بے کسی اور مایوسی کے زمانے میں قدرت ہماری قوم کی بیٹیوں کو مرد بنا دیتی۔ تاتاریوں سے بچ کر ہم پھر گھر واپس پہنچ گئے۔ تیسرے دن ابّا جان کو یہ اِطّلاع ملی کہ تاتاری سپاہیوں کے دستے شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ابّا جان کے پاس صرف چار سو سپاہی تھے، بعض افسروں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس مختصر فوج کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرنا خودکشی ہے۔ لیکن وہ بہت غیّور تھے۔ انہوں نے شہر چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ابّا جان کو جاسوسوں کی بدولت یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس شہر کا رُخ کرنے والے تاتاریوں کی

تعداد زیادہ نہیں اور انہیں یقین تھا کہ وہ چند دن تک انہیں شہر سے دُور رکھیں گے۔ اتنی دیر میں بلخ یا سمرقند سے کمک ضرور پہنچ جائے گی۔ لیکن قوقند کے متعلق جو افواہیں مشہور ہو رہی تھیں انہوں نے شہر کے لوگوں کو بہت بد دِل کر دیا۔ بعض افسر ابّا سے یہ کہتے تھے کہ سلطان نے تیمور ملک کو کوئی کمک نہیں بھیجی۔ پھر آپ کیسے مدد کی توقع رکھتے ہیں؟ ابّا جان کا آخری جواب یہ تھا کہ میں اپنا فرض پورا کروں گا۔ شام کے وقت انہوں نے فوج کو حکم دیا کہ وہ علی الصبح شہر سے باہر نکل کر تاتاریوں کا مقابلہ کرے۔ لیکن صُبح تک تقریباً دو سو سپاہی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے محل کے ملازموں میں سے بھی اکثر نے بھاگنے والوں کا ساتھ دیا۔“

”صبح کے وقت رخصت ہونے سے پہلے ابّا جان نے پہلی مرتبہ ہمیں اس تہہ خانے کا خفیہ راستہ بتایا اور علی کو ہمارے ساتھ چھوڑ دیا۔ علی ہمارا پرانا ملازم تھا۔ ابّا جان نے ہمارے لیے چند دن کی خوراک اس تہہ خانے میں جمع کر دی اور ہمیں بتایا کہ اگر انہیں شکست بھی ہو تو ہم اس تہہ خانے

سے بھاگنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ تاتاری کسی کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا کرتے۔ انہیں اُمّید تھی کہ خوارزم کی افواج تیاری کے بعد اس طرف ضرور آئیں گی۔ ""علی کے سوا باقی نوکروں میں سے کسی کو ہمارے اس تہہ خانے میں روپوش ہونے کا علم نہ تھا۔ دو دن تک ہم اس تہہ خانے میں چھپے رہے۔ محل کے رہے سہے خادم بھی بھاگ گئے۔ علی ہمیں باہر کے حالات سے باخبر رکھتا۔ تیسری شام ابّا جان کا گھوڑا خالی واپس آیا اور اسی رات تاتاریوں نے شہر میں داخل ہو کر رہی سہی آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دو دِن تاتاری اس محل کو اپنا مرکز بنا کر آس پاس کی بستیوں میں لوٹ مار کرتے رہے اور ہم علی کے ساتھ اسی جگہ چھپے رہے۔ یہ دو دن ہمارے لیے برسوں سے زیادہ طویل تھے۔ تیسرے دن انہوں نے یہ شہر خالی کر دیا۔ محل میں مکمل سکوت تھا۔ لیکن ہم نے رات تک انتظار کیا۔ رات کے وقت علی سُرنگ کے راستے باہر نکالا اور اس نے واپس آکر ہمیں تسلّی دی۔ چنانچہ ہم نے ناقابلِ برداشت سردی میں پہلی بار یہاں آگ جلائی۔ صُبح

ہوئی تو علی سرنگ کے راستے پھر باہر نکلا اور اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ ہمارے اصطبل کا ایک گھوڑا باہر چر رہا تھا اور وہ اسے پکڑ کر اصطبل میں باندھ آیا ہے اس کے بعد چار دن تک ہم یہ دعائیں کرتے رہے کہ مسلمانوں کی کوئی فوج اس طرف آ نکلے۔ پرسوں رات ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ علی الصبح اس مقام کو خیر باد کہہ کر بلخ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ راستے کی کسی فوجی چوکی سے مدد مل جائے۔ لیکن پچھلے پہر برف باری کے آثار دیکھ کر میں نے سمرقند کے گورنر کے نام یہ درخواست لکھی کہ ہمیں یہاں سے نکال کر بلخ پہنچانے کے لیے فوج کا ایک دستہ بھیجا جائے۔ علی میری درخواست لے کر کل روانہ ہوا۔ اب وہ گھوڑا جس پر آپ آئے ہیں، میں دیکھ کر آئی ہوں، علی اسی پر سوار ہو کر گیا تھا۔ میرے خیال میں وہ کسی تاتاری کی سفاکی کا شکار ہوا ہے۔ "اب شاید خدا نے آپ کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

طاہر نے مختصراً اپنی سرگزشت سنائی اور اختتام پر لڑکی سے کہا۔ "میں ذرا باہر جا کر موسم کا حال دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"محل میں تاتاریوں کی آمد کا ہر وقت خطرہ ہے۔ اس لیے باہر جانے کا محفوظ راستہ یہ سرنگ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے لڑکی نے تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی ایک چرخی کو گھمانا شروع کیا۔ معمولی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ایک سِل آہستہ آہستہ ایک طرف کھسک گئی اور دیوار میں ایک قابل گزر شگاف پیدا ہو گیا۔

(۴)

تہہ خانے کی دھندلی سی روشنی کے مقابلے میں سرنگ بہت تاریکی تھی۔ لڑکی اور اس کا بھائی کسی جھجک کے بغیر آگے جا رہے تھے۔ لیکن طاہر جھک جھک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ کہیں کہیں سرنگ کے دونوں جانب زمین کھود کر کشادہ کمرے بنائے گئے تھے۔ طاہر کوئی پچاس گز چلنے کے بعد اصل راستہ چھوڑ کر ایک کمرے میں گھس گیا۔ اتنی دیر میں لڑکی اور اس کا بھائی کچھ دور نکل گئے۔ طاہر پریشانی کی حالت میں کمرے کی دیواریں ٹٹول رہا تھا کہ

لڑکی کی آواز آئی۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”مجھے راستہ نہیں ملتا۔“

لڑکی نے پلٹ کر اپنے بھائی سے کہا۔ ”اسماعیل! ان کا ہاتھ پکڑ لو۔“

اسماعیل نے طاہر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آیئے۔ میں تاریکی میں دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔“

طاہر نے کہا۔ ”ان کمروں میں اچھی خاصی فوج رہ سکتی ہے۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”ہاں! لیکن کاش ہمارے پاس کافی فوج ہوتی!“ ایک جگہ پہنچ کر لڑکی رُک گئی اور اس نے کہا۔ ”اب ذرا سنبھل کر چلیں۔ آگے چشمہ ہے۔ اسماعیل تم میرا ہاتھ پکڑ لو۔“

تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چند قدم آگے بڑھے تو تاریکی کم ہونے لگی دائیں ہاتھ مُڑنے کے بعد دو تین قدم چل کر لڑکی پھر رُک گئی۔ یہاں روشنی کافی تھی۔ طاہر نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب کے

کنارے کھڑا ہے۔ ایک چٹان سے پانی کی دھار پھوٹ کر اس تالاب میں گر رہی تھی اور تالاب کا فالتو پانی سرنگ کے راستے نکل رہا تھا۔ پانچ چھ قدم آگے یہ سرنگ ختم ہو جاتی تھی اور یہ آخری حصّہ بہت تنگ تھا۔

پانی کی گہرائی ایک بالشت سے بھی کم تھی۔ لڑکی کی تقلید میں اسماعیل اور طاہر اُبھرے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سرنگ سے باہر نکلے۔ ان کے سامنے درختوں سے ڈھکی ہوئی گہری اور تنگ وادی تھی۔ برف باری تھم چکی تھی لیکن مطلع ابر آلود تھا۔ درخت پتھر اور زمین کی ہر شے برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔

سرنگ سے نکلتا ہوا پانی ایک چھوٹی سی ندی بناتا اور سنگ ریزوں سے ٹکرا کر ایک دلکش نغمہ پیدا کرتا ہوا اس تنگ وادی کے درمیان ایک بڑی ندی سے جا ملتا تھا۔ طاہر تھوڑی دیر کے لیے ایک دلکش منظر میں کھو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے نادانستہ طور پر اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ حسین تھی، شبنم میں دُھلے ہوئے پھول سے زیادہ حسین، مصوّرِ فطرت نے برف کا حسین مجسمہ

بنا کر اس میں گلابی رنگ بھر دیا تھا۔ حزن و ملال نے اس کا چہرہ بادل کے ہلکے سے نقاب میں چھپے ہوئے چاند سے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ لڑکی منہ پھیر کر بے توجہی سے اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی اور طاہر کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ثریا۔“ اس نے جواب دیا اور پریشان ہو کر طاہر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں۔ ”دیکھو! میں تمہاری پناہ میں ہوں لیکن ایک غیوّر باپ کی بیٹی ہوں!“

طاہر نے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ”مجھے بہت جلد بغداد پہنچنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ کو بلخ پہنچا دوں گا۔ ہم مطلع صاف ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس وادی سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے؟“

لڑکی نے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس طرف سے سامنے کی پہاڑی عبور کرنے کے بعد۔“

طاہر نے کہا۔ ”اگر سورج نکل آیا تو ہم کل روانہ ہو جائیں گے۔“

لڑکی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ابھی شاید اور برف پڑے۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ تھوڑی دیر یہاں ٹھہریں، میں اوپر جا کر دیکھ آؤں شاید؟“

”شاید کیا؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”آپ کا خیال ہو گا کہ شاید مسلمانوں کی فوج نظر آجائے۔ میں بھی صبح و شام یہی خواہش لے کر اس پہاڑی پر جایا کرتی تھی۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ کا تہہ خانہ تو کافی محفوظ ہے لیکن کیا بستی کے لوگوں میں کسی کو بھی پتہ نہ تھا؟“

ثریا نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ اس وادی کے گرد ہمیشہ پہرہ رکھا جاتا تھا۔ ابّا جان نے جب یہ تہہ خانہ اور سرنگ دکھائی تو مجھے احتیاط کی وجہ معلوم

ہوئی۔"

"بہت اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" طاہر یہ کہہ کر برف پر پاؤں رکھنے لگا تھا کہ لڑکی نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں، ٹھہریے، اس سرنگ کے قریب برف پر پاؤں کے نشان نہ چھوڑیے، آپ ندی میں سے گزر کر جائیے۔"

طاہر ثریا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پانی میں چلتا ہوا بڑی ندی تک پہنچا اور بڑے بڑے پتھروں پر پاؤں رکھ کر اسے عبور کرنے کے بعد پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن اسے برف کی سفید چادر پر کوئی متحرک شے نظر نہ آئی۔ جب وہ نیچے اُتر کر اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو برف باری پھر شروع ہو چکی تھی۔ طاہر بھوک کی شدّت محسوس کر رہا تھا۔

دوبارہ تہ خانے میں پہنچنے کے بعد ثریا نے گوشت کے چند ٹکڑے اور تھوڑا سا خشک میوہ ایک طشتری میں ڈال کر طاہر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بھوک تو ضرور ہو گی۔ آپ نے رات کے وقت بھی کچھ نہ کھایا تھا۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "شام کو مجھے آپ کے نوکر کے تھیلے سے کافی کھانا مل گیا تھا۔ مجھے گھوڑے کی فکر ہے۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔"

میں علی الصبح اوپر جا کر اسے اصطبل میں چھوڑ آتی تھی۔ وہاں سوکھی گھاس کافی ہے۔ یہ کہہ کر ثریا اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اسماعیل! تم ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔"

اسماعیل طاہر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ طاہر نے گوشت کے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر کھینچ لیا اور ثریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ؟"

ثریا نے کہا۔ "آپ میری فکر نہ کیجئے۔ میں بہت سویرے کھا لیا کرتی ہوں۔" اسماعیل آج ذرا دیر سے اُٹھا تھا اس لیے یہ ابھی تک بھوکا ہے۔"

طاہر نے ایک نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے لڑکے سے کہا۔ "اسماعیل کھاؤ۔

”لیکن اسماعیل مُضطرب ہو کر اپنی بہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ثریا نے ذرا آگے بڑھ کر لڑکے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
”اسماعیل کھاتے کیوں نہیں؟“

کمسن بچے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کو بھینچنے کی کوشش کرتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلا کر ثریا سے لپٹ گیا۔ ”میں نہیں کھاؤں گا، میں نہیں کھاؤں گا۔“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

طاہر نے محسوس کیا کہ کوئی تلخ شے اس کے حلق سے اُتر گئی ہے۔ اس نے طشتری اٹھا کر ثریا کے سامنے رکھ دی اور کہا۔ ”میں اپنا حصّہ کھا چکا ہوں۔“

ثریا نے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ آپ بھوکے ہیں۔“

طاہر نے کہا۔ ”ایک عرب ماں کی بیٹی سے مجھے یہی توقع تھی۔ لیکن میں اب آپ کا مہمان نہیں محافظ ہوں۔ مجھے شام کے وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لیے مل گیا تھا۔ لیکن آپ نے شاید شام کو بھی بہت تھوڑا کھایا

ہو۔"

طاہر نے اُٹھ کر کمان سنبھال لی اور ترکش گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ کھالیں۔ میں انشاء اللہ جلد واپس آجاؤں گا۔ اگر بستی میں کوئی شے نہ ملی تو شاید باہر سے کوئی شکار مل جائے۔"

ثریا نے کہا۔ "بستی میں انسانی لاشوں کے سوا تاتاری سب کچھ چٹ کر گئے ہیں اور اس موسم میں شاید شکار بھی نہ ملے۔"

طاہر نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ خدا نے ہمیں بھوکوں مرنے کے لیے یہاں اکٹھا نہیں کیا۔ میں انشاء اللہ خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ آپ شام کی فکر کیے بغیر یہ کھانا کھالیں۔"

ثریا نے کہا۔ "اگر آپ کو خدا کی رحمت پر اس قدر بھروسہ ہے تو کم از کم اپنا حصّہ کھا کر جائیں۔"

طاہر نے جھک کر گوشت کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بس! میں نے اپنا حصّے لیا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ ”میں آپ کو باہر پہنچا آتی ہوں۔“

”نہیں۔ میں نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ یہ کہہ کر طاہر سرنگ کے راستے باہر نکل گیا۔

طاہر کے جانے کے بعد ثریا نے کہا۔ ”اسماعیل! اب کھالو۔“

کمسن لڑکے نے جواب دیا۔ ”تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔“

ثریا نے طشتری میں پڑی ہوئی اشیاء میں سے تیسرا حصّہ نکال کر علیحدہ رکھ دیا اور کہا۔ ”یہ اُن کا حصّہ ہے۔ جب وہ آئیں گے انہیں بہت بھُوک ہو گی اور یہ میرا اور تمہارا حصّہ ہے۔“

(۵)

دوپہر کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا اور سورج کی روشنی میں برف کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ہوا ساکن ہونے کی وجہ سے موسم میں قدرے خوش گوار تبدیلی ہو رہی تھی۔ ثریا اور اسماعیل سرنگ سے باہر

چند درختوں کے درمیان ایک پتھر پر بیٹھے طاہر کا انتظار کر رہے تھے۔ برف پگھلنے سے درختوں کی ٹہنیاں آہستہ آہستہ ننگی ہو رہی تھیں۔ سامنے وادی کے درمیان ندی کا پانی آہستہ آہستہ زیادہ ہو رہا تھا۔ اسماعیل نے کہا۔ ”آپا وہ ابھی تک نہیں آئے۔ ایسی دھوپ میں شکار ضرور مِل جاتا ہے۔“

ثریا نے جواب دیا۔ ”خدا سے دُعا کرو۔“

”وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اگر ابّا جان ہوتے تو انہیں اپنی فوج کا سالار بنا لیتے لیکن آپا اگر انہیں شکار کی بجائے تاتاری مل گئے تو؟“

”خدا ان کی مدد کرے گا۔“

”اگر میں یہاں کسی تاتاری نے دیکھ لیا تو؟“

”یہاں ہمیں اوپر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“

”اگر انہیں تاتاریوں نے پکڑ لیا اور انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے

تاتاریوں کو ہمارا پتہ دے دیا تو؟"

"چُپ رہو۔ اپنے مہمانوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔"

"اگر پھر برف باری شروع نہ ہوئی تو ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟"

"انشاء اللہ!"

"اسماعیل خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ چلّانے لگا۔ "وہ آ گئے! وہ آ گئے!! آپا! آپا! اُدھر دیکھو وُہ پہاڑی دُنبہ لا رہے ہیں۔ دیکھو آپا۔ دیکھو وہ کتنا بڑا ہے۔ وہ اسے بڑی مشکل سے اُٹھا کر چل رہے ہیں۔ آگ بجھ تو نہیں گئی ہو گی؟"

ثریا نے درخت کی آڑ سے ایک طرف ہو کر دیکھا۔ طاہر کندھے پر ایک پہاڑی دُنبہ اٹھائے ندی عبور کر رہا تھا۔

اسماعیل نے پھر کہا۔ "آپا! آگ تو نہیں بُجھ گئی ہو گی، مجھے بہت بھُوک لگ رہی ہے۔" ثریا نے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کہ تم بالکل سیر ہو گئے ہو؟"

"میں یہ نہ کہتا تو آپ اپنا حصّہ بھی نہ کھاتیں۔ لیکن اب تو خدا نے دُنبہ بھیج دیا ہے۔ آپا یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

طاہر نے سرنگ کے قریب پہنچ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ جلدی اندر چلیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آس پاس تاتاریوں کا کوئی گروہ نہ ہو۔ یہ دُنبہ میرے تیر کا نشانہ بننے سے پہلے زخمی تھا۔"

تھوڑی دیر بعد جب تہ خانے میں ثریا دُنبے کا گوشت بھون رہی تھی، اسماعیل طاہر کے قریب آگ کے سامنے بیٹھ کر بار بار بے قراری کے ساتھ یہ کہہ رہا تھا۔ "آپا اب پک گیا ہو گا۔"

طاہر کی گزشتہ جسمانی تکالیف اور ذہنی پریشانیوں کے بعد اس تنگ و تاریک تہہ خانے میں ایک طرح کی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ تاہم مستقبل کے متعلق ایک چبھتا ہوا احساس اسے کبھی کبھی پریشان کر دیتا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ اُڑ کر بغداد پہنچ جائے اور وہاں پہنچ لیکن خاموش ایوانوں میں ایک ہنگامہ محشر اور کھڑے پانی کی سی زندگی میں

ایک ارتعاش پیدا کر دے۔ وہ تصوّر میں بغداد کی مساجد میں لاکھوں مسلمانوں کے سامنے پُر جوش تقریریں کر رہا تھا۔ کبھی وہ بغداد کی بے پناہ فوج کے ساتھ خوارزم شاہ کے جھنڈے تلے تاتاریوں کا مقابلہ کر رہا تھا، کبھی خلیفہ اور وزیر اعظم کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد ان کی بے حسی سے مایوس ہو کر انہیں جلی کٹی سنا رہا تھا اور کبھی تصوّر میں وحید الدّین کو خلیفہ کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے نہایت زور دار الفاظ میں اس کا جرم ثابت کر رہا تھا۔

طرح طرح کے خیالات کے ہجوم میں اسے کبھی کبھی اسماعیل کی کسی بات کے جواب میں ثریا کی آواز سنائی دیتی۔ یہ آواز جو موسمِ بہار کا پیام لانے والے پرندوں کے ترانے سے کہیں زیادہ میٹھی، دلکش اور دلفریب تھی۔ وہ آگ کی دھیمی روشنی کے سامنے اس کا خوب صورت چہرہ دیکھتا اور ایک لمحے کے لیے اس کے دل کا اضطراب لطیف دھڑکنوں میں تبدیل ہو جاتا۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا آجاتی، وہ دنیا جس میں آنکھیں کھولنے کے بعد ہر انسان گوشۂ عافیت تلاش کرتا ہے۔ اپنے سے زیادہ کسی ایسے

وجود کے لیے جا کی مسکراہٹ میں اسے زندگی کے طوفانوں سے پناہ ملتی ہے۔

صُبح کی کُہر میں لپٹے ہوئے سُورج کی دُھند کی شعاعوں کی طرح غم کے بادلوں نے ثریا کے چہرے کو زیادہ دلفریب بنا دیا تھا۔ حیا کے ہزاروں پردوں میں چھپی ہوئی ملول نگاہیں طاہر کو جو پہلا اور آخری پیام دے چکی تھیں، وہ یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ طاہر محسوس کر رہا تھا کہ اس صورت سے ملتی جلتی ایک دھندلی سی تصویر اس کے دل میں پہلے بھی موجود تھی۔ ایسی آواز وہ پہلے بھی سُن چکا تھا۔

طاہر شاہراہِ حیات کی اس منزل پر تھا جہاں پہنچ کر انسان کسی کی رفاقت کی احتیاج محسوس کرتا ہے جہاں کسی دوشیزہ کی مسکراہٹ اسے واپس دلانا اس کے لیے کائنات کا سب سے بڑا مسئلہ بن جاتا ہے لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پھولوں سے کھیلنے کی بجائے کانٹوں کو مسلنے میں زندگی کی صحیح لذّت محسوس کرتے ہیں۔ جنہیں رباب کی تانوں سے زیادہ تلواروں

کی جھنکار زیادہ دلکش محسوس ہوتی ہے، جو اپنے لیے جینے کی بجائے دوسروں کے لیے مرنا سعادت سمجھتے ہیں اور کسی ایک پھول کو اپنی آنکھوں کے لیے سامانِ تسکین بنانے کی بجائے اپنے خون سے ہزاروں پودوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ثریا کی طرح خوارزم کی اور ہزاروں لڑکیوں کی بے کسی کے تصوّر نے طاہر کے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی پیدا کر دی۔ اسے قوم کی ان ہزاروں بے کس بہنوں اور ماؤں کی جگر دوز چیخیں سنائی دینے لگیں جن کے دامنِ عصمت کی طرف وحشی تاتاریوں کے ہاتھ بڑھ رہے تھے۔ جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔ ہماری عصمت کے رکھوالے کہاں گئے؟ ہمارے غیوّر بیٹوں اور بہادر بھائیوں کو کیا ہو گیا؟

طاہر نے چونک کر کہا۔ "ہم کل پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟"

ثریا تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی اور طاہر نے پھر کہا۔ "ہمیں صرف دو تین منازل میں خطرہ ہے، اس کے بعد شاید کسی چوکی سے مدد مل جائے۔"

ثریا نے کہا۔ ”مجھے صرف اسماعیل کا خیال ہے۔ ہمارے پاس صرف ایک گھوڑا تھا اور وہ بھی مر چکا ہے۔“

”مر چکا ہے؟ آپ نے کب دیکھا؟“

”جب آپ شکار کے لیے گئے تھے، میں وہاں دوبارہ گئی تھی۔ مجھے وہ صُبح کے وقت بھی بیمار معلوم ہوتا تھا۔“

طاہر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسماعیل نے کہا۔ ”آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ میں پیدل چل سکتا ہوں۔“

ثریا نے کہا۔ ”آپ کو یہ اُمّید نہیں کہ خوارزم کی افواج دوبارہ اس طرف آئیں گی؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”جو افواج تیمور ملک کی امداد کے لیے نہ پہنچ سکیں مجھے ان سے کوئی توقع نہیں۔ لیکن مصیبت انسان کو قدرت کے معجزات کا طلب گار بنا دیتی ہے۔ میں خوارزم شاہ کی مدد سے مایوس ہوں لیکن قدرت کی مدد سے مایوس نہیں۔ اگر ہم پیدل پہاڑی راستہ اختیار کریں تو

کھلے کی نسبت زیادہ محفوظ ہوں گے۔ راستے میں کسی زخمی سپاہی کا گھوڑا مل جانا بعید از قیاس نہیں۔ اس کے علاوہ میرا اندازہ ہے کہ تاتاریوں کا رُخ شمال مغرب کی طرف ہے، جنوب میں بلخ کا راستہ محفوظ ہو گا۔ ہم انشاء اللہ کل پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

(٦)

شام کے وقت طاہر نے جب نماز کے بعد دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اسے اوپر محل میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ثریا نے فوراً اُٹھ کر سلگتی ہوئی آگ کو پتھّر کی سلوں سے ڈھانپ دیا۔ طاہر دُعا ختم کر کے ثریا کی طرف متوجہ ہوا اور وہ خوف زدہ صورت بنائے دبی زبان میں بولی۔ "یہ شاید تاتاری ہیں۔ لیکن گھوڑے پانچ چھ سے زیادہ نہیں۔"

طاہر نے آہستہ سے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی فوج آ رہی ہو۔"

اسماعیل نے مغموم لہجے میں کہا۔ "اب ہم شاید بلخ نہ جا سکیں۔"

طاہر نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ انشاء اللہ ہم ضرور جائیں گے۔“

”کب؟“

”شاید آج ہی روانہ ہو جائیں“

ثریا نے چونک کر پوچھا۔ ”آج؟“

”ہاں۔ آپ اس گوشت میں سے دو تین دن کی خوراک تھیلے میں ڈال لیں۔“

”لیکن برفانی راستے میں رات کے وقت پیدل؟“

”آپ پیدل چلنے کے متعلق کیوں سوچتی ہیں؟ کیا قدرت نے ہمارے لیے گھوڑے نہیں بھیجے؟“

ثریا نے کہا۔ ”ان کے گھوڑے چھیننا ذرا مشکل ہے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”جو کام ضروری ہو اس کے متعلق نہیں سوچا جاتا کہ

یہ مشکل ہے یا آسان۔“

تھوڑی دیر بعد اوپر سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں آنے لگیں۔ ثریا بولی۔ ”وہ درمیان کے بڑے کمرے میں شاید آگ جلانے کے لیے دروازے توڑ رہے ہیں اور گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ آئے ہیں۔ میں سیڑھی پر چڑھتی ہوں۔ ان کی آوازیں سُن کر میں ان کی تعداد کے متعلق صحیح اندازہ لگا سکوں گی۔“

”لیکن اوپر پتھّر کو ابھی نہ ہلانا۔ شاید کوئی اوپر والے کمرے میں موجود ہو۔“

”نہیں آپ بے فکر رہیں۔“ ثریا یہ کہہ کر سیڑھی پر چڑھی اور سِل کے قریب کان لگا کر اوپر سے آنے والی آوازیں سننے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اُتر کی اور طاہر کے سوال کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”وہ چھ یا سات سے زیادہ نہیں۔ وہ تیمور ملک کی تلاش میں ہیں۔ ممکن ہے کہ صُبح تک ان کے اور ساتھی بھی آ جائیں۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھ سکی

لیکن تیمور ملک کا نام بار بار سُن کر میرا یہی اندازہ ہے۔ وہ اس وقت اوپر
والے کمرے سے دائیں طرف تیسرے کمرے میں ہیں۔"

سپاہی کی بیٹی

تہہ خانے کی تاریکی میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ تاتاری اپنی زبان میں کوئی راگ گا رہے تھے۔ طاہر عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد دیر تک بیٹھا رہا۔ جب تاتاریوں کا راگ ختم ہوا تو وہ ثریا اور اسماعیل کو تیّار رہنے کا مشورہ دے کر سیڑھی پر چڑھا اور چھت کے قریب کان لگا کر سُننے لگا۔ ایک تاتاری باتیں کر رہا تھا اور باقی خاموش تھے۔ تاتاری زبان کے چند الفاظ طاہر بھی سیکھ چکا تھا۔ اور وہ صرف یہ اندازہ لگا سکا کہ بولنے والا اپنے ساتھیوں کو کوئی کہانی سنا رہا ہے۔ طاہر نے آہستہ سے سِل کھسکا کر ایک طرف کر دی اور سوراخ میں سے سر اوپر نکال کر محسوس کرتے ہوئے کہ کمرے میں کوئی نہیں، باہر نکل آیا۔ پتھّر کی سِل اسی طرح شگاف پر رکھ

دی۔

تاریکی میں چند قدم چلنے کے بعد طاہر کے ہاتھ ایک دروازے پر لگے۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو باہر دھکیلا لیکن دروازے کی چڑچڑاہٹ نے اسے پریشان کر دیا اور وہ اسے جلدی سے بند کر کے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بند ہوتے وقت دروازے کی چڑچڑاہٹ کی آواز نسبتاً زیادہ تھی۔

کہانی سنانے والا تاتاری اچانک خاموش ہو گیا۔ ایک ثانیہ کے بعد اس نے اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہا اور وہ نیم خوابی کی حالت میں بڑبڑانے لگا۔ یہ دو آدمی جن میں سے ایک طاہر کے اندازے کے مطابق داستان گو تھا، کچھ دیر ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے۔ درمیان والے کمرے میں ان میں سے ایک کے داخل ہونے کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ طاہر نے فوراً ہی اندازہ لگایا کہ ان کے علاوہ باقی سب تاتاری سو گئے ہیں۔

تاتاری نے درمیانی کمرے میں سے گزرنے کے بعد طاہر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ چونکہ اب درمیانی کمرے کے دونوں دروازے ایک دوسرے کے سامنے تھے اس لیے تیسرے کمرے سے آگ کی ہلکی سی روشنی طاہر کے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ سمٹ کر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ تاتاری بے پروائی سے طاہر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک لحظہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد آنکھیں ملنے اور اپنے ساتھی کو گالی دینے کے بعد واپس جارہا تھا کہ طاہر نے آہنی ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑے۔ پست قد تاتاری کے مُنہ سے ایک ہلکی سی آہ بھی نہ نکل سکی۔ آن کی آن میں طاہر نے اسے لاش بنا کر زمین پر لٹا دیا۔

تیسرے کمرے سے داستان گو کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ شاید اپنی داستان کا آخری حصّہ سنانے کے لیے بے قرار تھا۔ طاہر نے جلدی سے تلوار نیام سے نکالی اور دیوار کے ساتھ لگ کر زور زور سے خرّاٹے لینے لگا۔

داستان گو یہ سمجھ کر کہ اس کا ساتھی کمرے میں پہنچ کر سو گیا ہے، ہنستا ہوا

اُٹھا اور ایک جلتی ہوئی لکڑی ہاتھ میں لیے اس کمرے تک پہنچا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کمرے کا جائزہ لے سکتا۔ طاہر کی تلوار اس کے سینے کے آر پار ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

تیسرے کمرے میں اس کے ساتھی اچانک اس چیخ سے بیدار ہو کر بیک وقت ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ طاہر ایک لمحہ کے توقّف کے بغیر بھاگتا ہوا درمیانی کمرہ عبور کرنے کے بعد تیسرے کمرے میں جا داخل ہوا۔ وہاں آگ کی وجہ سے کافی روشنی تھی۔ تاتاری اُٹھ کر اپنی تلواریں سنبھال رہے تھے کہ طاہر کی تلوار ان پر صاعقہ بن کر کوندی اور ان میں سے دو بسمل ہو کر فرش پر لوٹنے لگے۔ اتنی دیر میں باقی تین تاتاری سنبھل چکے تھے۔ طاہر کی تلوار کئی مرتبہ اپنے تینوں حریفوں کی تلواروں سے ٹکرائی۔ تاتاریوں نے اسے ایک خطرناک مدِّمقابل سمجھتے ہوئے منتشر ہو کر لڑنے کی کوشش کی لیکن طاہر نے انہیں ایک کونے سے اِدھر اُدھر ہٹنے کا موقع نہ دیا۔ چند لمحات گزر

جانے کے بعد ان میں سے ایک زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔ طاہر کے بازو پر بھی ہلکا سا زخم آ چکا تھا لیکن اپنے سامنے ایک کونے میں صرف دو آدمی پا کر وہ پُرجوش حملہ کرنے کی بجائے قدرے اِطمینان سے لڑ رہا تھا۔

(۲)

اچانک طاہر کو اپنے عقب سے ایک چیخ سنائی دی۔ وہ جلدی سے پینترا بدل کر ایک طرف ہٹا۔ اس کے بائیں ہاتھ ثریا خون آلود تلوار لیے کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک اور تاتاری جسے طاہر نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔ اتنی دیر میں طاہر کے دو حریف منتشر ہو کر اس کے لیے دو محاذ بن چکے تھے۔ ثریا طاہر کے کسی ادارے کا انتظار کیے بغیر ان میں سے ایک کے سامنے جا کھڑی ہوئی لیکن طاہر نے چلّا کر کہا۔ ”ثریا! تم ایک طرف ہٹ جاؤ، میرے پیچھے۔“

طاہر نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا اور اسے آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا اور ثریا کے لیے بہت بڑا انعام تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ میری فکر نہ

کریں۔ میں نے بھی ایک عرب ماں کا دودھ پیا ہے۔"

"لیکن اسماعیل اکیلا۔۔۔۔!"

"وہ بھی میرا ہی بھائی ہے۔"

اب طاہر اور ثریا ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے تھے اور وہ تاتاری پھر ایک کونے میں سمٹ رہے تھے۔ اچانک طاہر نے پینترا بدلا اور اس کی تلوار بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ثریا کے مدِّ مقابل کا دایاں بازو کاٹ گئی۔ دوسرے لمحے میں ثریا کی تلوار اس کے سینے کے آر پار ہو چکی تھی۔

اب طاہر کے سامنے صرف ایک تاتاری تھا اور ثریا اطمینان کے ساتھ گرے ہوئے دُشمن کی قبا کے ساتھ اپنی خون آلود تلوار صاف کر رہی تھی۔

تاتاری اب زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر ایک زخمی درندے کی طرح حملے کر رہا تھا۔ اچانک طاہر کے ہونٹوں پر ایک تبسّم ظاہر ہوا۔ ایک مجاہد کا تبسّم جو دشمن کے کانوں میں موت کا مہیب ترین قہقہہ بن کر گونجتا

ہے۔ اس کی تلوار تاتاری کے سر پر چمکی اور سینے تک پہنچ گئی۔

ثریا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ جو قرونِ اولیٰ میں دخترانِ اسلام کا غازیان اسلام کے لیے سب سے بڑا انعام ہوا کرتی تھی۔

طاہر چند لمحات کے لیے اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے اس حسین زمانے کا تصوّر کر رہا تھا۔ جب ایک سیدھی سادی عرب لڑکی سر فروشانِ اسلام کی فوج کو اپنی ہستی سے گزرتے ہوئے دیکھ کر یہ گایا کرتی تھی۔

”قوم کے غیّور بیٹو! تمہارے گھوڑوں سے اڑنے والی گرد مجھے کہکشاں سے زیادہ عزیز ہے۔ تمہارے غبار میں اٹے ہوئے چہرے میری نگاہ میں چاند۔۔۔۔۔۔ حسین ہیں“

طاہر کی آستین پر خون کا نشان دیکھ کر ثریا جلدی سے اپنا رومال نکال کر بولی۔ ”آپ کو زخم آگیا ہے۔ لائیے میں پٹّی باندھ دوں۔“

”یہ معمولی خراش ہے۔“ طاہر نے یہ کہتے ہوئے آستین چڑھا کر اپنا بازو

آگے کر دیا۔ ثریا نے اس کے زخم پر رومال باندھتے ہوئے کہا۔ ”میرا اندازہ چھ سات کا تھا۔ یہ آٹھواں شاید اصطبل میں پہرہ دیتا ہوا آیا تھا اور آپ پر عقب سے حملہ کر رہا تھا۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اگر آپ نہ ہوتیں تو میرے لیے اس کا وار یقیناً خطرناک ہوتا۔“

”خدا کے لیے یوں نہ کہیے۔ میں صرف اپنی وکالت کرنا چاہتی تھی۔ میں وہاں نہ ٹھہر سکی۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ دبے پاؤں پیچھے سے آکر آپ پر حملہ کر رہا ہے اور میری چیخ نکل گئی۔ میں بہت نادم ہوں۔“

”ثریا! جب تک عالمِ اسلام میں تمہارے جیسی لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی، دنیا میں مسلمانوں کو کوئی قوّت نہیں کُچل سکتی۔ چند لمحات پیشتر میں بے حد مایوس تھا لیکن اب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جو قوم تمہارے جیسی لڑکیاں پیدا کر سکتی ہے، اس کی زبان میں مایوسی کا لفظ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ

تحت الثریٰ میں پہنچ کر بھی ستاروں پر کمندیں ڈال سکتی ہے۔ انقلاب اس کو دبا سکتے ہیں، دفن نہیں کر سکتے۔ حوادث کے طوفان اسے منتشر کر سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ تاتاریوں کا طوفان بہت بڑا طوفان ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عالمِ اسلام کی آخری چٹان تک کو بہالے جائے لیکن تم اور تمہارے جیسی قوم کی بیٹیاں ہر دور میں ایسے معمار پیدا کرتی رہیں گی جو سنگ ریزوں کو جوڑ کر ناقابلِ تسخیر چٹانیں بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔"

ثریا کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو چھلک رہتے تھے۔ اس نے کہا۔ "میں بھی چند لمحات پہلے ہی خیال کر رہی تھی کہ قوم کے بیٹوں کا لہو سفید ہو چکا ہے لیکن نہیں جس قوم کو آپ جیسے سپاہی نصیب ہوں، اُس کا جھنڈا کوئی طاقت سرنگوں نہیں کر سکتی۔" "لیکن تم رو رہی ہو؟"

ثریا مُسکرائی۔ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ شبنم میں نہائے ہوئے پھول کا تبسّم، جس میں خون خلد کے بے شمار قہقہے چھُپے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "نہ جانے میں آج کیوں اپنے تمام غم بھول گئی ہوں۔ شاید اس لیے کہ آج میں نے اپنی قوم کے دشمنوں میں سے ایک قتل کیا ہے۔"

"نہیں۔ اس لیے کہ تم نے اپنی قوم کے دشمنوں کے ایک سپاہی کی جان بچائی ہے۔ لیکن اب چلو۔ اسماعیل پریشان ہو گا اور گھوڑے بھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

طاہر نے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور ثریا کے ساتھ تہ خانے کی طرف چل دیا۔

جب اس نے راستے سے پتھر کی سِل ہٹائی تو نیچے سے اسماعیل نے چلّا کر کہا۔

"ٹھہرو! تم کون ہو۔ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔"

ثریا نے کہا۔ "اسماعیل ہم ہیں۔"

"اجازت ہے۔" اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

جب طاہر اور ثریا نے نیچے اتر کر جلتی ہوئی لکڑی کی روشنی میں دیکھا تو اسماعیل اپنے ہاتھ میں تیر کمان لیے کھڑا تھا۔

طاہر نے کہا۔ ”اسماعیل! ہم بلخ جارہے ہیں۔“

”کب؟“

”ابھی۔ تمہیں سردی تو نہیں لگے گی؟“

”نہیں جی۔ آپا جان تو کہتی تھیں کہ سردی آپ زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ آپ گرم ملک کے رہنے والے ہیں۔“ ثریا نے بُھنے ہوئے گوشت سے بھرا ہوا ایک تھیلا طاہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تہہ خانے کے ایک کونے سے جلانے کی لکڑیاں ایک طرف ہٹا کر چمڑے کا چھوٹا سا تھیلا نکالا اور طاہر سے کہا۔ ”میں قوم کی یہ امانت آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ والد مرحوم نے تاتاریوں کے حملے کا خطر محسوس کرتے ہی بیت المال کا بیشتر حصّہ سمرقند بھیج دیا تھا۔ یہ باقی دو ہزار اشرفیاں انہوں نے میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے میرے سپرد کر دی تھیں۔ اشرفیوں کے علاوہ اس تھیلے میں چند ہیرے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ لیکن میں ان پر قوم کے شہیدوں کے لاوارث بچیوں کا زیادہ حق سمجھتی ہوں۔ ابّا جان اپنی آمدنی کا

بیشتر حصّہ نانا جان کی تجارت میں لگانے کے لیے دیتے رہتے ہیں اور انہوں نے بلخ میں ہمارے لیے کافی جائداد خرید رکھی ہے۔"

طاہر نے دونوں تھیلے اٹھا لیے۔ ثریا نے جلتی ہوئی لکڑی سے ایک شمع روشن کی اور تینوں سیڑھی کے راستے دوبارہ اوپر چڑھ کر محل کے کمروں میں سے گزرتے ہوئے اصطبل میں داخل ہوئے۔

اصطبل میں تاتاریوں کے آٹھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ طاہر، ثریا اور اسماعیل تین گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اور باقی گھوڑوں کو محل سے باہر لا کر تتر بتر کر دیا۔ باہر کے پھاٹک سے نکل کر چند قدم کے چلنے کے بعد ثریا نے اپنا گھوڑا روکا اور طاہر سے کہا۔ "تھوڑی دیر ٹھہریے۔ میں اس شہر کو چھوڑنے سے پہلے ایک دُعا مانگنا چاہتی ہوں۔"

طاہر اور اسماعیل اپنے گھوڑے روک کر ثریا کی طرف دیکھنے لگے۔

ثریا نے آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا اور نہایت درد ناک لہجے میں یہ دُعا مانگی۔

”پروردگارِ عالم۔ میں تیرے محبوب کی اُمّت کی ہزاروں بے کس لڑکیوں میں ایک ہوں۔ تو ان سب کی حفاظت کے لیے قوم کے جوانوں کو ہمارے اسلاف کی غیرت اور شجاعت عطا کر۔ وہ اس محل پر اسلام کی عظمت کا پرچم پھر ایک بار لہرائیں۔ اس شہر کی سنسان گلیاں پھر ایک بار غازیانِ دین کے گھوڑوں کی آہٹ سنیں۔ اس شہر کی ویران مساجد میں پھر ایک بار اللہ اکبر کی اذانیں گونجیں۔ تیرے دین کا بول بالا ہو۔ آمین!“

طاہر اور اسماعیل نے بھی آمین کہا اور تینوں گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہر سے باہر بلخ کے ناہموار راستے پر جا رہے تھے۔ مطلع صاف تھا اور سردی ناقابلِ برداشت تھی لیکن اسماعیل بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ موسم بہت اچھا ہے۔ اور مجھے پوستین میں تلخی محسوس ہوتی ہے۔

(۳)

تیسرے روز دوپہر کے وقت طاہر کو مسلمانوں کی ایک مختصر فوج کا پڑاؤ

دکھائی دیا۔ پڑاؤ میں داخل ہونے کے بعد طاہر کے استفسار پر ایک سپاہی نے بتایا کہ مشرقی سرحد کی چوکیاں خالی کرنے کے بعد چار ہزار سپاہی یہاں جمع ہو گئے ہیں اور ایک دو دن میں سمرقند کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔

طاہر نے اس فوج کے افسرِ اعلیٰ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو سپاہی نے جواب دیا کہ اس فوج میں ہر پچاس ساٹھ سپاہیوں کی ٹولی کا ایک علیحدہ افسر ہے لیکن کل یہاں ایک شخص پہنچا ہے اور تمام اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اس حکم مانتے ہیں۔

طاہر نے سوال کیا۔ ”وہ کون ہے؟“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”تیمور ملک۔ آپ انہیں جانتے ہیں؟“ ”تیمور ملک کو کون نہیں جانتا؟“

سپاہی نے طاہر کے گھوڑے کی باگ پڑ ھتے ہوئے کہا۔ ”چلیے میں آپ کو ان کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔“

ثریا اور اسماعیل ان کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ طاہر ایک خیمے کے سامنے پہنچ کر رُکا۔ ثریا اور اسماعیل گھوڑوں سے اُترے۔ سپاہی نے اندر جا کر اِطّلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد تیمور ملک باہر نکالا۔ وہ طاہر کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا اور اسے گلے لگا یا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔" یہ کہہ کر وہ اسماعیل اور ثریا کی طرف متوجہ ہوا۔ ثریا بدستور مردانہ لباس پہنے ہوئی تھی اور اس کا نصف چہرہ پوستین میں چھپا ہوا تھا۔ تیمور ملک نے پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

طاہر نے کہا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ میں آپ کو ان کی سرگزشت سناؤں گا لیکن ہم نے راستے میں بہت کم آرام کیا ہے۔ انہیں عورتوں کے خیمے میں بجھوا دیجیے۔"

"عورتوں کے خیمے میں؟" تیمور ملک نے حیران ہو کر سوال کیا۔

طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ مرد نہیں۔"

تیور ملک نے کہا۔ "خاتونِ محترم! مجھے آپ کے لباس سے غلط فہمی ہوئی۔

لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جب قوم کے بیٹوں کی شجاعت اور غیرت رخصت ہو چکی ہو تو قوم کی بیٹیوں کو یہی لباس زیب دیتا ہے۔"

ثریا نے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں قوم کے بیٹوں کی غیرت سے مایوس نہیں ہوں۔"

"آپ نے صرف طاہر کو دیکھا ہے۔ لیکن قوم میں ایسے بزدلوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے ہاتھ پاؤں تاتاریوں کا نام سن کر پھول جاتے ہیں۔ لیکن اب ان باتوں کا وقت نہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور آپ کے لیے عورتوں کا خیمہ موزوں نہیں۔"

"آپ کو ہر ایک کی تسلّی کے لیے اپنی سرگزشت کئی بار بیان کرنی پڑے گی۔ اس لیے میں اپنا خیمہ پیش کرتا ہوں۔ میں اور طاہر دوسرے خیمے میں رات گزار لیں گے۔"

یہ کہ کر تیمور ملک ایک سپاہی سے مخاطب ہوا۔ "انہیں اندر لے جاؤ اور ان کے کھانے کا انتظام کرو۔"

ثریا اور اسماعیل تیمور ملک کے کشادہ خیمے میں داخل ہوئے اور تیمور ملک طاہر کے ساتھ ایک اور افسر کے خیمے میں چلا گیا۔

(۴)

علی الصبح ثریا کو گہری نیند کی حالت میں اذان کی دلکش آواز سنائی دی۔ کچھ دیر کے بعد وہ نیم خوابی کی حالت میں اس اذان کو رات بھر کے بعض میٹھے اور سہانے اور بعض بھیانک سپنوں کا ایک حصہ سمجھتی رہی۔ مؤذن کی اذان ختم ہوئی اور وہ گردن اُٹھا کر دُھندلی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ”اسماعیل! اسماعیل! اسماعیل!“ اُس نے گھبرا کر کہا۔

اسماعیل اس کے قریب سو رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ ثریا نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس نے اُٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

”کہاں جانے کے لیے تیّار ہو؟“

”بلخ جانے کے لیے اور کہاں؟“

”بلغ۔۔۔ اف! میں رات بھر عجیب و غریب خواب دیکھتی رہی۔ میں سمجھتی تھی کہ میں ابھی تک اسی تہہ خانے میں ہوں۔ لیکن وہ کہاں ہیں؟“

”کون؟ طاہر! وہ اپنے دوست کے ساتھ دوسرے خیمے میں ہیں۔ آپ عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو گئی تھیں۔ وہ آئے تھے۔ انہوں نے مجھے باہر سے آواز دی۔ میں جاگ رہا تھا۔ انہوں نے وہیں سے پوچھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ انہوں نے آپ کے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آپ سو رہی ہیں۔ پھر وہ واپس چلے گئے۔“

”میرے متعلق انہوں نے کیا پوچھا تھا؟“

”انہوں نے کہا تھا تمہاری ہمشیرہ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟“

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے کہا وہ تو گہری نیند میں خرّاٹے لے رہی ہیں۔“

”بڑے نالائق ہو تم۔ میں کب خرّاٹے لیا کرتی ہوں۔ سچ کہو تم نے یہ کہا تھا نہیں؟“

اسماعیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں میں نے صرف یہ کہا تھا کہ آپ سو رہی ہیں۔“

”اور کیا کہا انہوں نے؟“

”انہوں نے کہا تھا تم بھی سو جاؤ۔ صبح کی نماز کے بعد ہم بلخ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ہاں آپا! ایک بات اور۔ ان کے چلے جانے کے بعد خیمے میں چند عورتیں اور لڑکیاں آئیں تھیں اور آپ کو نیند کی حالت میں دیکھ کر واپس چلی گئیں۔“

”تم نے مجھے جگا دیا ہوتا۔“

”میں جانے لگا تھا لیکن انہوں نے مجھے منع کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا یہی سچ ہے کہ تمہاری بہن نے ایک تاتاری کو ہلاک کیا ہے؟ میں نے کہا ہاں! یہ بالکل سچ ہے تو وہ بہت حیران ہوئیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم صبح

تمہاری بہن سے ملیں گی۔"

ثریا نے کہا۔ "تم جاؤ مردوں کے ساتھ نماز پڑھو۔ میں بھی نماز پڑھتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ثریا نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے۔ دُعا ختم کرنے کے بعد اس نے مُڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے چند عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "ہم رات کے وقت آئی تھیں۔ آپ سو رہی تھیں۔ ہم نے آپ کو جگانا مناسب خیال نہ کیا۔ ہم آپ کی سرگزشت سُن چکی ہیں۔ ہم سب کو آپ پر فخر ہے۔"

ثریا نے جواب دیا۔ "آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ لیکن یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں تھا۔"

ایک عورت نے کہا۔ "لیکن یہ سب تاتاریوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ آپ انہیں وعظ کریں۔"

ثریا نے کہا۔ "میں وعظ کرنا نہیں جانتی۔ میں بھی آپ میں سے ایک

ہوں۔ بہرحال میں آپ کی خواہش رد نہیں کر سکتی۔ آپ تشریف رکھیں!"

خواتین بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "ذرا ٹھہریے! میں سب کو بلا یالاتی ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر خیمے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد یہ وسیع خیمہ عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔

ثریا نے ہچکچاتے ہوئے اپنی تقریر شروع کی۔

"میری مصیبت زدہ بہنو۔ گزشتہ صدیوں میں دخترانِ اسلام پر ایسا نازک وقت کبھی نہیں آیا۔ خوارزم میں ہماری سطوت کے پرچم ٹوٹ رہے ہیں اور تاتاریوں کی وحشت اور بربریت کا تند و تیز سیلاب خوارزم کے علاوہ ہر اسلامی سلطنت کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہے۔ اس نازک دور میں آپ اس لیے مایوس ہیں کہ فرزندانِ اسلام میں وہ پہلی سی شجاعت باقی نہیں رہی۔ ان میں قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کا سا ذوقِ شہادت نہیں۔ لیکن میں

پوچھتی ہوں آج وہ خواتین ہیں جو اپنے شوہر یا بھائی کو میدانِ جنگ میں پیچھے ہٹتا دیکھ کر خیموں کی چوبیں نکال کر یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تم نے بد دِلی دکھائی تو تمہاری کھوپڑیوں کی خیر نہیں!"

"میری بہنو یاد رکھو! گرتی ہوئی قوم کا آخری سہارا اس قوم کی بیٹیاں ہوا کرتی ہیں۔ تم قوم کا آخری سہارا ہو۔ جب تک تمہارے سینے نورِ ایمان سے منوّر ہیں، تمہارے بیٹوں، تمہارے شوہروں اور تمہارے بھائیوں کو دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔ جب تک قوم کی ماؤں کا مقدس دودھ قوم کی بیٹیوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا رہے گا، ان میں شہادت کی خواہش زندہ رہے گی اور جب تک فرزندانِ اسلام میں شہادت کی خواہش ہے، وہ بڑے سے بڑے دُشمن کے لیے پیامِ موت ثابت ہوں گے۔"

"قوم اگر مردہ ہے تو اسے زندہ کرنے والا آبِ حیات تمہارے پاس موجود ہے۔ قوم اگر سو رہی ہے تو تم اسے جھنجھوڑ کر جگا سکتی ہو۔ تم مردوں کے پاؤں کی زنجیر نہ بنو! اپنے شوہروں سے کہو کہ تم میدانِ جنگ

سے سرخرو ہو کر آؤ۔ ہم گھروں کی چار دیواری میں تمہاری عزّت اور آبرو کی حفاظت کریں گی۔ اپنے بھائیوں سے کہو کہ وہ میدان میں جا کر دشمن کے تیر سینوں پر کھائیں۔ اور تم ان پر فخر کرو گی۔ اپنے بیٹوں سے کہو کہ اگر تم نے میدان میں بُزدلی دکھائی اور تمہارا خون ایڑیوں پر گرا تو تم قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دامن رحمت تھام کر یہ کہو گی کہ حضور خدا کے سامنے میرے بیٹے کی شفاعت نہ کیجیے۔ اس نے میرے دودھ کی لاج نہیں رکھی۔"

ثریا کی آواز خیمے سے باہر دور تک جا رہی تھی۔ طاہر اور تیمور ملک کے علاوہ باقی سپاہی اور افسر ایک دوسرے کا اشارہ پا کر باہر جمع ہو چکے تھے۔ بعض دم بخود کھڑے تھے اور بعض پر رقت طاری ہو رہی تھی۔

ثریا کے خاموش ہو جانے پر تیمور ملک نے باہر سے بلند آواز میں کہا۔

"محترم خاتون! آپ کے بہت سے بھائی باہر کھڑے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں، جن پر تاتاریوں کا نام سن کر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

آپ انہیں بھی حوصلہ دیں۔“

ثریا نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”جو تاتاریوں سے ڈرتے ہیں۔ میں انہیں اپنا بھائی کہنے کے لیے تیّار نہیں۔ انہیں کہہ دیجیے کہ کوئی لڑکی جس نے ایک مسلمان ماں کا دودھ پیا ہے، ایسے بُزدِلوں کو بھائی کہنے کے لیے تیار نہ ہو گی۔ اگر انہوں نے اپنے فرض میں کوتاہی کی تو ہم اپنے کنگن اُتار کر انہیں پہنچا دیں گی اور ان کی زنگ آلو تلواریں اُٹھا کر تاتاریوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گی۔ ہمارے محبت اور اطاعت بہادروں کے لیے ہے۔ بُزدِلوں کے لیے نہیں۔ اگر یہ ہماری عصمت کے نگہبان نہیں بن سکتے تو قیامت کے دن خدا کے غیّور بندوں کی صف میں کھڑا ہونے کی توقع نہ رکھیں۔ دخترانِ اسلام اگر اس دن کسی کو بھائی کہیں گی تو وہ محمد بن قاسم جیسا مجاہد ہو گا جس نے اپنی قوم کی ایک بیٹی کی عصمت بچانے کے لیے سترہ سال کی عمر میں ایک ملک فتح کیا تھا۔ اس دن ہر مسلمان بیوی اپنے بزدل شوہر کو بھول کر اپنی اس بہن کے شوہر پر فخر کرے گی جس کی قبا خونِ شہادت سے رنگین ہو گی۔

اس دن مسلمان مائیں یہ کہیں گی کہ ہمارے بیٹے وہ بزدل نہیں جو دشمن کی تلوار کا وار اپنے سینے پر نہ روک سکیں۔ ہمارے بیٹے وہ مجاہدین ہیں جن کی شجاعت نے خواتینِ اسلام کو دنیا بھر کی عورتوں کی نگاہوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہم فخر کے ساتھ انہیں اپنا بھائی کہیں تو انہیں چاہیے کہ ہمارے سامنے وہ قبائیں پہن کر آئیں جو خون سے رنگین ہوں۔ ہمیں وہ صورتیں دکھائیں جن پر زخموں کے نشان ہوں۔"

ثریا نے تقریر ختم کی تو خواتین آگے بڑھ بڑھ کر اس کے گلے سے لپٹ رہی تھیں اور خیمے سے باہر تیمور ملک طاہر سے یہ کہہ رہا تھا۔ "جب تک ہماری قوم میں ایسی لڑکیاں موجود ہیں۔ ہم اسلام کے دشمنوں کے ساتھ صدیوں تک جنگ کرنے کے بعد بھی ہار نہیں مانیں گے۔ طاہر! تم خوش نصیب ہو۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ تمہاری زندگی کے راستے بلخ پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں۔ اپنے بلند ارادوں کی تکمیل کے لیے تمہیں جس ساتھی کی ضرورت تھی وہ تمہیں مل گیا ہے۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لو۔"

طاہر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک ثریا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ تصوّر میں ثریا کے ساتھ کسی بُلند مینار پر کھڑا نیچے جمع ہونے والے لاکھوں انسانوں کو جہاد کا سبق دے رہا تھا۔ تصوّر کی ایک جہت کے بعد وہ ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں خودرو پھول مسکراتے تھے۔ مہکتی ہوئی ہوائیں اٹکھیلیاں کرتی تھیں۔ اور پہاڑی ندیاں مسرّت کے نہ ختم ہونے والے گیت گاتی تھیں۔ ثریا یہاں بھی اس کے ساتھ تھی اور وہ ندی کے کنارے پھولوں کی سیج پر لیٹ کر اس کے میٹھے اور سہانے گیت سن رہا تھا۔

پھر وہ میدانِ کارزار میں تھا اور ثریا اس کے زخموں پر مرہم پٹی کر رہی تھی۔ کئی دنوں کے بعد پہلی بار اسے ایک اور لڑکی کا خیال آیا۔ یہ صفیہ تھی۔ شاید اس لیے کہ ثریا اور صفیہ میں کوئی خاص بات مشترک تھی۔ یا شاید اس لیے کہ ثریا سے پہلے اس کے ذہن میں صرف صفیہ کا دھندلا سا خاکہ تھا۔ صفیہ کے متعلق اس نے اس سے زیادہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے اس کے ساتھ غایت درجہ کی ہمدردی تھی۔ ایک ایسی ہمدردی جو کسی

انعام کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دل میں کوئی خلش یا دھڑکن محسوس کیے بغیر صفیہ کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ لیکن ثریا سے متعلق اس کے احساسات مختلف تھے۔ وہ اپنی بے پناہ قوّتِ تسخیر کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ تاہم اسے یہ اطمینان تھا کہ بلخ سے ان کے مستقبل کے راستے جدا ہو جائیں گے اور اس کے دل میں صرف ایک خوش گوار یاد باقی رہ جائے گی اور یہ یاد بھی شاید اسے زیادہ دیر پریشان نہ کرے۔

تیمور ملک تھوڑی دیر غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ بولا۔ ”تم پریشان کیوں ہو؟ اگر کہو تو اس معاملے میں تمہاری رہنمائی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں!“ طاہر نے چونک کر کہا۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی میری زندگی میں ان باتوں کا وقت نہیں آیا۔“

(۵)

صبح کی نماز کے بعد طاہر، ثریا اور اسماعیل نے سفر کی تیاری کی۔ تیمور ملک نے تھکے ہوئے گھوڑوں کے بدلے انہیں تین تازہ دم گھوڑے دے دیے۔ طاہر نے بیت المال کی اشرفیاں تیمور ملک کے سپرد کیں۔ تیمور ملک نے راستے کے شہروں کے حکام کے نام یہ مراسلہ لکھ دیا کہ انہیں راستے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس کے علاوہ اس نے ابتدائی دو منازل میں خطرہ محسوس کرتے ہوئے بیس سواروں کو ان کی حفاظت کے لیے روانہ کر دیا۔

رخصت کے وقت طاہر سے مصافحہ کرتے ہوئے تیمور ملک نے کہا۔ ”میرا مکتوب تمہیں نہ صرف بغداد تک پہنچنے میں مدد دے گا بلکہ حالات نے تمہیں واپس آنے پر آمادہ کیا تو بھی تمہارے کام آئے گا۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔“

اس کے بعد ثریا سے مخاطب ہوا۔ ”میری بہن! آپ کو راستے میں انشاء اللہ

کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ آپ کا رفیقِ سفر ایک ایسا نوجوان ہے جو ایک دفعہ میری جان بچا چکا ہے۔"

"میں انہیں جانتی ہوں۔" ثریا نے یہ کہتے ہوئے طاہر کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر حیا کی سُرخی یہ کہہ رہی تھی۔ آپ انہیں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ سارا دن سفر کرنے کے بعد یہ لوگ شام کے وقت ایک فوجی چوکی پر ٹھہر گئے۔

دوسری شام ایک شہر میں پہنچ کر طاہر نے محافظ دستے کو واپس بھیج دیا۔ شہر کے حاکم نے تیمور ملک کا مکتوب دیکھ کر ان کی کافی آؤ بھگت کی۔ صبح جب ثریا حاکمِ شہر کے گھر کی عورتوں کو الوداع کہہ کر باہر گئی تو وہ مردانہ لباس کی بجائے عورتوں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔

جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر سے باہر نکلے تو ثریا نے شرماتے ہوئے کہا۔ "میں نے لباس اس لیے تبدیل کیا ہے کہ اب ہمیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ تاتاری اپنی پوری قوّت کے ساتھ سمرقند

اور بخارا کا رُخ کر رہے ہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "اسی لیے بہت جلدی بغداد پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

ثریا نے کہا۔ "آپ کو میری وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے اب راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو میں اگلے شہر کے حاکم سے کہوں گی کہ مجھے بلخ پہنچانے کا انتظام کر دے اور آپ وہاں سے سیدھے بغداد روانہ ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔" اسماعیل نے کہا۔ "میں آپ کو بلخ پہنچنے سے پہلے نہیں جانے دوں گا۔"

یہ دراصل ثریا کے دل کی آواز تھی۔ طاہر نے کہا۔ "اچھے بھائی! میں تمہارے لیے غزنی تک جانے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

اسماعیل نے کہا۔ "خدا مجھے بلخ سے آگے نہ لے جائے۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔ لیکن بلخ میں آپ کو چند دن ہمارا مہمان رہنا پڑے گا۔"

طاہر نے جواب دیا۔ ”یہ نہیں ہو گا۔ بلخ کے دروازے پر پہنچ کر میرا اور تمہارا راستہ مختلف ہو گا۔“ اسماعیل نے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ نانا کے گھر تک نہیں جائیں گے؟“

”کاش میرے پاس وقت ہوتا!“

اسماعیل نے مایوس ہو کر کہا۔ ”پھر آپ کبھی نہیں آئیں گے؟“

اسماعیل کے اس سوال پر ثریا کا دل دھڑکنے لگا۔ طاہر نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ”اگر مجھے زندگی میں کوئی فرصت کا لمحہ مل سکا تو انشاءاللہ ضرور آؤں گا۔“

”تو پھر بلخ میں ہمارا گھر ضرور دیکھتے جائیں۔“

”تمہارے نانا کا نام کیا ہے؟“

”عبدالرحمٰن۔“

طاہر اور اسماعیل دیر تک باتیں کرتے رہے اور ثریا اپنے دل میں بار بار

طاہر کا یہ فقرہ دہرا رہی تھی۔ اگر مجھے زندگی میں کوئی فرصت کا لمحہ مل سکا تو انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ اور اس کا دل بار بار یہ سوال پوچھ رہا تھا کہ کیا اس نے یہ بات فقط اسماعیل کی تسلّی کے لیے کہی ہے یا اسے یہ معلوم ہے کہ اسماعیل سے کہیں زیادہ کسی اور بغداد سے آنے والے قافلوں کا انتظار رہے گا۔

اب تک طاہر کی زبان سے اس نے ایسا لفظ بھی نہیں سنا تھا، جس سے اس پر ظاہر ہوتا کہ زندگی کی بلند منازل کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس کے دل میں اپنے راستے کی بھولی ہوئی منزل کے ساتھی کی یاد باقی رہے گی۔ اسے طاہر کے بلند نصب العین پر فخر تھا۔ وہ اس کی شخصیت کو ہر لحاظ سے قابلِ احترام سمجھتی تھی۔ اسے اس بات پر مسرت تھی کہ اس میں مردانگی کے تمام جوہر تھے۔ اس کی نگاہوں میں نیکی، شرافت، شجاعت اور پاکیزگی تھی۔ وہ سب کچھ تھا جس کی قوم کو ضرورت تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ تھا جس کی ثریا تمنا کر سکتی تھی۔

(٦)

جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی۔ دونوں کے دل کی خلش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شاید دونوں کی یہ شکایت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے دل کی کیفیت سے اب تک کیوں بے خبر ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے لیکن ان کی آنکھیں اُوپر اُٹھنے سے انکار کر دیتیں۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتے لیکن ان کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔

آخر ایک دن وہ اس چوراہے پر کھڑے تھے جہاں بغداد اور بلخ کو جانے والے راستے ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے۔ اسماعیل کا گھوڑا چند قدم آگے تھا۔ اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا اور کہا۔ ”آپ یہاں کیوں کھڑے ہو گئے؟ آیئے نا!“

طاہر نے کہا۔ ”ٹھہرو اسماعیل!“

”مجھ سے اب گھوڑے پر نہیں بیٹھا جاتا۔ یہ کہتے ہوئے اس میں گھوڑے سے اُترا اور اس کی باگ پکڑ کر چند قدم پیدل چلنے کے بعد ایک پتھر پر بیٹھ

گیا۔“

ثریانے طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اس کا خیال ہے کہ آپ گھر تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ میری طرف سے اسے سمجھا دیں۔ یہاں سے رُخصت ہو کر میں شام سے پہلے ایک منزل طے کر لوں گا۔“

ثریانے مغموم لہجے میں کہا۔ ”میں اسے سمجھا دوں گی۔“

”اچھا خدا حافظ!“

ثریا کے ہونٹ کپکپا اُٹھے۔ اس نے خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کا گلا بیٹھ گیا۔ زبان رُک گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طاہر نے گھوڑے کی باگ موڑنے کا ارادہ کیا لیکن ہاتھوں کو جنبش نہ ہوئی۔

”جائیے۔“ ثریا نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

"ثریا!" طاہر نے کہا۔ "اس درخت کی طرف دیکھو۔ باقی تمام درختوں کے پتے جھڑ چکے ہیں۔ لیکن وہ سبز ہے۔"

ثریا مُڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ طاہر نے کہا۔ "اب میری طرف نہ دیکھنا۔ میں تم سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

ثریا نے کہا۔ "کہیے۔ اگر آپ میرے آنسوؤں سے متاثر ہوئے ہیں تو یقین کیجیے کہ یہ تشکّر کے آنسو تھے۔ میں اپنے محسن کو آنسوؤں کے سوا کیا دے سکتی ہوں۔"

طاہر نے کہا۔ "ثریا یہ نہ سمجھو کہ تمہارے جذبات سے واقف نہیں اور یہ بھی نہ سمجھو کہ میرے دل میں ان آنسوؤں کی کوئی قیمت نہیں۔ میری صاف بیانی سے غلط اندازہ نہ لگائیں۔ میں یہ باتیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایسے پر آشوب زمانے میں کہنے اور سُننے کا موقع بار بار نہیں ملتا۔ میں کل دوبارہ ملنے کی توقع پر آج تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کل بہت جلد آ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کل کے انتظار میں کئی برس

گزر جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کل کبھی نہ آئے۔ بہر حال اگر قدرت نے ہمیں زندگی کے چوراہے پر پھر ایک بار اکٹھا کر دیا تو میں زندگی کی آخری منزل تک تمہاری رفاقت اپنے لیے قدرت کا سب سے بڑا انعام سمجھوں گا۔ سرِ دست میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میرا فرض مجھے بغداد بلا رہا ہے اور اس کے بعد میں تاتاریوں کے خلاف خوارزم کے ہر مورچے پر پہنچنا اپنا فرض سمجھوں گا۔ تم اس وقت کے لیے دُعا کرو جب میں فتح کی خبر لے کر بلخ پہنچوں جب میری قبا میرے خون سے رنگین ہو اور میرے چہرے پر زخموں کے نشان ہوں۔

"ثریا نے مُڑ کر طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں آپ کا انتظار کروں گی۔ کاش میں ان مورچوں پر آپ کا ساتھ دے سکتی۔"

اس کی آنکھوں میں اُمّید کی روشنی تھی اور طاہر محسوس کر رہا تھا کہ چاند بادلوں کے نقاب سے اچانک باہر نکل آیا ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بعد ثریا بولی۔ "اب میں آپ سے ایک درخواست کروں گی۔"

"کہو۔"

”آپ نانا کے گھر تک ہمارا ساتھ ضرور دیں۔ میں آپ کو صرف ایک بار وہ دروازہ دکھانا چاہتی ہوں جو آپ کے لیے ہر وقت کھلا رہے گا تاکہ آپ جب دوبارہ بلخ آئیں تو ہمارے گھر کا کوئی آدمی یہ خیال نہ کرے کہ آپ اجنبی ہیں۔ آپ نانا جان سے ملیں۔ وہ خوش ہوں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو آج نہیں تو کل علی الصبح ضرور روانہ کر دوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دو دن کا سفر ایک دن میں طے کر سکتے ہیں۔ میرے لیے!“

طاہر نے کہا۔ ”چلیے۔“

اسماعیل چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر ایک پتھر کا نشانہ کر رہا تھا۔ طاہر اور ثریا کو قریب آتے دیکھ کر وہ اُٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سپاہی اور تاجر

شیخ عبدالرّحمٰن دوہرے جسم اور موٹے دماغ کا ایک متمول تاجر تھا۔ اس کا مکان بلخ کی چند شاندار عمارتوں میں سے ایک تھا۔ اس کا وسیع کاروبار دور دراز کے شہروں میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے تجارتی قافلے بخارا اور بغداد سے لے کر دہلی تک آتے جاتے تھے۔ رہائشی مکان کے ساتھ ایک اور وسیع عمارت میں اس کا دفتر تھا۔ تاتاریوں کے حملے نے اسے خوارزم سے کاروبار سمیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بخارا اور سمرقند سے اس کے قاصد نہایت پریشان کن خبریں لا رہے تھے۔ چند ہفتے پہلے اس نے بلخ کو محفوظ سمجھتے ہوئے اپنا مال و متاع وہاں جمع کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اب وہ اپنا قیمتی مال واسباب غزنی بھیج رہا تھا۔

طاہر کو جس کمرے میں ٹھہرایا گیا وہ بیش قیمت ایرانی قالینوں اور اطلس و کمخواب کے پردوں سے آراستہ تھا۔ اس نے اسماعیل کے ساتھ پاس کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی اور شہر کے پر رونق بازار کا ایک چکر لگانے کے بعد واپس آ گیا۔

وہ اسماعیل کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ کمرے میں ایک معمّر خاتون داخل ہوئی۔ اسماعیل نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”نانی جان آئی ہیں۔ نانی جان آئی ہیں۔“ طاہر بھی اٹھ کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ حنیفہ کی آنکھوں سے حزن و ملال ٹپکتا تھا۔ اس نے آتے ہی کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”نوجوان! میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ خدا تمہیں جزا دے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں اپنے آپ کو شکریہ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میرا فرض تھا۔ مجھے اسماعیل کے والد کے متعلق افسوس ہے۔“ حنیفہ نے گردن اُوپر اٹھائی اور کہا۔ ”وہ مرا نہیں شہید ہوا ہے۔ مجھے اس سے یہی توقع تھی۔ مجھے ثریا نے بتایا ہے کہ تم علی الصبح بغداد روانہ ہو جاؤ گے؟ میں

تمہیں ضروری کام سے روکنا نہیں چاہتی لیکن اگر پھر بھی اس راستے سے گزر ہو تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ بغداد پہنچ کر یہ بھول نہ جانا کہ بلخ میں ایک عرب ماں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔"

پھر وہ اسماعیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بیٹا تمہارے نانا نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ مہمان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا۔ ان کے پاس بہت سے تاجر آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ یہاں آنا بھول ہی جائیں۔"

کمرے سے نکلتے ہوئے حنیفہ دروازے پر رُکی اور طاہر کو آواز دی اور طاہر کے دل میں ایک خفیف سی دھڑکن پیدا ہوئی۔ یہ ثریا کی آواز تھی۔

اسماعیل دروازے سے پردہ ہٹا کر ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولا۔ "آپا کا خیال ہے کہ شاید نانا جان کو آنے میں دیر ہو جائے۔ چلیے آپ کھانا کھا لیں!"

طاہر نے کہا۔ "کیا یہ بہتر ہو گا کہ ہم تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں؟"

اسماعیل نے جواب دیا۔ "نانا جان کا کچھ پتہ نہیں۔ نانی جان کہتی ہیں کہ وہ

کبھی کبھی آدھی رات تک دفتر میں حساب کتاب دیکھتے رہتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔" طاہر یہ کہہ کر اُٹھا اور اسماعیل کے ساتھ برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔

(۲)

دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ ایک حبشی غلام ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک کونے میں کھڑا تھا۔ تکلفات میں یہ دستر خوان بغداد کے کسی امیر کے دستر خوان سے کم نہ تھا۔

طاہر نے بیٹھے ہوئے اسماعیل سے سوال کیا۔ "اور مہمان بھی آئیں گے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں۔ باقی مہمانوں کا کھانا باہر کے مہمان خانے میں بھیج دیا گیا ہے۔ آپا جان کہتی تھیں کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ آپ سے ساری رات سوالات پوچھتے رہتے۔ اس لیے آپ کے لیے یہاں انتظام کیا گیا ہے؟"

کھانا کھانے کے بعد طاہر نے اسماعیل کے ساتھ مسجد میں جا کر عشاء کی نماز ادا کی اور واپس کمرے میں آ کر اس نے اسماعیل سے کہا۔ ”اب تمہیں نیند آ رہی ہو گی۔ جاؤ سو جاؤ!“

اسماعیل اٹھ کر دروازے تک پہنچا لیکن کچھ سوچ کر پھر لوٹ آیا۔ طاہر نے پوچھا۔ ”کیوں بھئی، کیا بات ہے؟“

اسماعیل نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے سوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“

طاہر نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں مل کر جاؤں گا۔ جاؤ اب آرام کرو۔“

اسماعیل مطمئن سا ہو کر باہر نکل گیا۔

نوکر نے انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ پر لکڑیاں لا کر پھینک دیں اور طاہر کرسی سے اُٹھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی وہ نیم خوابی کی حالت میں تھا کہ اسماعیل پھر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ”نانا جان آپ سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔“

طاہر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک درمیانے قد کا موٹا تازہ معمّر آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ طاہر نے جلدی سے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔

شیخ عبدالرحمٰن نے طاہر کو دو تین بار سر سے لے کر پاؤں تک گھور کر دیکھا اور کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔

”آپ کا نام طاہر ہے ؟“

”جی ہاں۔“

”آپ عرب ہیں ؟“

”جی ہاں۔“

”تاتاریوں کے حملے کے وقت آپ قوقند میں تھے ؟“

”جی ہاں۔“

”آپ وہاں کیا کام کرتے تھے۔“

”میں وہاں تیمور ملک کا ایک سپاہی تھا۔“

عبدالرحمٰن نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”وہ بدنصیب بھی ایک سپاہی تھا۔“

”کون؟“ طاہر نے سوال کیا۔

”نصیر الدّین۔ ان بچّوں کا باپ۔ میں نے اپنی بیوی کو بہت سمجھایا تھا کہ ایک سپاہی کے ساتھ میری لڑکی کی شادی نہ کرو۔ جب وہ بے چاری مر رہی تھی، یہ حضرت مصر میں نصرانیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس کے بعد اسے خوارزم شاہ کی خدمت کا شوق چرایا۔ اب ان بچّوں کی نانی رو رہی ہے۔ بھلا ایسے داماد کے متعلق اور کیا خبر ہو سکتی تھی؟ سپاہی یا جنگ میں کام آتا ہے یا زخمی ہوتا ہے۔ اب رونے سے کیا فائدہ؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”معاف کیجیے۔ قوم کے سرفروش سپاہیوں کے متعلق میری رائے آپ کی رائے سے مختلف ہے۔“

عبدالرحمٰن نے کہا۔ ”آپ برا نہ مانیے۔ میں اس موضوع پر بحث نہیں کیا کرتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے

اور آج تک میرے جسم پر خراش تک نہیں آئی۔ میں ایک دفعہ سرکش گھوڑے سے گرا تھا۔ اس کے بعد میں گھوڑے کی لگام کو ہاتھ لگانے سے پہلے اس کا حسب نسب پوچھ لیتا ہوں۔ لیکن میں ان نوجوانوں پر حیران ہوں جو بار بار زخمی ہونے کے باوجود بھی تلواروں سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "قوم کی عزّت اور آزادی صرف ایسے ہی نوجوانوں کے دم سے قائم ہے۔ اگر قوم کے تمام افراد آپ کی طرح جسم پر خراش تک آنے سے ڈرنے لگیں تو تاتاری ہمارے لیے اس زمین پر سانس تک لینا دشوار کر دیں گے۔"

"آپ نے غلط سمجھا۔ مجھے عام سپاہیوں سے نفرت نہیں۔ مجھے صرف ان لوگوں کے خلاف شکایت ہے جن کو گھر میں آرام میسّر ہوتا ہے لیکن وہ صرف اپنے عزیزوں کو رلانے کے لیے میدانِ جنگ میں چلے جاتے ہیں۔ نصیر الدّین ایسے ہی آدمیوں میں سے تھا۔"

طاہر نے کہا۔ ”قوم کی عزّت اور آزادی کے لیے لڑنا ہر شخص کا فرض ہے۔ یہاں عام اور خاص کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی نگاہ میں امیر اور غریب کے خون کی قیمت ایک ہی ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر قوم آزاد ہو تو امراء زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے قربانی کے وقت انہیں قوم سے پیچھے نہیں بلکہ آگے رہنا چاہیے۔“

عبدالرحمٰن نے اس بحث میں لاجواب سا ہو کر گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے اسماعیل سے کہا۔ ”کیوں اسماعیل! تم تاجر بنو گے یا سپاہی؟“ ”میں سپاہی بنوں گا اور تاجر بھی بنوں گا۔“

عبدالرحمٰن نے پریشان ہو کر طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ صُبح جانا چاہتے ہیں؟“

”جی ہاں! میں آج ہی جانا چاہتا تھا لیکن آپ سے ملاقات کے شوق میں ٹھہر گیا۔“

”بہت اچھا۔ میں صُبح ضرور ملوں گا۔ یہ کہہ کر وہ اسماعیل کا بازو پکڑ کر باہر

نکل گیا۔ بالا خانے کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے نانا اپنے نواسے سے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

”بے وقوف! میں نے خوارزم شاہ کو دو لاکھ دینار بھیجے ہیں۔ اس رقم سے وہ کئی اور سپاہی اپنی فوج میں بھرتی کر سکتا ہے۔ میرا مقصد سپاہیوں کی توہین نہ تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تاجر بھی اپنا کاروبار سنبھل کر قوم کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر تمہارا باپ خوارزم شاہ کے لیے جان دینے کی بجائے تجارت میں میرا ساتھی ہوتا تو ہم لاکھوں کا کاروبار اور بڑھا سکتے تھے اور خوارزم شاہ کو بہت زیادہ مدد دے سکتے تھے۔“

اسماعیل کہہ رہا تھا۔ ”ابّا جان نے خوارزم شاہ کے لیے جان نہیں دی۔ انہوں نے ہماری آزادی اور عزّت کے لیے جان دی ہے۔“

اور وہ غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اس لیے تو وہ انہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نوجوان کو تمہاری مدد کے لیے بھیج دیا۔ ورنہ نہ معلوم تمہارا کیا حشر ہوتا لیکن تمہیں بحث کرنا کس نے

سکھا دیا۔ چلو!"

طاہر کو دوبارہ سیڑھیوں پر ان کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور وہ مُسکراتا ہوا بستر پر لیٹ گیا۔

(۳)

صُبح مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد جب طاہر دوبارہ اپنے کمرے میں آیا تو اسماعیل وہاں موجود تھا۔ وہ بولا۔ "دوسرے کمرے میں ناشتہ تیار ہے۔"

طاہر ناشتہ کھا کر فارغ ہوا تو ایک نوکر نے آکر کہا۔ "آقا آپ کو بلاتے ہیں۔"

طاہر اسماعیل کی رہنمائی میں کمرے میں سے نکل کر ایک کشادہ برآمدے میں چند قدم چلنے کے بعد سیڑھیوں پر چڑھا اور بالائی منزل کے ایک خوش نما کمرے میں داخل ہوا۔ عبدالرحمٰن ایک قالین پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چاندی کے طشت میں ایک تھیلی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر طاہر کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے پاس

بٹھاتے ہوئے کہا:

"آپ کا گھوڑا تیار ہے۔ ثریا کہتی تھی کہ آپ کا ایک دن ضائع ہوا۔ اس لیے میں آپ کو اپنے اصطبل کا بہترین گھوڑا دے رہا ہوں۔ میں شہر کے گورنر سے بھی مل چکا ہوں۔ اس نے راستے کی چوکیوں کے نام یہ مراسلہ لکھ دیا ہے۔ لیجیے۔"

طاہر نے عبدالرحمٰن کے ہاتھ سے گورنر کا مراسلہ لیتے ہوئے کہا۔ "شکریہ! لیکن میرے پاس تیمور ملک کا مکتوب تھا۔"

مجھے ثریا نے یہ بتایا تھا لیکن تیمور ملک کے اقبال کا ستارہ ان دنوں گردش میں ہے، مجھے ڈر تھا کہ شاید بلخ کے گورنر کے سپاہی اس کے مکتوب کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ثریا نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ آپ کو تیمور ملک کا ساتھی سمجھ کر راستے کی چوکیوں کے افسر آپ سے طرح طرح کے سوالات پوچھیں گے اور آپ کا بہت سا وقت ضائع کریں گے۔"

طاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اس تکلیف کے لیے آپ کا شکر گزار

ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"ٹھہریے!" عبد الرحمٰن نے چاندی کا طشت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ "میں آپ کی تکلیف کا صلہ نہیں دے سکتا۔ میری طرف سے یہ حقیر نذرانہ قبول کیجیے۔"

طاہر کی خوب صورت اور کشادہ پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں نمودار ہوئیں اور اس نے عبدالرحمٰن کے ہاتھوں سے طشت لے کر رکھ دیا اور تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"دو ہزار اشرفیاں، لیکن اگر آپ اسے کم سمجھیں تو میں انہیں دوگنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ کو میرے متعلّق غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔" یہ کہتے ہوئے طاہر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن عبدالرحمٰن پریشان سا ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنی قبا کا دامن مسل رہا تھا۔

"تم خفا ہو گئے۔ کیسی غلط فہمی؟ میں تمہاری بڑی سے بڑی توقع پوری

کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ثریا اور اسماعیل کو ہیروں سے تول کر تمہیں دے سکتا ہوں۔ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ تم دل کھول کر مانگو اور میں دل کھول کر دوں گا۔ خدا کی قسم ثریا اور اسماعیل کی جان بچانے والا میرے گھر سے ناراض ہو کر نہیں جائے گا۔ میں ایک عرب ہوں!"

طاہر نے کہا۔ "میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا اور اگر کچھ کیا ہے تو وہ میرا فرض تھا۔ آپ عرب ہیں تو میں بھی ایک عرب ہوں۔ لیکن عرب ہونے سے پہلے ہم دونوں مسلمان ہیں اور مسلمان کسی کے خلوص کو پیسوں سے تولا نہیں کرتے۔" عبدالرحمٰن اپنی قبا کو اب بُری طرح مسل رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن عقب کے کمرے کے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو جنبش ہوئی اور ثریا نے اچانک نمودار ہو کر عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نانا جان!" ثریا نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کو نانی جان بلاتی ہیں۔"

عبد الرحمٰن کچھ کہے بغیر ثریا کے ساتھ عقب کے دروازے کی طرف چل دیا اور ثریا اسے دروازے تک پہنچا کر طاہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک ثانیے کے لیے وہ خاموشی سے طاہر کی طرف دیکھتی رہی اور جب پردے کے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آہٹ سنائی دی تو اس نے مغموم اور ملتجی لہجے میں طاہر سے کہا۔ ”میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ میں سب باتیں سن چکی ہوں۔ مجھے اُمّید ہے کہ نانا جان کو ایک سادہ لوح تاجر سمجھ کر ان کی غلطی سے درگزر کریں گے۔ وہ تجارت کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ ان کے لیے ساری دنیا ایک منڈی ہے۔ وہ جب رات کے وقت آسمان پر جھلملاتے تارے دیکھتے ہیں تو بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ آپس میں لین دین کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے آپ یہاں سے خفا ہو کر نہ جائیں۔ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ ورنہ میں انہیں سمجھا دیتی۔ کہیے آپ ان کی غلطی معاف کرتے ہیں یا نہیں۔ میرے لیے؟“

طاہر مُسکرایا اور ثریا نے محسوس کیا کہ اس کے آسمان سے غم کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اس نے کہا۔ ”ثریا تم پریشان کیوں ہو۔ تمہارے لیے

میں زہر میں بجھے ہوئے تیر بھی اپنے سینے پر کھا سکتا ہوں اور تمہارے نانا جی نے تو مجھے کچھ کہا ہی نہیں۔ میرے دل میں ان کی بہت عزّت ہے۔ اپنے زاویہ نگاہ سے انہوں نے کوئی بُری بات نہیں کی۔ فرض کرو اگر میرے پاس کچھ نہ ہوتا تو میری ضروریات کا احساس کرنا ان کا فرض نہ تھا؟" ثریا مُسکرائی اور اس کی مسکراہٹ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بھر آئے۔ طاہر بیک وقت اس کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں پر حیران تھا۔ اس نے سورج کی ابتدائی کرنوں میں پھولوں کو بیدار ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے گلاب کے کٹوروں میں شبنم کے موتی دیکھے تھے لیکن ثریا کی آنکھیں شبنم میں نہائے ہوئے پھولوں سے کہیں زیادہ دلفریب تھیں۔ اس کے ہونٹ سورج کی سنہری کرنوں میں مسکرانے والی کلیوں سے زیادہ جاذبِ نظر تھے۔

ایک بہادر عورت موت کے سامنے مُسکرا سکتی ہے۔ انتہائی کرب کی حالت میں اپنے آنسو ضبط کر سکتی ہے لیکن اچانک مسرّت کا پیغام سن کر

جب وہ مُسکراتی ہے تو آنکھیں بے اختیار دبے ہوئے آنسوؤں کے خزانے لٹا دیتی ہے۔

ثریا نے کہا۔ ”آپ تھوڑی دیر یہاں ٹھہریے۔ نانی جان آپ کو خدا حافظ کہنے آئیں گی۔ اسماعیل انہیں جانے نہ دینا!“

ثریا برآمدے میں سے گزر کر ساتھ کے کمرے میں داخل ہوئی اور جلدی سے یہ کمرہ عبور کرنے کے بعد عقب کے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ اس کمرے کی طرف جاتا تھا جہاں اس کی نانی اور نانا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نیم وا دروازے کے آگے لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر وہ کچھ دیر اُن کی باتیں سنتی رہی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ اپنے گالوں اور کانوں میں ایک حرارت سی محسوس کرنے لگی۔

شیخ عبدالرحمٰن کہہ رہا تھا۔ ”ثریا بھی یہی چاہتی ہے؟“

اور ثریا کی نانی کا جواب تھا۔ ”اور ثریا اگر یہ نہ چاہتی تو میں اسے بے وقوف سمجھتی۔ تم خود سوچو اگر تم خود ثریا کی جگہ ہوتے تو تمہارے دِل میں ایسے

نوجوان کے لیے ایک نہ مٹنے والی خواہش بیدار نہ ہوتی؟"

عبدالرحمٰن نے قدرے تامّل کے بعد جواب دیا۔ "اس میں شک نہیں کہ وہ خوش وضع ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ شریف ہے۔ عالی نسب بھی معلوم ہوتا ہے، میر چشم بھی ہے۔ لیکن اگر ثریا کی جگہ میں ہوتا تو شادی کے لیے ایسے نوجوان کو منتخب کرنے کی حماقت نہ کرتا جو آٹھوں پہر سر ہتھیلی پر رکھے پھرتا ہو۔ بہر حال مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ تم آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں مجھ سے ثریا کے متعلق اپنا فیصلہ منوا کر رہو گی اس لیے میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ تم مطمئن رہو۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں لیکن وہ چلا نہ گیا ہو۔ "اسماعیل! اسماعیل!" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"جی!" اسماعیل کی آواز آئی۔

"مہمان یہیں ہے؟"

"جی ہاں!"

”ان سے کہو تھوڑی دیر ٹھہریں۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

حنیفہ نے کہا۔ ”لیکن خدا کے لیے کوئی اور حماقت نہ کر بیٹھنا۔“

اس نے بگڑ کر کہا۔ ”تم اب بھی مُصِر ہو کہ اسے اشرفیاں پیش کرنا حماقت تھی؟“

حنیفہ نے جواب دیا۔ ”مانتے نہیں تو اور کیا تھا۔“

”خدا کی قسم جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ مجھے یہ پہلا شخص ملا ہے جسے دولت سے نفرت ہے۔“

”اچھا اب خدا کے لیے جاؤ لیکن سوچ سمجھ کر بات کرنا۔“

”تو تمہارے خیال میں میں سوچ سمجھ کر بات نہیں کرتا۔ خدا کی قسم دنیا میں صرف تم ہو جسے میں اپنی دانش مندی کا معترف نہ بنا سکا۔ ورنہ بلخ، بخارا اور سمرقند میں کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے میری مدح میں قصیدے نہیں لکھے۔“

”اگر آج تم نے کوئی غلطی نہ کی تو میں بھی ہمیشہ کے لیے تمہاری عقل مندی کی معترف ہو جاؤں گی۔“

”تو پھر دروازے کے قریب بیٹھ کر غور سے باتیں سُنتی رہو۔“

ثریا اپنی توقع سے زیادہ سُن چکی تھی۔ وہ کمرے سے وحشی ہرنی کی طرح بھاگی اور چند کمرے چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا پہنچی۔ قدِ آدم آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کے گال سُرخ ہو رہے تھے۔ اس نے جلدی سے کاغذ اور قلم اُٹھایا اور قالین پر بیٹھ کر لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ یہ ایک خط تھا۔ اس کا پہلا خط۔۔۔“

(۴)

عبدالرحمٰن دوسرے کمرے میں طاہر کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اسماعیل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”بیٹا تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤ۔“

اسماعیل اُٹھ کر برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ عبدالرحمٰن طاہر سے مخاطب ہوا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے لیکن میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ عبد الرحمٰن نے کہا۔ ”ایسی باتوں کے لیے لوگ لمبی چوڑی تمہید باندھا کرتے ہیں لیکن تمہارے جانے کی جلدی ہے اور میں بھی بہت مصروف ہوں۔ مہمان خانے میں بہت سے تاجر ٹھہرے ہوئے ہیں اور مجھے ان سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس لیے میں اس قصّے کو مختصر کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں دولت پیش کی اور وہ تم نے ٹھکرا دی اور سچ پوچھو تو مجھے اس بات پر بہت صدمہ ہوا ہے۔“ طاہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر آپ اس بات پر ابھی تک مصر ہیں تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ جو رقم مجھے دینا چاہتے ہیں وہ خوارزم شاہ کے بیت المال میں بھیج دیں۔ قوم کو اس سے زیادہ ضرورت شاید کبھی نہ ہو۔“

”میں تمہاری یہ خواہش رد نہیں کرتا۔ یہ رقم وہاں بھیج دی جائے گی لیکن اس وقت میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے دل میں ایک ایسی خواہش

ہے جو تم نے ابھی تک مجھ سے بیان نہیں کی۔" عبد الرحمٰن کی بیوی پردے کے پیچھے کھڑی اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔

طاہر نے کہا۔ "تو آپ ہی بتا دیجیے وہ کون سی خواہش ہے؟"

"بات یہ ہے کہ تم اپنے اخلاق اور شرافت سے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔"

طاہر نے کہا۔ "اگر وہ انجام سونے اور چاندی میں نہیں تو میں یقیناً اسے حاصل کرنا اپنی خوش بختی سمجھوں گا۔"

"نوجوان! تم صاف طور پر کیوں نہیں کہتے کہ تم ثریا کے سوا مجھ سے اور کچھ نہیں مانگتے؟"

طاہر نے آنکھیں جھکا لیں۔

"بولتے کیوں نہیں؟"

"شریف نوجوان ایسے موقعوں پر بولا نہیں کرتے۔" یہ کہتے ہوئے حنیفہ

نے دروازے کا پردہ ہٹایا اور اندر آ گئی۔ طاہر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ معمّر خاتون نے طاہر کے سر پر شفقت سے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”جیتے رہو بیٹا! ثریا تمہاری ہے۔ اب جاؤ لیکن جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔ “

(۵)

صبا رفتار گھوڑے ہر جست اسے اس خطۂ زمین سے دور لے جا رہی تھی جہاں ہر ذرّے کے پہلو میں اس نے محبّت کی دھڑکنیں محسوس کی تھیں۔ شیخ عبد الرحمٰن کے محل اور بلخ کے بازاروں میں سے نکلتے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس شہر میں ایک اجنبی نہ تھا۔ ایک بلبل کی طرح جو ایک پھول سے آشنا ہونے کے بعد سارے باغ کو اپنا سمجھ لیتی ہے۔ طاہر کو بلخ کی ہر شے اپنی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جیسے مدّتوں اس شہر میں رہ چکا تھا۔ برسوں اِن فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔

ثریا کو پہلی بار غور سے دیکھنے کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی

تصویر پہلے ہی اس کے دل میں موجود تھی اور اس کی آواز برسوں پہلے اس کے کانوں میں گونج چکی ہے۔ وہ نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔

طاہر کو اچانک ایک خیال آیا اور وہ ایک ہاتھ سے اس تھیلے کو ٹٹولنے لگا جو اس کے پیچھے زین کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ یہ خوب صورت تھیلا اس نے گھوڑے پر سوار ہوتے وقت دیکھا تھا اور اسماعیل نے کہا تھا کہ آپا جان نے اس میں کھانے کی چیزیں رکھوا دی ہیں۔ شہر سے نکلنے کے بعد وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا اور چند کوس تک اسے اس تھیلے کا خیال نہ آیا۔

اس بات سے مطمئن ہو کر کہ تھیلا زین کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا ہے۔ وہ پھر خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ ایک ندی کے کنارے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

پانی پینے کے بعد گھوڑا کنارے پر لگی ہوئی گھاس کے تنکے نوچنے لگا۔ طاہر کو بھوک محسوس ہوئی۔ اس نے اُٹھ کر تھیلا اُتارا اور پھر پتھر پر بیٹھ گیا۔

تھیلا کھولتے ہی اس کی نگاہ کھانے سے پہلے ایک ریشمی رومال پر پڑی۔ اس نے رومال نکالا۔ رومال میں لپٹے ہوئے کاغذ کی سرسراہٹ اور اس کے ساتھ ہی ایک خوش گوار مہک سے طاہر نے اپنے پہلو میں خوش گوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ اس نے رومال میں لپٹا ہوا کاغذ نکالا، کھولا۔ سیاہ الفاظ رنگارنگ کے پھول بن کر اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ اس اپنا تنفّس بھی بار محسوس ہو رہا تھا۔ فضا میں ایک نغمہ گونج رہا تھا۔ ایسا نغمہ جس کی تانیں بہت بلند تھیں۔ آہستہ آہستہ اس نغمے کے سُر دھیمے ہونے لگے۔ رقص کرتے ہوئے پھول سیاہ دھبّوں میں تبدیل ہونے لگے۔ وہ ثریا کا خط پڑھنے لگا۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔ دوسری بار اس کے ہونٹ ہلنے لگے، تیسری بار وہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔

"میرے محسن! تم نے کہا تھا کہ ایسے پر آشوب زمانے میں کہنے اور سننے کا موقع بار بار نہیں آتا۔ میں یہ سطور اسی احساس کے ماتحت لکھ رہی ہوں۔ نانا اور نانی جان میری دائمی حفاظت کے لیے آپ کو منتخب کر چکے ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں نے اپنی بے قراری کا مظاہرہ کر کے اپنے آپ کو ایک مجاہد کی خادمہ بننے کا اہل ثابت نہیں کیا۔ جب آپ بلخ سے کچھ فاصلے پر مجھے خدا حافظ کہنا چاہتے تھے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس وقت میرے لیے یہ احساس ناقابلِ برداشت حد تک تکلیف دہ تھا کہ دنوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی زندگی کی کتاب کا نیا ورق اُلٹنے والے ہیں۔ مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ وقت کے ہاتھ ہمیں پھر ایک بار ایک ہی شاہراہ پر لا کھڑا کریں گے۔ اب میں اپنے دل میں یہ اطمینان محسوس کرتی ہوں اور آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ آپ کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھیں گے۔

میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ بغداد جیسے پر رونق شہر میں پہنچ کر اس چھوٹے سے شہر کو بھول نہ جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ دُعا بھی کرتی رہوں گی کہ میرا خیال آپ کے بُلند اِرادوں میں حائل نہ ہو۔ میری یاد آپ کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائے۔ غالباً نانا اور نانی جان آپ سے بہت جلد بلخ لوٹنے کا مطالبہ کریں گے لیکن میں یہ التجا کرتی ہوں کہ جب تک بغداد

میں آپ کا مقصد پورا نہ ہو، واپس آنے کا ارادہ نہ کریں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں ہمیشہ آپ کی ہوں۔ جب تک سورج دنیا کو صُبح کا پیغام دیتا رہے گا اور رات کے وقت ستارے آسمان پر جگمگاتے رہیں گے، میں آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔ آپ خواہ کہیں ہوں، میرے لیے یہ اِطمینان کافی ہو گا کہ آپ میرے ہیں۔

ثریا"

طاہر نے خط اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس کی بھوک مر چکی تھی۔ اس نے بے توجہی سے چند نوالے کھائے اور تھیلا زین سے باندھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ثریا کے یہ الفاظ ایک نغمہ بن کر گونج رہے تھے۔ آپ خواہ کہیں ہوں میرے لیے یہ اطمینان کافی ہو گا کہ آپ میرے ہیں۔

دعوتِ عمل

زید نے حسب معمول عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اصطبل میں ایک چکر لگایا۔ نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور مکان کے ایک کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شمع بجھانے کے لیے اٹھا لیکن سوچ کر بستر کے پیچھے ہاتھ ڈال کر لوہے کا مضبوط صندوق ٹٹولنے لگا اور زور زور سے صندوق کھینچنے کے بعد مطمئن سا ہو کر اس نے شمع بجھا دی۔ یہ صندوق جس کے اندر طاہر کی باقی دولت کے علاوہ صلاح الدّین ایوبیؒ کی تلوار تھی، جو زید کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ طاہر کے جانے کے بعد اس نے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا تھا۔ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر بغداد کے ان بے شمار چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا

جو اس کے خیال میں طاہر کے چلے جانے کے بعد اس صندوق پر تاک لگائے بیٹھے تھے۔ ابتدائی چند ہفتے تو وہ تلوار ہاتھ میں لیے ساری رات بیٹھا رہتا۔ اس کے بعد اس نے پلنگ پر سونے کی بجائے صندوق پر بستر جما لیا لیکن صندوق لمبائی اور چوڑائی میں چھوٹا تھا، کئی بار وہ کروٹ بدلتے وقت نیچے گر پڑا۔ آہستہ آہستہ اس کے خدشات کم ہوتے گئے اور اس نے صندوق گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے کر لیا۔ اب مکان کے نوکر یہ کہا کرتے تھے کہ رات کو سوتے وقت اس کی بڑبڑانے کی بیماری کم ہو گئی ہے۔

زید کو بھی اچھی طرح نیند نہ آئی تھی کہ اسے پھاٹک کی طرف کھٹکھٹاہٹ اس کے بعد چوکیدار کی آواز اور پھر پھاٹک کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ تلوار سنبھال کر اُٹھا اور بلند آواز میں چلّایا۔ ”کون ہے؟“

اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا اور کواڑ سے کان لگا کر سُننے لگا۔ ایک گھوڑا پھاٹک کے اندر داخل ہو رہا تھا اور نوکر ایک دوسرے کو جگا رہے تھے۔

”زید کہاں ہے؟“کسی نے مکان کے قریب آ کر پوچھا۔

زید کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ یہ طاہر کی آواز تھی۔ جب چوکیدار نے یہ جواب دیا کہ وہ سو رہا ہے تو اس نے چادر اوڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ جھٹ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور بھاگتا ہوا طاہر سے لپٹ گیا۔

”لیکن تمہارے ہاتھ میں ننگی تلوار؟“

”اُف! مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے آپ کو ڈاکو سمجھ کر اسے اٹھایا تھا۔“

طاہر ہنس پڑا اور زید نے محسوس کیا کہ اسے اچانک شکایات کے وہ ہزاروں الفاظ بھول گئے ہیں جنہیں وہ انتظار کی نہ ختم ہونے والی راتوں میں دہرایا کرتا تھا۔ وہ فقط اتنا کہہ سکا۔ ”آپ تندرست تو رہے؟ زخمی تو نہیں ہوئے۔ میں بہت پریشان تھا۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”میں نے کل آپ کے متعلق ایک نجومی سے پوچھا تھا۔“

”اس نے کیا بتایا؟“

”اب اگر وہ مجھے مل جائے تو اس کی کتابیں چھین کر دریا میں پھینک دوں گا۔ جھوٹا فریبی۔ مکّار۔“

”پھر بھی اس نے کیا بتایا تھا تمہیں؟“

”خدا اسے غارت کرے۔ وہ کہتا تھا کہ آپ کا ستارہ گردش میں ہے۔ اور آپ تاتاریوں کی قید میں ہیں اور جب تک ستارے کی گردش ختم نہیں ہوتی، آپ واپس نہیں آئیں گے۔ لیکن ستارے کی گردش ایک سال کے اندر اندر ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس بے ایمان کو خواہ مخواہ ہی پانچ دینار دیے۔ اس نے آپ کے متعلق اور بھی بہت سی واہیات باتیں کی تھیں۔“

طاہر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

زید نے نوکروں کو متوجہ دیکھ کر رازداری کے لہجے میں کہا۔ ”چلیے اندر چلیے!“

طاہر نے باورچی کو کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور زید کے ساتھ اندر چلا گیا۔ کمرے میں پہنچ کر زید نے مشعل جلائی۔ روشنی میں اس کی نگاہیں طاہر کی بلائیں لے رہی تھیں۔ طاہر نے پوچھا۔ "ہاں وہ واہیات باتیں کیا تھیں؟"

"وہ کہتا تھا کہ آپ پر ایک تاتاری شہزادی عاشق ہو جائے گی اور اس کی بدولت آپ تاتاریوں کی قید سے غلامی پائیں گے۔ کل اگر وہ مجھے مل گیا تو اس کی ایسی گت بناؤں گا کہ تمام عمر یاد کرے گا۔"

طاہر نے پوچھا۔ "مدینے سے کوئی خط آیا؟"

"احمد بن حسن یہاں خود آئے تھے اور دو ہفتے رہ کر چلے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ بغداد پہنچتے ہی اپنا حال لکھیں۔"

طاہر نے اپنے دوستوں کے متعلق پوچھا۔ زید نے جواب دیا۔ "مبارک قریباً ہر روز آکر پوچھ جاتا ہے۔ عزیز اور عبد الملک دوسرے تیسرے دن آکر پوچھ جاتے ہیں۔ باقی کبھی کبھی آتے ہیں۔ ہاں ایک بڑھیا بھی یہاں کئی بار آئی اور وہ بھی آپ کے متعلق پوچھا کرتی ہے۔"

"وہ کون ہو سکتی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ میں نے ایک دن اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ دریا کا پل عبور کرنے کے بعد وزیر اعظم کے محل میں داخل ہو گئی تھی۔" طاہر نے کہا۔
"اب میں ایک اہم کام تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ تم ابھی عبد العزیز کے پاس جاؤ۔ انہیں میری طرف سے کہو کہ وہ عبد المُلک اور باقی قابلِ اعتماد دوستوں کو لے کر فوراً یہاں آجائیں۔ اگر وہ سو رہے ہوں تو بھی انہیں کہنا کہ بہت ضروری کام ہے۔ میرا خط لیتے جاؤ۔"

(۲)

طاہر کھانا کھا کر فارغ ہوا تو زید، عبد العزیز، عبد المُلک اور مبارک کو اپنے ہمراہ لے کر پہنچ گیا۔ زید دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور طاہر اپنے دوستوں کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ عبد العزیز کی نگاہ میں خلیفہ، وزیر اعظم اور وحید الدّین تینوں اس سازش شریک تھے۔ مبارک کی اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ وہ صرف عبد العزیز کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

عبد الملک بولنے کی بجائے سوچ رہا تھا۔ جب طاہر نے اس کی رائے دریافت کی تو اس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یہ کہا۔ ”آپ کے ساتھی جو اس سازش کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے تھے، مارے جا چکے ہیں۔ وحید الدّین ابھی تک روپوش ہے، اس کی جگہ اس کا نائب مہلب بن داؤد کام کر رہا ہے۔ جب تک ہم وحید الدّین کا پتہ نہیں لگاتے، ہم کسی پر کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے۔ اگر وہ مر چکا ہے یا کسی نامعلوم قید خانے میں پڑا ہوا ہے تو کم از کم میں اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا اس سازش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“

عبد العزیز نے سوال کیا۔ ”وہ کیسے؟“

عبد الملک نے جواب دیا۔ ”اسے در پردہ مارنے یا قید کرنے میں اس شخص کو دلچسپی ہو سکتی ہے جسے اس کو عوام کے سامنے لانے میں اپنی سازش کا بھانڈا پھوٹ جانے کا ڈر ہو، مثلاً خلیفہ یا وزیر اعظم یا کوئی اور جس نے اس کے نام سے سازش کی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنی مرضی سے نہیں چھپا ہوا ہے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ تنہا ان سب باتوں کا ذمہ

دار ہے۔ اس لیے جب تک ہم وحید الدّین کے نائب ہونے کا راز نہیں کھولتے، ہمیں ان واقعات کا کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے۔"

طاہر نے کہا۔ "یہ راز صرف تین شخصیتوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ خلیفہ، وزیر اعظم اور مہلب بن داؤد۔ میں مہلب کو اس لیے شریک کرتا ہوں کہ وحید الدّین کے غائب ہونے کے بعد تمام حالات میں خلیفہ کو اس کے نائب پر قطعاً بھروسہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک دم وزیر خارجہ بن جانے سے بھی شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تینوں میں سے پہلے کس سے ملوں۔"

عبد الملک نے کہا۔ "سب سے پہلے وزیر اعظم سے ملیں۔ خلیفہ کے وسیع محل میں ایسے اسرار کو جاننے والے ہمیشہ کے لیے دفن ہو سکتے ہیں۔ لیکن وزیر اعظم کے محل میں کم از کم ایک وجود ایسا ہے جسے آپ اپنا کہہ سکتے ہیں۔"

"وہ کون؟" طاہر نے سوال کیا۔

عبد الملک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ بھول گئے؟ میں تو آپ کی خاطر ہر دوسرے یا تیسرے دن اپنی بیوی کو صفیہ کی تسلّی کے لیے بھیجتا رہا ہوں۔“

طاہر نے کہا۔ ”میرے ساتھ آپ کی ہمدردی اخلاقی قیود سے تجاوز تو نہیں کر گئی؟“

”نہیں۔ میں نے صرف ایک دوست کا فرض پورا کیا ہے۔ وہ آپ کے متعلق واقعی بہت پریشان تھی؟“ طاہر نے کہا۔ ”مجھے آپ کو بڑا بھائی بنانے پر اعتراض نہیں لیکن یہ اطمینان رکھیے کہ اس لڑکی سے میرا کوئی سروکار نہیں۔“

”بہر حال اسے آپ سے انس ہے۔ انس نہیں محبت ہے۔ والہانہ محبت۔ میں خوش ہوں کہ وہ اس قابل ہے۔ میری بیوی بھی اس کی بہت تعریف کرتی ہے۔“

چاروں دوست پھر اس موضوع پر لوٹ آئے اور دیر تک بحث کرنے کے

بعد یہ فیصلہ ہوا کہ طاہر سب سے پہلے وزیر اعظم سے ملے۔ عبد العزیز وہیں سو گیا اور عبد الملک اور مبارک اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔

(۳)

علی الصبح نماز سے فارغ ہو کر طاہر وزیر اعظم کے محل پر پہنچا۔ باغیچے میں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں جانب خوش نما پھولوں کی کیاریاں دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے پھولوں کے درمیان ایک خوب صورت لڑکی دکھائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند پھول تھے۔ وہ ایک پودے کے پاس پہنچ کر رُکی۔ جھک کر ایک پھول توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن طاہر کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ طاہر نے ایک ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں جو اس نے دریائے دجلہ کے کنارے دیکھی تھیں اور وہی حسین چہرہ جو اس نے چاند کی روشنی میں اس باغ کے ایک گوشے میں دیکھا تھا۔۔۔ وہ صفیہ تھی۔ وہی صفیہ !

طاہر کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے طاہر جھکا۔ رُکا۔ پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ وزیر اعظم نے اطلاع ملتے ہی اسے اندر بلا لیا۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا۔ "تم نے بہت دیر لگائی، میں مایوس ہو چکا تھا۔ کب پہنچے؟"

طاہر نے ذرا تفصیل کے ساتھ ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ وزیر اعظم کے خیالات کہیں اور ہیں۔ مایوسی سے زیادہ اسے پریشانی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وزیر اعظم اور ابو اسحاق، کمال اور جمیل کے متعلق پوچھے گا لیکن اسے جیسے ان کے متعلق یاد بھی نہ تھا۔

طاہر نے ابھی تک تفصیل کے ساتھ قراقرم پہنچنے کے حالات بیان نہ کیے تھے کہ وزیر اعظم نے بات کاٹ کر سوال کیا۔ "خلیفہ کا خط پڑھ کر چنگیز خان نے کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ ہم خوارزم پر چڑھائی کرنے کا ارادہ ترک کر چکے

ہیں۔"

"جھوٹا! فریبی!!" اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

طاہر نے کچھ سوچ کر کہا۔ "لیکن چنگیز خان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے خلیفہ کے غیر جانب دار ہونے کے متعلق اطمینان ہو چکا ہے۔ شاید قراقرم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو چنگیز خان کو تسلّی دے رہے ہیں کہ خوارزم شاہ کے متعلق خلیفہ کا ظاہر باطن ایک نہیں۔"

"یہ تو ہر احمق کو علم ہے اور میں چنگیز خان کو احمق نہیں سمجھتا۔ بہر حال مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تمہیں وہاں بھیجا گیا۔ اب دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ہم نے در پردہ چنگیز خان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ سپہ سالار کے مستعفی ہو جانے سے اس قسم کے شکوک اور بڑھ جائیں گے۔"

"سپہ سالار مستعفی ہو گئے؟"

وزیر اعظم اس سوال پر چونکا۔ "ابھی یہ خبر کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ میں

کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ اس وقت ہمیں ان کی ضرورت ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "وحید الدّین کے متعلق کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں اور مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"میں خلیفہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس بارے میں میری کوئی مدد کریں گے؟"

وزیر اعظم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "خلیفہ کو نوجوانوں کے جذبات کا کوئی لحاظ نہیں۔ تم انہیں یہ کہو گے کہ خوارزم شاہ کی مدد کا فوراً اعلان کر دیا جائے اور تمہیں وہی جواب ملے گا جس سے مایوس ہو کر سپہ سالار مستعفی ہونا چاہتا ہے اور وہ جواب یہ ہے تمہیں ہم نے کب سے مشیر بنایا ہے؟"

"ممکن ہے کہ سامنے آنے والے خطرات کا صحیح نقشہ پیش کر سکوں اور۔۔۔"

وزیر اعظم نے بات کاٹ کر کہا۔ ”برخوردار بغداد میں سمجھانے والوں کی کمی نہیں۔ تم جاؤ۔ میں وقت آنے پر تمہیں بلالوں گا۔ تمہارے لیے میں کوئی موزوں عہدہ سوچ رہا ہوں۔ چند دنوں تک تمہیں اطلاع مل جائے گی۔“

طاہر نے کہا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ صورت حالات میں سلطنت میں کسی عہدے پر فائز ہو کر کوئی شخص قوم کی صحیح خدمت سر انجام نہیں دے سکتا۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر میں اپنے آپ کو قوم کا ایک جاں نثار سپاہی ثابت کر سکوں گا۔“

(۴)

صفیہ اپنے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ باغ میں گزرنے والی نہر کے کنارے کھڑی تھی۔ وہ ایک پھول کو بہتے ہوئے شفاف پانی میں پھینک دیتی اور جب وہ کچھ دور نکل جاتا تو وہ دوسرا پھول پھینک دیتی۔ جب گلدستہ ختم ہو جاتا وہ پاس کی کیاریوں سے نئے پھول توڑ کر گلدستہ بناتی اور

پھر اسی کھیل میں مشغول ہو جاتی۔

صفیہ کا تیسرا گلدستہ تقریباً ختم ہو چکا تھا کہ اسے طاہر ڈیوڑھی سے نکل کر دروازے کی سیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے سنگ مرمر کے پل پر سے گزر کر نہر عبور کی اور اس کی کیاری سے پھول توڑنے لگی۔ طاہر قریب آ رہا تھا۔ صفیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ تاہم اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے پھولوں کی کیاری سے باہر نکلی۔ نہر عبور کر کے دوبارہ سڑک پر پہنچنے کے لیے سنگ مرمر کی سل پر پاؤں رکھا لیکن نگاہوں کے سامنے حیا کے پردے حائل ہو گئے۔ اس کا ڈگمگاتا ہوا پاؤں اچانک پھسلا اور وہ پانی میں آ رہی۔ طاہر نے جلدی سے آگے بڑھ کر سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ صفیہ نے ہچکچاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی و سپید لہریں رقص کرنے لگیں۔

”شکریہ!“ اس نے باہر نکل کر اپنی بد حواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔" طاہر بولا۔

"نہیں۔"

طاہر نے تذبذب کی حالت میں ایک قدم اٹھایا لیکن صفیہ نے جلدی سے کہا۔ "میں یہ پھول توڑ رہی تھی۔ لیجیے!" اس نے پھول طاہر کی طرف بڑھا دیے اور طاہر نے بدحواسی کی حالت میں پھول پکڑ لیے۔ وہ بولی۔ "بغداد میں آپ کا بہت انتظار تھا۔ آپ نے بہت دیر لگائی؟"

"ہاں کچھ ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے تھے۔"

طاہر کوئی اور بات کے بغیر چل دیا۔ صفیہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ کیاریوں کے پھول مسکرا رہے تھے اور نہر کا شفاف پانی قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے پھر چند پھول توڑے اور سنگ مرمر کی سل پر کھڑی ہو کر انہیں ایک ایک کر کے ندی میں پھینکنے لگی۔

"صفیہ! صفیہ! تم آج گھر نہیں آؤ گی؟" سکینہ ڈیوڑھی کے قریب سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر کھڑی اسے پکار رہی تھی۔

”آئی سکینہ۔“ اس نے جلدی سے قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

محل سے باہر نکلنے کے بعد طاہر دریا کے پُل پر تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اس نے پھولوں کی طرف غور سے دیکھا پھر جھک کر بہتے ہوئے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی گہرے خیال میں پھولوں پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پھول گر کر دریا میں تیرتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”ثریا! ثریا! میں تمہارا ہوں۔ صرف تمہارا۔“ وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ ہر قدم پر اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ اس کے مکان پر عبدالعزیز، عبدالملک، مبارک اور افضل اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کی دی۔ طاہر نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ اب تک یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی کہ اس وقت ہم سازش کے اصلی مجرم کو پکڑنے یا پکڑوانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو اس سے خوارزم کی مصیبت ٹل نہیں جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم مجرم ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کا بھی اس میں ہاتھ

ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں بری الذّمہ ہوں لیکن وقت ایسا نہیں جسے ضائع کیا جائے۔ تاتاریوں کا سیلاب بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ بغداد کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں غفلت کی نیند سے بیدار کیا جائے۔ بغداد میں ہر فرقے دوسرے فرقے اور ہر گروہ نے دوسرے گروہ کے خلاف مورچہ بنا رکھا ہے۔ انہیں اب یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ایک محاذ ایسا بھی ہے جہاں کفر کی تمام طاقتیں جمع ہو کر مسلمانوں کی تمام قوّت کو متحد ہونے کی دعوت دے رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک مشترکہ خطرہ ہمیں انتہائی جدوجہد کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ لوگ جو چھُپ چھُپ کر تاتاریوں کی حمایت کر رہے ہیں، کھلے بندوں ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بغداد کی ہر مسجد سے ایک ہی نعرہ بلند ہو اور وہ یہ کہ تاتاریوں کے مقابلے میں ہم ایک ہیں۔ سب سے پہلے میں بغداد کی جامع مسجد میں نعرہ لگاؤں گا۔“

فضل نے کہا۔ ”خدا کرے آپ کو کامیابی ہو لیکن گزشتہ دو تین صدیوں

میں بغداد کے مسلمان صرف آپس میں ایک دوسرے کا سر پھوڑنا سیکھ چکے ہیں۔ سُنّی شیعہ کا دشمن ہے تو شیعہ سُنّی کے خون کا پیاسا۔ حنفی، مالکی اور شافعی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ آپ کسی مسجد میں جائیں۔ کسی اجتماع کو مخاطب کریں، آپ سے پہلا سوال یہ پوچھا جائے گا کہ حضرت آپ کون سے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "مجھے ان سب مشکلات کا احساس ہے لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اب کی صورت حالات زیادہ دیر قائم رہ سکتی ہے۔ مشترکہ خطرے کا احساس ان اختلافات کو مٹا سکتا ہے۔"

فضل نے کہا۔ "اس کے ذمے دار ہمارے وہ تن آسان علما ہیں جن کے سامنے کوئی نصب العین نہیں لیکن آج انہیں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ تمہارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو ہر کلمہ گو کی دشمن ہے۔ تمہاری آزادی کے چراغ بجھنے والے ہیں۔ ہم ان علما کو کہیں گے کہ تم نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑا کر دکھایا۔ اب کفّار میدان میں تمہیں بلا رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عوام انہیں گھسیٹ کر میدان میں لے آئیں

گے۔‘‘

عبد العزیز اور عبد الملک کے بھی بحث میں حصّہ لیا اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ طاہر جمعہ کے روز جامع مسجد میں اہل بغداد کو خوارزم کے حالات سے آگاہ کرے اور اس سے قبل شہر میں یہ مشہور کر دیا جائے کہ ایک شخص اہلِ بغداد کے نام خوارزم کے مظلوم مسلمانوں کا پیغام لایا ہے۔‘‘

اُٹھنے سے پہلے عبد العزیز نے کہا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ حکومت ہمیں دیر تک ایسی سرگرمیوں کی اجازت نہ دے گی اور آئندہ چند ہفتوں کے بعد ہماری منزل خوارزم کا میدانِ جنگ ہو گا۔ لیکن ہمارے لیے بہتر ہو گا کہ حکومت پر ہماری سرگرمیاں ظاہر نہ ہوں۔ طاہر کی تقریر کے بعد وہ لوگ جو تاتاریوں کے پاس ہمیں فروخت کرنے کا تہیّہ کر چکے ہیں، خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اس کے بعد ہمیں طاہر کو اس وقت تک چھپا کر رکھنا پڑے گا جب تک عوام کا جوش ان کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ نہیں بن جاتا۔ اگر وزیر اعظم یا خلیفہ کی نیّت بُری ہے تو وہ طاہر کو فوری گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے اور ان دنوں بد قسمتی سے غدّاروں کی ہم میں

کمی نہیں۔ اس لیے آپ کے سامنے سب سے پہلے میں طاہر کے ساتھ وفاداری کی قسم کھاتا ہوں اور آپ سے بھی قسم اٹھانے کی درخواست کرتا ہوں۔"

تمام دوستوں نے قسم اُٹھائی تو عبدالعزیز نے کہا۔ "اب اگر ہم میں سے کوئی غدّار ثابت ہوا تو باقی دوستوں کا فرض ہو گا کہ وہ اس کی گردن اُڑا دیں۔"

سب دوستوں نے اس تجویز کی تائید کی اور یہ محفل برخاست ہوئی۔

(۵)

جمعہ سے پہلے شہر کی ہر مسجد اور ہر درس گاہ کے دروازے پر اس مضمون کے اشتہار چسپاں تھے کہ نمازِ جمعہ کے بعد ایک شخص ترکستان کے مسلمانوں پر تاتاریوں کے مظالم کے چشم دید حالات بیان کرے گا۔ قاضی فخر الدّین نے شہر کے چند با عمل علما اور مختلف درس گاہوں کے طلباء نے بغداد کی گلیوں اور کوچوں میں پھر کر یہ منادی کر دی کہ بغداد

کے مسلمانوں کے نام ترکستان کے مسلمانوں نے ایک پیغام بھیجا ہے اور یہ پیغام لانے والا وہ نوجوان ہے جس کے باپ نے ہلال و صلیب کی جنگ میں یروشلم پر مسلمانوں کی فتح کا پرچم لہرایا تھا اور صلاح الدّین ایوبی کی تلوار بطور انعام حاصل کی تھی۔

جمعرات کی شام کو طاہر کو وزیر اعظم نے اپنے محل میں بلایا اور اس سے سوال کیا کہ تم بغداد کے لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہو؟

وزیر اعظم کے متعلق طاہر کے شبہات ایک بار پھر تازہ ہو چکے تھے لیکن اس نے تدبّر سے کام لینا مناسب سمجھا اور جواب دیا۔ ”یہ آپ جانتے ہیں کہ سلطنت خوارزم تاتاریوں کی آخری منزل نہیں۔ انہیں اگر وہاں کامیابی حاصل ہوئی تو ان کی دوسری منزل عراق ہو گی۔ ممکن ہے کہ دولتِ عباسیہ کے ساتھ چنگیز خان کے دوستانہ تعلقات قائم رہیں لیکن کمزور کے لئے طاقتور کی دوستی کا بھروسہ حماقت ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم بُرے سے بُرے حالات کے مقابلے کے لیے تیّار ہو جائیں۔ میں بغداد کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتا ہوں تا کہ اگر

دشمن آجائے تو وہ کم از کم اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے تیّار ہوں۔"

"تم نے مجھے اس دن کیوں نہ بتایا کہ تم جامع مسجد میں تقریر کرنا چاہتے ہو؟"

"اس وقت یہ بات میرے ذہن میں تھی۔ اگر میری جگہ ہوتے تو شاید ایسے معاملات میں کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ تم خلیفہ کے متعلق کوئی گستاخی نہ کر بیٹھو۔"

"لیکن میں اس کے برعکس یہ سمجھتا ہوں کہ اس تقریر سے خلیفہ اور آپ کی بہت بڑی خدمت سرانجام دوں گا۔"

طاہر نے وزیراعظم کے اصرار پر وہیں کھانا کھایا۔ دستر خوان پر قاسم بھی موجود تھا۔ اس نے بے توجہی سے خوارزم کے متعلق چند سوالات پوچھے اور جب طاہر وزیراعظم سے رخصت ہوا تو قاسم برآمدے تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ طاہر کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے طنزاً سوال کیا۔
"کیا آپ نے اس سے قبل کسی بڑے مجمع میں تقریر کی ہے؟"

"میں صرف ایک سپاہی ہوں۔" طاہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

محل سے باہر عبد العزیز اور عبد الملک نہایت بے چینی سے طاہر کا انتظار کر رہے تھے۔ عبد العزیز نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آپ نے سخت غلطی کی۔ ہمیں ڈر تھا کہ وزیر اعظم آپ کو خطرناک سمجھ کر حراست میں نہ لے لے!"

طاہر نے کہا۔ "ڈر تو مجھے بھی تھا لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ میں انہیں کل تک اپنے متعلق غلط فہمی کا شکار نہ ہونے دوں ورنہ وہ مسجد کے دروازوں پر پہرہ لگا دیتے۔

(٦)

جمعہ کی نماز کے بعد ایک نوجوان نے منبر پر کھڑے ہو کر حاضرین سے طاہر بن یوسف کو متعارف کرایا۔ طاہر تقدیر کے لیے اُٹھا۔ اتنے بڑے ہجوم کے سامنے وہ پہلی بار کھڑا تھا۔ قرآن مجید کی چند آیات کی تلاوت کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے تقریر شروع کی۔ بغداد کے لوگ آئے دِن

مناظروں اور جلسوں میں بڑے بڑے جادو بیان مقرّرین کی تقریر سُن چکے تھے۔ تھوڑی دیر وہ بے توجہی سے بیٹھے رہے اور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ اس جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو بغداد کی سب سے بڑی مسجد کے ممبر پر کسی اجنبی کا کھڑا ہوا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ایسے عوام بھی تھے جو محسوس کر رہے تھے کہ کاش آج بھی کوئی مناظرہ ہوتا۔

ایک مشہور عالم نے نہایت بھولے انداز میں اٹھ کر کہا۔ ”آپ براہ کرم بیٹھ جایئے اور اس شخص کو بولنے کا موقع دیجیے جو ترکستان سے آیا ہے۔“

اس پر بعض لوگ ہنس پڑے لیکن طاہر پر اس مذاق کا غیر متوقع اثر ہوا۔ اس نے ایک ثانیہ خاموش رہنے کے بعد پھر تقریر شروع کی:

”میرے دوست یہ جگہ مذاق کے لیے نہیں۔ تاہم میں تمہاری زندہ دلی کی داد دیتا ہوں۔ کاش! تم میدانِ جنگ میں بھی اس قدر زندہ دلی کا ثبوت دے سکو۔ میں یہاں اپنی تقریر کی داد لینے کے لیے نہیں آیا۔ میں مقرر ہوں نہ داستان گو۔ میرے پاس آپ کی تفریح کا کوئی سامان نہیں۔ میں

صرف ایک ایلچی ہوں، ترکستان کے ان فرزندانِ اسلام کا جن کی کھوپڑیوں سے تاتاری اپنی فتح کی یادگاریں تعمیر کر رہے ہیں۔ میں ان دخترانِ اسلام کا ایلچی ہوں جن کی عصمت کے رکھوالے خاک اور خون میں تڑپ رہے ہیں اور اب ان کی آخری اُمّید تُم ہو۔ میرے پاس قہقہے نہیں، آنسو ہیں۔ اپنی جادو بیانی پر ناز کرنے والو! قوم کو لوریاں دے کر سُلانے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ میں تمہیں موت کی نیند سے جگانا چاہتا ہوں۔ میری باتیں کان کھول کر سنو!"

طاہر کی آواز اب بلند ہو رہی تھی۔ رُک رُک کر بولنے والی زبان میں اب پہاڑی ندی کی سی روانی آچکی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگ اس پہاڑی ندی میں ایک دریا کا تموج محسوس کرنے لگے۔ وہ دریا جس میں بند یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہے ہوں، لوگ ایک رو میں بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ ماضی کے نقاب اُٹھا کر اس بھولی ہوئی منزل کی طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں سے صحرا نشینانِ عرب تسخیرِ عالم کا اِرادہ باندھ کر نکلے تھے۔ تاریخ کے ورق الٹ کر ان مجاہدین کی داستان سنا رہا تھا جنہوں نے مشرق و

مغرب میں اسلام کا بول بالا کیا تھا۔ وہ مستقبل کے پردوں میں چھُپے ہوئے طوفان کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور لوگ دم بخود ہو کر سُن رہے تھے۔ بعض کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ ایک نوجوان بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہا تھا۔ طاہر کہہ رہا تھا:

"قوم کے دامن پر بد بختی کی سیاہی آنسوؤں سے نہیں خون سے دھوئی جاتی ہے۔ یاد رکھو! جس قسم کی زندگی تم بسر کر رہے ہو، وہ فطرت کے ساتھ ایک مذاق ہے اور فطرت اپنے ساتھ مذاق کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتی۔ مسلمانوں کی نشانی تھی کہ وہ کفّار کے مقابلے کے لیے ایک سیسہ پلائی دیوار بن جاتے تھے لیکن آج جب کہ کفر تمہارے خلاف اپنی تمام طاقتیں منظّم کر رہا ہے، تمہارے عالم تمہیں بغداد کے چوراہوں پر جمع کر کے ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

اس پر ایک شخص جو بغداد کے ایک گروہ کا نامور مناظر سمجھا جاتا تھا، اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چلایا۔ "میں بصد ادب و احترام یہ پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ آپ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟"

طاہر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک مسلمان ہوں۔“

”کس قسم کا مسلمان؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

طاہر نے جھلا کر جواب دیا۔

”تم تین سو سال سے مسلمانوں کی قسمیں گن رہے ہو لیکن آج تک اصلی اور نقلی، سچ اور جھوٹ کا فیصلہ نہیں ہو سکا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم دوسروں کو اسلام کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے بلکہ تم میں سے ہر ایک نے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ کسوٹیاں بنا رکھی ہیں اور اُن کسوٹیوں پر تمہاری اپنی ذات کے سوا کوئی پورا نہیں اُترتا۔ میرے عزیز! ہو سکتا ہے کہ میں ایک کم علم آدمی ہونے کی صورت میں تمہاری طرح نہ سوچ سکوں۔ خیالات کے پر لگا کر تمہارے ساتھ بلند فضاؤں میں پرواز نہ کر سکوں اور دوسروں کا ایمان پرکھنے کے لیے جو کسوٹی تم نے بنائی ہے، میں شاید اس پر پورا نہ اُتر سکوں اور میری طرح اور بھی لاکھوں مسلمان شاید اس کسوٹی پر پورے نہ اُتر سکیں۔ لیکن اگر تم خوارزم کے کسی میدان میں میرے ہم رکاب

ہوتے اور وہاں یہ سوال کرتے کہ میں کسی قسم کا مسلمان ہوں تو میں تمہیں یہ جواب دیتا کہ سامنے چند قدم پر مومن کے ایمان کی کسوٹی موجود ہے۔ اگر میں کفّار کے تیروں کی بارش میں مسکرا سکوں، ان کی تلواروں کے سائے میں کلمہ پڑھ سکوں، اگر موت کا ہاتھ شہ رگ کے قریب دیکھ کر میرے پاؤں متزلزل نہ ہوں تو سمجھ لینا کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر میرا جسم کفّار کے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا جارہا ہو اور اس وقت موت میں بھی میرے منہ سے یہ دُعا نکل رہی ہو کہ یا اللہ! اپنے محبوب کی اُمّت کا جھنڈا بُلند رکھیو تو سمجھ لینا کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ میرے بھائی! بُرا نہ ماننا، مومن کے ایمان کی کسوٹی وہ نہیں جسے تم ہر روز بغداد کے چوراہوں میں رکھ کر بیٹھ جاتے ہو۔ نہیں۔ مومن کے ایمان کی کسوٹی میدانِ جہاد ہے جہاں ہر مسلمان کے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ خواہ وہ سُنّی ہو، خواہ شیعہ۔ خواہ حنفی۔ خواہ مالکی۔ خواہ آپ جیسا روشن خیال عالم ہو، خواہ میرے جیسا کم علم۔ دارالامن میں اگر تم لوگ ایک ہزار سال اور بھی مناظرے کرتے رہو تو بھی یہ ثابت نہ کر سکو گے کہ کون جھوٹا ہے اور کون سچّا۔ لیکن میں نے توقند میں اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے کہ ایک فرقے کا مسلمان دوسرے فرقے کے مسلمان کے لیے ڈھال تھا۔ حملے کے وقت ان کا نعرہ ایک تھا۔ شہادت کے وقت ان کا کلمہ ایک تھا۔ وہ سب ایک ہی قسم کے مسلمان تھے۔ہاں میدان سے باہر میں نے کئی قسم کے مسلمان دیکھے ہیں۔ ہم میں وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ طاقتور دشمن سے جہاد جائز نہیں۔ ہم میں وہ بھی ہیں جو دُشمن کا نام سُن کر بھاگ جاتے ہیں، وہ بھی ہیں جو اپنی ذات کو چنگیز خان کی نظرِ کرم کا مستحق بنانے کے لیے عالمِ اسلام کو تاتاریوں کے پاس فروخت کر رہے ہیں اور تمہارے اس شہر میں بھی جہاں ہر عالم کو دوسرے کا ایمان ناپنے کی فکر ہے، اُونچے ایوانوں میں رہنے والوں کی ایک ایسی جماعت موجود ہے جو ترکستان پر تاتاریوں کی یلغار کی حمایت کرتی ہے۔"

"میرے عزیز اور بزرگوار! شاید مجھے بغداد میں اتنے بڑے مجمع کے سامنے دوبارہ تقریر کرنے کا موقع نہ ملے، میری باتیں کان کھول کر سنیے اور میرا پیغام ہر اس شخص تک پہنچا دیجیے جسے قوم کے مستقبل کا تھوڑا بہت خیال ہے۔ تاتاریوں کا سیلاب معمولی سیلاب نہیں اور اس وقت

دولت خوارزم اس سیلاب کے سامنے آخری چٹان ہے۔ اگر یہ چٹان نابود ہو گئی تو یہ نہ سمجھو کہ یہ سیلاب وہیں رک جائے گا۔ اس کی سرکش لہریں کسی دن بغداد کے بلند ایوانوں کو بھی متزلزل کر دیں گی۔ اگر ہم نے غفلت کی تو ہم صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں گے۔ میں نہیں کہتا کہ اسلام مٹا دیا جائے گا۔ اسلام مٹنے والی چیز نہیں۔ یہ خدا کا دین ہے۔ اگر تم اس کی حفاظت نہ کر سکے تو خدا کسی اور قوم کو اس کی حفاظت کے لیے منتخب کر لے گا۔ یہ ایک ایسا سفینہ ہے جس پر کوئی طوفان غالب نہیں آ سکتا۔ یہ ہمیشہ تیرتا رہے گا۔ اگر تم خدا کے اس سفینے کو چھوڑ کر دوسری کشتیوں پر سوار ہو گئے تو تم خود ڈوب جاؤ گے اور دوسری قوم اس سفینے پر سوار ہو جائے گی۔"

"تمہاری کامیابی کا راز اجتماعی جدوجہد میں ہے اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت اس وقت سے زیادہ کبھی نہ تھی جب کہ کفر کی تمام طاقتیں تمہیں ہستی سے مٹانے کے لیے تیّار ہو چکی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بغداد کے اونچے ایوانوں میں رہنے والے بعض لوگ خوارزم کے خلاف

تاتاریوں سے ساز باز کر چکے ہیں۔"

ایک شخص نے اُٹھ کر کہا۔ "ہم ان کے نام سُننا چاہتے ہیں!"

طاہر نے جواب دیا۔

"میں صرف سازش کے متعلق جانتا ہوں۔ ابھی تک کسی خاص شخصیت کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا لیکن اب ہم پر ایسا وقت آرہا ہے کہ چھپے ہوئے منافقین کھلے بندوں ہمارے سامنے آجائیں گے۔ سلطنت کے وہ امراء جو یہاں موجود ہیں، میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے سامنے صحیح صورتِ حالات پیش کریں۔ اس وقت تاتاریوں کے مقابلے کے لے خوارزم کا ساتھ نہ دینا خودکُشی کے مترادف ہو گا۔ حالات کا مطالبہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کریں۔ اس کے بعد منافقین کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ خود بخود میدان میں آجائیں گے۔ وہ کوشش کریں گے کہ ہمارا گلا گھونٹ کر ہماری آواز دبادی جائے۔ وہ تاتاریوں کے حق میں اور خوارزم

کے مسلمانوں کے خلاف فتوے شائع کرائیں گے۔"

"میرا کام تمہیں ایک راہ دکھانا تھا۔ اب چلنا یا بیٹھ جانا تمہارا کام ہے۔ اگر تم منظّم ہو جاؤ تو مجھے یقین ہے کہ خلیفۃ المسلمین جو آنے والے خطرات سے بے خبر نہیں فوراً اعلانِ جہاد کریں گے۔ سر دست میں یہ کہنے کے لیے تیّار نہیں کہ بغداد میں سے وہ کون ہیں جو تاتاریوں کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں۔ اس سے قبل میں خلیفہ اور وزیر اعظم کی طرف سے کسی اعلان کا انتظار کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور مجھے یہ امید ہے کہ یہ اعلان جہاد کے متعلق ہو گا ورنہ میں وثوق سے یہ کہہ سکوں گا کہ بغداد میں عالمِ اسلام کے سب سے بڑے دشمن کون ہیں۔"

"سر دست آپ میں سے جو لوگ تاتاریوں کے خلاف خوارزم کے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ مجھے اپنا ایک رفیقِ کار سمجھیں۔ اگر وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی کسوٹی پر ان کا رنگ کیسا اُترتا ہے تو خوارزم کے میدان ہم سے دور نہیں۔"

سازش

چند دن بعد وزیر اعظم کے محل کے ایک کشادہ کمرے میں امرائے سلطنت تازہ صورتِ حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ طاہر کی تقریریں موضوعِ بحث تھیں۔ ایک عہدے دار نے کہا۔ ”وہ ایک دیوانہ ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے گرفتار کر لیا جائے اور جب خلیفہ کا حکم بھی یہی ہے تو ہمیں سہل انگاری سے کام نہیں لینا چاہیے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس نے کسی ایک شخص پر الزامات نہیں لگائے۔ لیکن بغداد کی نظر میں ہم سب مجرم ہیں۔ اس کا تدارک فوراً ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے سب سے زیادہ تعجّب کی بات یہ ہے کہ بغداد کے ہر فرقے کے افراد اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ گزشتہ چالیس برس سے میں نے

شیعہ اور سُنّی کو ایک ساتھ چلتے نہیں دیکھا۔ لیکن اب یہ سُنا ہے کہ ان کے مکان کے ایک دروازے پر شیعہ پہرہ دے رہے ہیں اور دوسرے پر سُنّی ہیں۔ گزشتہ شب چوک مامونیہ میں مناظرہ ہونے والا تھا۔ میں خود وہاں موجود تھا۔ اس نے قبل از وقت وہاں پہنچ کر تقریر شروع کر دی اور شاید گزشتہ دو صدیوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک شخص تمام فرقوں کو کوس رہا تھا اور سامعین خاموش تھے اور جب اس نے یہ سوال کیا کہ تم اب بھی لڑنا چاہتے ہو تو اکثر نے نفی میں جواب دیا اور اس کی تقریر کے بعد سب سے زیادہ عجیب بات یہ بھی کہ شیعہ اور سُنّی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اس لیے ہم اسے دیوانہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکہ دیں گے۔ اگر اسے اس وقت گرفتار کیا گیا تو بغداد کے عوام ہمارے متعلق یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم واقعی کسی سازش کے انکشاف سے ڈرتے ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ پُرامن طریقے سے گرفتار ہونے کے لیے تیّار بھی نہ ہو گا۔ ہمیں جلد بازی کی بجائے تدبّر سے کام لینا چاہیے۔

نیا وزیرِ خارجہ مہلب بن داؤد جو اس سے قبل وحید الدّین کا نائب رہ چکا تھا،

ایک نوجوان تھا۔ لوگ اس کے علم کے معترف تھے اور اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ بہت دُور کی سوچتا ہے۔ وزیر اعظم نے اس کی رائے دریافت کی تو اس نے کہا۔

”میرے خیال میں ہمیں پہلی تقریر کے بعد ہی اسے گرفتار کر لینا چاہیے تھا۔ اب اس نے ہماری کوتاہی سے فائدہ اٹھا کر احمقوں کی ایک بڑی جماعت کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اب اس پر ہاتھ ڈالنا خطرناک ضرور ہے لیکن بغداد کو بغاوت سے بچانے کے لیے ہمیں یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔“

ناظمِ شہر نے اُٹھ کر کہا۔ ”اگر وزیر خارجہ سمجھتے ہیں کہ میری طرف سے کوتاہی ہوئی ہے تو میں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے اسی رات اس کے مکان پر چھاپہ مارا تھا مگر وہاں اس کے نوکروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اگلی رات مجھے جاسوسوں نے پتا دیا کہ وہ شہر کی ایک مسجد میں ہے۔ میں نے دو سپاہی وہاں بھیجے لیکن اس کی حفاظت کے لیے وہاں تین ہزار نوجوان موجود تھے۔“

وزیر خارجہ نے کہا۔ ”لیکن ہمارے پاس سپاہیوں کی کمی نہ تھی۔“

وزیر اعظم نے جواب دیا۔ ”ہمارے سپاہیوں اور افسروں میں سے بہت سے لوگ اس کے طرف دار بن چکے ہیں۔ میرے مکان پر بھی گزشتہ دنوں جتنے فیصلے ہوئے ہیں، اسے کسی طرح ان کی اطلاع ملتی رہی ہے۔ ایک شام ہمیں پتہ چلا کہ وہ عشا کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تقریر کرے گا۔ میں نے پانچ سو سپاہی شہری لباس میں وہاں بجھوا دیے۔ انہیں یہ ہدایت کی تھی کہ تقریر کے بعد اس کے گرد گھیرا ڈال لیں اور جس وقت وہ مسجد سے باہر نکلے، اسے گرفتار کر لیں لیکن اسے بروقت پتہ چل گیا اور مسجد میں نہ آیا۔ اب خلیفہ کا حکم یہ ہے کہ اسے ہر صورت گرفتار کیا جائے اور ہمارے لیے اس حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں۔ پچاس مفتیوں نے آج یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ وہ باغی ہے۔ کل یہ فتویٰ مشتہر کر دیا جائے گا اور اس کے بعد ہم عوام کا ردِّ عمل دیکھ کر مناسب قدم اٹھائیں گے۔“

باقی امراء چلے گئے لیکن مہلب بن داؤ کچھ دیر وزیر اعظم کے ساتھ باتیں

کرتا رہا۔ مہلب نے پوچھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ بغداد میں اس کے پرانے دوست کون کون ہیں؟“

وزیرِاعظم نے جواب دیا۔ ”قاسم کو سب پتہ ہے۔“

مہلب کی درخواست پر وزیرِاعظم نے ایک خادم کو حکم دیا اور قاسم کو بلا لیا۔ قاسم کی آمد پر وزیرِاعظم اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور قاسم اور مہلب دیر تک باتیں کرتے رہے۔

قاسم کہہ رہا تھا۔ ”میرے خیال میں اس کے دوستوں میں سے صرف افضل ایسا ہے جس سے ہم کام لے سکتے ہیں۔ اسے طاہر کے ساتھ دلچسپی ضرور ہے لیکن اس نے عبدالعزیز، مبارک اور عبدالملک کی طرح ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا۔“

مہلب نے پوچھا۔ ”اگر آپ اسے کل شام یہاں کھانے کی دعوت دیں تو وہ آجائے گا؟“

”وہ پچھلے دنوں چند بار مجھ سے مل چکا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ

ہمارے تعلّقات اس قدر بُرے نہیں۔ ایک دن اس نے اپنے گزشتہ گستاخیوں کے لیے معذرت بھی کی تھی اور جب تک وہ حکومت کا ملازم ہے ہم اسے کئی سبز باغ دکھا سکتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے یہاں لانے کا کام نئے سپہ سالار کے سپرد کر دیا جائے۔“

مہلب نے اُٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو بہت اچھا! کل آپ کے ہاں میری، سپہ سالار اور افضل کی دعوت ہے۔“

صفیہ آج بھی حسبِ معمول برآمدے کی چھت پر کھڑی اس کمرے کے روزن سے کان لگا کر بہت کچھ سن چکی تھی۔ جب قاسم اور مہلب باہر نکل گئے تو وہ نیچے اُتر کر اپنے کمرے میں پہنچی۔ اس نے برابر کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سکینہ سو رہی تھی۔ صفیہ سونے سے پہلے روز کے ہر تازہ واقعات کے متعلق ایک مختصر سا مضمون لکھ کر علی الصبح محل کے دروازے کے ایک پہرے دار کو پہنچایا کرتی تھی۔ وہ حسبِ معمول کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئی لیکن چند سطور لکھنے کے بعد اس کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا اور یہ خیال اس کے دل کے خاموش تاروں کے لیے ایک

مضراب بن گیا۔ پھر ہلکے اور میٹھے سُر بُلند ہوتے گئے اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ دلکش نغمہ ایک مہیب تارا بن کر ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے رہا ہے، یہ ایک آندھی جو اُسے اڑانے لے جا رہی تھی۔ ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لے جا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج اور تند ہواؤں کی چیخیں خوف ناک تھیں لیکن اسے اس آندھی کے ساتھ اُڑنے کا خوف نہ تھا۔ سیلاب کی لہریں حوصلہ شکن تھیں لیکن وہ بہنا چاہتی تھی۔ اس کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ قید خانے کے دروازے کھلنے لگے۔ بغداد کے اونچے ایوان اس کی نگاہوں سے روپوش ہو رہے تھے۔ وہ طاہر کے ساتھ صحرائے عرب کے ایک نخلستان میں کھڑی تھی۔ جذبات کے ہیجان میں کانپتے ہوئے قلم اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور اس نے محسوس کیا کہ سازِ ہستی کے تار اچانک ٹوٹ گئے ہیں، کشادہ کمرہ اسے قفس نظر آنے لگا۔ اس نے گِرا ہوا قلم اٹھایا لیکن لکھنے کی بجائے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگی اور پھر کچھ سوچ کر خالی جگہوں پر طاہر بن یوسف کا نام لکھنے لگی۔ پھر اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور اُٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ بار بار یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلّی دے رہی تھی۔

(۲)

اگلی رات قاسم کے دستر خوان پر نیا سپہ سالار، مہلب اور افضل موجود تھے۔ کھانے کے بعد وہ دریا کے کنارے قاسم کے ملاقات کے کمرے میں پہنچے۔

کھانے کے کمرے کے روزن سے کان لگا کر صفیہ طاہر کے متعلق کوئی خاص بات نہ سُن سکی۔ جب وہ دوسرے کمرے میں جانے کے لیے اُٹھے تو وہ ان سے پہلے ہی تنگ سیڑھی کے راستے باہر کی گیلری میں جہاں اس کمرے کے دریچے کھلتے تھے جا پہنچی۔ وہ آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر مہلب نے سپہ سالار سے کہا۔ ”وزیر اعظم کا خیال ہے کہ افضل کو فوج میں کوئی بڑا عہدہ دیا جائے۔ کل قاسم نے میرے سامنے ان کی تعریف کی تھی۔ فوج میں قابل اور وفادار نوجوانوں کی بہت ضرورت ہے۔ وزیر اعظم کو عبد العزیز اور عبد الملک سے بہت امید تھی لیکن میں نے سنا ہے کہ مستعفی ہو کر طاہر بن یوسف کی حمایت کر رہے ہیں۔“

سپہ سالار نے کہا۔ ”وزیر اعظم چاہیں تو ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

مہلب نے کہا۔ ”اس کے علاوہ ہمیں مِصر کے لیے نئے سفیر کی ضرورت ہے۔ اگر عبد المُلک کی وفاداری مشکوک نہ ہوتی تو میرے نزدیک وہ اس عہدے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ طاہر بن یوسف نے اچھے بھلے نوجوانوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ کیوں قاسم تمہارا خیال ہے؟ اگر میں خلیفہ سے سفارش کروں تو افضل اس ذمہ داری کو سنبھال سکے گا؟“

قاسم نے جواب دیا۔ ”مجھے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے لیکن ڈر ہے کہ شاید عبد المُلک اور عبد العزیز کے دوست ہونے کی وجہ سے یہ بغداد چھوڑنا پسند نہ کریں۔“

افضل کی حالت اس بچے کی تھی جس کے سامنے اچانک کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا گیا ہو۔ وہ وزیر اعظم کے محل میں سپہ سالار اور وزیر خارجہ کے ساتھ

کھانا کھا چکا تھا۔ بغداد میں اس کے لیے سپہ سالار کا دستِ راست اور مِصر میں اس کے لیے سفیر بننے کے دروازے کھل چکے تھے۔ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں بغداد کی کوئی خدمت کر سکوں تو کسی کی دوستی میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔“

مہلب نے فوراً جواب دیا۔ ”آپ بغداد کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اپنے دوستوں کے لیے بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ عبد الملک اور عبد العزیز کو افسوسناک تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے“

”وہ کیا؟“

”انہیں سمجھائیں!“

افضل نے جواب دیا۔ ”میری زبان طاہر کا جادُو نہیں توڑ سکتی۔“

”طاہر کے متعلق ہمیں اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ خوارزم کے ایما پر

بغداد میں بغاوت کروانا چاہتا ہے۔ جس دن اس کا مقصد پورا ہو گا۔ وہ خوارزم چلا جائے گا لیکن اس کی کارگزاری کی سزا اس کے دوستوں کو بھگتنا پڑے گی۔" افضل جانتا تھا کہ یہ طاہر کے خلاف ایک بہتان ہے لیکن جب انسان کے دل میں بری خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ ضمیر کو تسلّی دینے کے لیے غلط باتوں پر بھی یقین کر لیتا ہے۔ وہ بولا۔ "اگر یہ بات سچ ہے تو آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

مہلب نے کہا۔ "ہم اسے گرفتار کرنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے کہ فوج کے ساتھ ان لوگوں کا تصادم ہو جنہیں اس نے جھوٹی سچی باتوں سے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ایک مجرم کو گرفتار کرنے کے لیے کئی بے گناہوں کا خون بہایا جائے۔ ہم طاہر کے ساتھ بھی کوئی سختی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے سمجھا بجھا کر یہاں سے نکال دیا جائے۔ اس کے چلے جانے کے بعد یہ فتنہ خود بخود ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

افضل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جھوٹ ہے، یہ لوگ اس کے خون کے

پیاسے ہیں لیکن اس کے ضمیر کے لیے یہ ایک اور تسلّی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ اس پر سختی نہیں کی جائے گی تو میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

مہلب نے کہا۔ ”اس پر سختی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ اس کی نیّت بری نہیں۔ خلیفہ یا حکومت کے کسی عہدے دار کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اگر وہ بغداد کے لوگوں کو بھڑکانے کی بجائے سیدھا ہمارے پاس آتا تو ہم اس کی غلط فہمی دور کر سکتے تھے لیکن اب جب تک وہ گرفتار نہیں ہوتا، ان کے ساتھ ہم بات تک نہیں کر سکتے۔ میرے لیے یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ اتنا بہادر اور بیدار مغز نوجوان قوم کے کام آنے کی بجائے قوم میں انتشار ڈال رہا ہے اور وہ بھی ایک غلط فہمی کی وجہ سے۔ میں نے اس کے ساتھ ملاقات کی کوشش کی لیکن اس کی خفیہ محفلوں تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اگر آپ میری مدد کریں تو یہ ایک بہت بڑا کام ہو گا۔“

سپہ سالار نے کہا۔ ”افضل اگر اس بارے میں کچھ کر سکتا تو یقیناً آپ کا

ساتھ دے گا۔"

قاسم نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیے۔ جو شخص مسلمانوں کی بہتری کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کی ہمّت رکھتا ہے۔ وہ کسی کی دوستی کی پروا نہیں کرے گا!"

افضل کے ضمیر پر اب ملامت کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ "میں چونکہ ابھی تک فوج سے مستعفی نہیں ہوا۔ وہ مجھ پر زیادہ اعتبار نہیں کرتے۔ طاہر کے چند ٹھکانے مجھے معلوم ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ آج وہ کہاں ہو گا؟ اسے صرف رات کو سوتے وقت پکڑا جا سکتا ہے۔ دن کے وقت اس کے گرد بہت آدمی ہوتے ہیں۔ میں ایک دو دن تک آپ کو پتا دے سکوں گا کہ وہ ان دنوں کہاں ہوتا ہے۔"

مہلب نے کہا۔ "اگر آپ اس مہم میں کامیاب ہوئے تو مجھے یقین ہے کہ خلیفہ اور وزیر اعظم ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کریں گے اور ممکن ہے کہ آپ کو نہایت اہم عہدے کا مستحق سمجھا جائے۔"

افضل نے کہا۔ ”لیکن آپ یہ وعدہ یاد رکھیے کہ طاہر کے ساتھ برابر تاؤ نہیں کیا جائے گا۔“

مہلب نے جواب دیا۔ ”میں اس وعدے پر قائم ہوں۔“

مہلب نے اُٹھتے ہوئے قاسم سے کہا۔ ”ابھی وزیر اعظم سے ان باتوں کا ذکر نہ کیجیے۔“

قاسم نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ میں خود چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے، ہماری دوڑ دھوپ کا کسی کو علم نہ ہو۔“

(۳)

قاسم اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے باہر کے دروازے تک ان کے ساتھ آیا۔ دروازے پہنچ کر مہلب نے کہا۔ ”کل وزیر اعظم نے شکایت کی تھی کہ ان کے جاسوسوں سے آپ کا محل محفوظ نہیں کسی نے آج بھی ہماری باتیں سن لی ہوں تو؟“

قاسم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اس کمرے کی چھت میں صرف کبوتروں کا ایک جوڑا رہتا ہے اور ان کے کان ہیں، زبان نہیں۔"

لیکن واپس آتے وقت قاسم کسی قدر پریشان ہو کر اس سوال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر طاہر کو اس سازش کا پتہ چل گیا تو اس کی آئندہ تقریر بہت سخت ہو گی۔ راستے میں پھولوں کی کیاری سے اس نے چند پھول توڑے اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے کھڑا سوچتا رہا اور پھر مُسکراتا ہوا صفیہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ خدا جانے اسے مجھ سے اس قدر نفرت کیوں ہے۔ وہ بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔

اگر وہ سو رہی ہوتی تو قاسم دبے پاؤں اس کے بستر پر پھول رکھ کر چلا آتا۔ لیکن اس کمرے کے نیم وا دروازے میں سے روشنی آ رہی تھی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رُکا اور کچھ سوچ کر واپس چل دیا لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد اسے کمرے کے اندر کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آئی۔ سکینہ اور صفیہ ایک دوسری کو سوتے وقت کہانیاں سنایا کرتی

تھیں لیکن یہ آواز قدرے موٹی تھی۔ پھر اسے صفیہ آہستہ آہستہ بولتی سنائی دی اور وہ جلدی سے مڑ کر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو! یہ باتوں کا وقت نہیں تم جلدی جاؤ۔ میں بار بار تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔ یہ لو میری انگوٹھی۔ میں تمہیں اور بھی بہت کچھ ہوں گی!"

قاسم جلدی سے پیچھے ہٹ کر ایک ستون کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک لونڈی تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی قاسم کے قریب سے گزر گئی۔

قاسم دبے پاؤں وہاں سے نکلا اور ایک اور راستے سے لونڈی سے پہلے محل کی سیڑھیوں پر جا پہنچا۔ لونڈی نے نیچے اترتے ہوئے اسے دیکھا اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟" قاسم نے سوال کیا۔

"جی میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔" لونڈی خوف زدہ ہو کر کانپنے لگی۔

قاسم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں بھوت نہیں ہوں۔ تم ڈرتی کیوں

ہو؟"

"اِدھر آؤ!"

قاسم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔

"بتا کہاں جا رہی تھی تو؟"

لونڈی نے چند الٹے سیدھے بہانے کیے لیکن قاسم نے ایک چمکتا ہو خنجر نکال کر دکھایا تو وہ چلاّئی۔ "میں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ مجھے صفیہ نے یہ خط دے کر بھیجا ہے۔"

"کہاں؟"

"دروازے کے ایک پہرے دار کے پاس؟"

"بکتی ہو تم۔" قاسم نے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"نہیں نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ پہرے دار یہ خط کہاں لے جائے گا۔"

”وہ خط کہاں ہے؟“

لونڈی نے اپنے آستین سے ایک ریشمی رومال نکالا اور اس کے اندر لپٹا ہوا کاغذ نکال کر قاسم کے ہاتھ میں دے دیا۔ قاسم نے یہ رقعہ پڑھا۔ مختصر تحریر تھی۔

”آپ کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ ہو چکا ہے۔ افضل آپ کو پکڑوانے کا عہد کر چکا ہے۔ بہت سے باتیں ایسی ہیں جو میں زبانی کہنا ضروری سمجھتی ہوں۔ قاصد آپ کو وہ جگہ بتا دے گا جہاں آپ مجھے کسی خطرے کا سامنا کے بغیر مل سکتے۔ خدا کے لیے ضرور آئیں!“

غصّے سے قاسم کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ لونڈی اس کی سفاک آنکھوں کی تاب نہ لا کر رونے لگی۔

”خاموش!“ قاسم نے گرج کر کہا۔

”میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر رحم کیجیے۔ میں ایک لونڈی ہوں۔ میں صفیہ کے حکم کی تعمیل سے انکار کیسے کر سکتی تھی۔ مجھے معاف کیجیے۔“

”تمہارے بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔“

”میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔“

”صفیہ نے ملاقات کے لیے کون سی جگہ بتائی ہے اور وہ پہرے دار کون ہے جس کے پاس تم یہ خط لے جا رہی ہو۔“

”وہ سعید ہے اور صفیہ نے مجھے کہا ہے سعید اسے جنوبی دروازے پر لے آئے۔“

”اس سے پہلے بھی کبھی ان کی ملاقات ہوئی ہے؟“”نہیں۔“

”پیام رسانی؟“

”ہاں!“

”تمہیں معلوم نہیں کہ جس کے پاس یہ پیغام جانے ہیں، کون ہے؟“

”جی نہیں۔ اس کا صرف سعید اور جنوبی دروازہ کے پہرے دار کو علم ہے۔ صفیہ نے مجھے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ ایک بے گناہ کی جان بچانا

چاہتی ہے۔"

"بہت اچھا۔ تم ابھی یہ رقعہ سعید کو جا کر دے دو لیکن اگر تم نے اسے بتا دیا کہ میں نے یہ رقعہ دیکھ لیا ہے تو تمہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر دجلہ میں پھینک دیا جائے گا اور واپس آ کر صفیہ سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرنا لیکن اگر اس نے یہ پوچھا کہ تم نے دیر کیوں لگائی تو تم کیا جواب دو گی؟"

لونڈی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میں نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی۔ میں کہوں گی کہ میں نماز کے لیے رک گئی تھی۔"

"تم بہت ہوشیار ہو۔ یہ لو۔ تمہیں اور بھی بہت کچھ ملے گا۔" اس نے چند سُنہری سکے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

(۴)

سعید نے بغداد کی گنجان آبادی کی ایک تنگ گلی میں سے گزرنے کے بعد ایک پرانے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ ایک شخص باہر نکلا اور سعید کو پہچان کر ایک اور تنگ گلی میں لے گیا۔

"کوئی ضروری پیغام ہے؟" اس نے راستے میں سوال کیا۔

"نہایت ضروری۔" تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک سہ منزلہ مکان کے دروازے پر رُکے اور سعید کے ساتھی نے پانچ دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے اندر سے دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور سعید کے ساتھی کو پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

سعید کے ساتھی نے کہا۔ "انہیں اندر لے جاؤ!"

سعید اندر داخل ہوا تو پہرے دار نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد طاہر، عبد العزیز اور عبد الملک صفیہ کا رقعہ پڑھ کر سعید سے طرح طرح سے سوالات پوچھ رہے تھے۔ سعید نے اس بات کی تصدیق کی کہ افضل محل میں گیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے مہلب اور سپہ سالار کو بھی وہاں آتے جاتے دیکھا ہے لیکن وہ یہ نہ بتا سکا کہ صفیہ نے طاہر کو اس وقت کیوں بلایا ہے۔ تینوں دوست کچھ دیر اس موضوع پر

بحث کرتے رہے۔ عبد العزیز کی رائے تھی کہ ”سپہ سالار وزیر خارجہ اور وزیر اعظم نے افضل سے ہمارے ٹھکانے معلوم کر کے یقیناً کوئی خطرناک فیصلہ کیا ہو گا اور صفیہ ایک عورت کی طرح آپ کے مقصد سے آپ کی جان کو زیادہ قیمتی خیال کرتی ہے۔ وہ غالباً آپ سے یہی کہے گی کہ آپ چاروں طرف سے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں، اس لیے اپنی جان کی فکر کیجیے۔“

عبد الملک نے کہا۔ ”اپنی معلومات کی روشنی میں صفیہ کو عام لڑکیوں میں شمار کرنے پر احتجاج کرتا ہوں، اگر اسے نسوانی جذبات کا اظہار مقصود ہوتا تو وہ اس خط میں چند سطور کا اضافہ کر سکتی تھی۔“

عبد العزیز نے کہا۔ ”لیکن اس خط کا اختصار تو صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔“ عبد الملک نے کہا۔ ”لیکن اسے کوئی مجبوری در پیش ہو گی۔ اس مجبوری کی وجہ سے اس نے طاہر کو بلایا ہے۔ اب اگر طاہر نہ گیا تو وہ کیا خیال کرے گی؟“

طاہر نے اُٹھ کر تلوار سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے خدا کے نام کا واسطہ دیا ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔ اس نے ایک دفعہ میری جان بچائی ہے۔ اگر میرے سر پر اس کا یہ احسان نہ بھی ہوتا تو بھی میں اپنی قوم کی بیٹی کی آواز پر لبیک ضرور کہتا۔“

عبدالعزیز نے کہا۔ ”تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“

”نہیں۔“ طاہر نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ ”ہمیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اگر کوئی خطرہ ہوتا تو وہ مجھے وہاں تنہا پہنچنے کی دعوت نہ دیتی۔“

(۵)

وزیر اعظم کے محل کے جنوبی پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے بعد طاہر کو چاند کی روشنی میں صفیہ دکھائی دی۔ وہ کھلی فضا سے نکل کر ایک گھنے درخت کے سائے میں کھڑی ہوگئی۔ طاہر نے اس کے قریب آکر کہا:

”کہیے!“

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کا ایک دوست غدّار ہو گیا ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”یہ اب تک آپ اپنے مکتوب میں ظاہر کر چکی ہیں۔ وہ ضروری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جن کا آپ نے خط میں ذکر کیا ہے۔“

خشک پتوں کے اس انبار کی طرح جنہیں تیز بگولا اڑا کر لے جاتا ہے، صفیہ نے الفاظ کے جو ذخیرے جمع کیے تھے، وہ منتشر ہو گئے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ رہی تھی کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے؟

”اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میری ایک درخواست ہے۔“

”میرے لیے آپ کی ہر درخواست حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“

”حکومت آپ کو گرفتار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر چند دن وہ آپ کو پر امن طریقے سے گرفتار نہ کر سکے تو مجھے یقین ہے کہ وہ قوّت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“

”طاہر نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

”تو خدا کے لیے یہاں سے چلے جایئے۔ آپ کو ہر وقت خطرہ ہے۔“

”میں خطرات سے نہیں ڈرتا لیکن آپ کو مشورے سے پہلے ہی میں یہاں سے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔“

”کب جائیں گے؟“

”بہت جلد۔“

”تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔“

طاہر چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن صفیہ نے آگے بڑھ کر اس کا دامن پکڑ لیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ محل میرے لیے ایک قید خانہ ہے۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ میں مدینے جا کر کسی جھونپڑی میں رہنا پسند کروں گی۔ مجھے بغداد سے نفرت ہے۔ مجھے ان ایوانوں سے نفرت ہے جہاں انسان کے بھیس میں سانپ رہتے

ہیں۔“

”آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری منزل مدینہ نہیں، خوارزم ہے۔“

”میں وہاں جانے کے لیے بھی تیار ہوں۔“ ”لیکن وہاں کے حالات آپ کو معلوم نہیں۔ وہاں پہلے ہی قوم کی ہزاروں ایسی بیٹیاں موجود ہیں جن کا نگہبان کوئی نہیں۔ میں ان میں ایک اور اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”تو میں آپ کے واپس آنے تک انتظار کروں گی۔ آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے بھول نہیں جائیں گے۔“

طاہر کو ثریا کا خیال آیا اور اس نے مغموم آواز میں کہا۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو میرے مقاصد سے ہمدردی ہے۔“

صفیہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”آپ جائیے۔ میں سمجھتی تھی کہ آپ اپنے دل میں انسانیت کا درد رکھتے ہیں لیکن آپ خود پسند ہیں۔ آپ کو صرف اپنی ذات سے محبت ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”کاش! آپ کو معلوم ہو کہ میں کانٹوں پر چلنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں گھسیٹ سکتا۔ آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے شاید میں اس کا بدلہ نہ دے سکوں۔ میری گردن ہمیشہ جھُکی رہے گی۔ میں خود پسند نہیں ہوں لیکن ایک سپاہی کی زندگی میں ایسے مرحلے آتے ہیں جب اسے اپنی زندگی کی عزیز ترین خواہشات قربان کرنا پڑتی ہیں۔ وہ کسی کے پسینے کے بدلے خون تک گرانے کے لیے تیار ہوتا ہے لیکن اسے فرض مجبور کرتا ہے تو وہ اس کے آنسوؤں کی بھی پروا نہیں کرتا اور میدانِ جنگ میں چلا جاتا ہے۔ آپ ایک عالیشان محل میں رہ کر بھی اپنا دم گھٹتا محسوس کرتی ہیں، لیکن ترکستان میں آپ کی ہزاروں بہنیں ایسی ہیں جنہیں اس کھلے آسمان کے نیچے سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ اس وقت میری توجہ کی زیادہ حق دار وہ ہیں۔ اسلام کی بدنصیب بیٹیاں، اپنی عراقی عرب اور مصر کے پر امن شہروں میں رہنے والی بہنوں کو پکار پکار کر یہ کہہ رہیں کہ اگر تمہارے بھائی، شوہر اور عزیز ہماری مدد کو پہنچ سکتے ہیں تو خدا کے لیے ان کا راستہ نہ روکو۔“

صفیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معاف کیجیے۔ جائیے خدا آپ کی مدد کرے۔ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ میں ایک عورت ہوں۔ جائیے ـــــ!“

وہ دروازے تک اس کے ساتھ آئی۔ سعید کے اشارے سے پہرے دار نے دروازہ کھول دیا۔ طاہر نے ایک بار مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنسوؤں میں ڈُھلی ہوئی حسین اور مقدس مسکراہٹ جو بیک وقت روح پرور بھی تھی او حوصلہ شکن بھی!“

”آپ مجھ سے خفا تو نہیں؟“ طاہر نے جاتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔“ اس نے میٹھی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے؟“

”کبھی نہیں۔“ طاہر نے جواب دیا۔

طاہر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا اور صفیہ دروازے میں کھڑی ہو کر

اسے دیکھنے لگی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا کہ اچانک دائیں اور بائیں ہاتھ سے سپاہیوں کی دو ٹولیاں نمودار ہوئیں۔ طاہر تلوار نکالنے سے پیشتر پندرہ بیس آدمیوں کی گرفت میں آچکا تھا۔

صفیہ نے جلدی سے کہا۔ ”سعید تم بھاگ جاؤ!“

سعید اور دو پہرے دار پوری رفتار سے محل کے ایک کونے کی طرف بھاگے۔ صفیہ نے دروازے سے نکلی لیکن قاسم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔

”صفیہ! تم نے آج بہت بڑا کام کیا۔ چلو اب آرام کرو۔“

اور وہ اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر ساتھ چل دی۔ چند قدم چلنے کے بعد قاسم نے رُک کر سپاہیوں کو آواز دی۔ ”سعید شاید بھاگ گیا ہے۔ اسی بھی گرفتار کر لو۔“

محل کے اندر پہنچ کر قاسم نے صفیہ کو اس کے کمرے کے اندر دھکیل دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔

واپس آکر مہلب کے اصرار پر قاسم نے طاہر کو اس کے سپرد کر دیا۔ سعید اور دوسرا پہرے دار محل کا کونا کونا چھان مارنے کے باوجود بھی نہ ملے۔ بالآخر ایک سپاہی نے خبر دی کہ محل کی ایک کشتی غائب ہے۔ اس وقت تک وہ دوسرے کنارے جا چکے ہوں گے۔

آدھی رات کے بعد جب مہلب، طاہر کو قید خانے کے داروغہ کے سپُرد کر کے ہدایات دے رہا تھا۔ سعید اور اس کا ساتھی عبد الملک اور عبد العزیز کو اپنی سرگزشت سُنا رہے تھے۔

(٦)

طاہر بن یوسف دریائے دجلہ کے کنارے بڑے قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں بند تھا۔ صُبح ہو چکی تھی لیکن قید خانے میں ابھی تک تاریکی تھی۔ دو پہرے دار آئے اور اسے سوتا دیکھ کر کھانا رکھ کر چلے گئے۔ ایک دو مرتبہ طاہر کی آنکھ کھُلی لیکن کمرے میں تاریکی پا کر وہ پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ بالآخر اس نے محسوس کیا کہ اسے کوئی جھنجوڑ

جھنجھوڑ کر جگا رہا ہے۔

”کون ؟“ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”آہستہ بولو!“

طاہر نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور تاریکی میں غور سے دیکھنے کے بعد اپنے قریب ایک اور آدمی کو پا کر اُٹھ بیٹھا۔ اجنبی نے کہا۔ ”جب سے یہ قید خانہ بنا ہے، شاید اتنی دیر سونے والا یہاں کوئی نہیں آیا۔ اب تو دوپہر ہونے والی ہے۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں کئی راتوں سے اطمینان کی نیند نہیں سویا۔“

”تو اطمینان رکھو، یہاں تم باقی عمر مزے کی نیند سو سکو گے۔“

”تم کون ہو؟“

”میں بھی کوئی تھا لیکن اب تو میں ایک قیدی ہوں۔“

”رات جب مجھے یہاں لایا گیا تھا تو میرے خیال میں یہاں اور کوئی نہیں

تھا۔ شاید تمہیں ابھی ابھی یہاں پہنچایا گیا ہے۔"

"نہیں۔ میں کئی مہینے سے شاہی مہمان ہوں۔ میری اور آپ کی کوٹھڑی کے درمیان ایک دیوار کا پردہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ زمین دوز کمرے بہت کشادہ تھے لیکن بعد میں قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ان کے درمیان دیواریں کھڑی کر کے انہیں دو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔"

"تو آپ کس راستے سے یہاں پہنچے؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ شروع شروع میں یہاں دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا بازو پکڑ لو گھبراؤ نہیں۔ چند دن کے بعد تمہیں بھی میری طرح تاریکی میں دیکھنے کی عادت ہو جائے گی۔"

طاہر نے اجنبی کے ساتھ ایک تنگ محراب سے گزرتے ہوئے کہا۔ "یہ راستہ تو بہت کشادہ ہے۔"

اجنبی نے جواب دیا۔ "نہیں ابھی تک آپ نے اپنی کوٹھڑی کا جائزہ نہیں

لیا۔ یہ دروازہ اسے دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ میری کوٹھڑی بھی اس طرح کی ہے!" چند قدم اور چلنے کے بعد اجنبی نے جھک کر زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو، یہ سوراخ میرے کمرے میں جاتا ہے۔ یہاں سے گزرنے کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔ تم شاید نہ گزر سکو۔ تم ذرا موٹے ہو لیکن تم بھی بہت جلد میرے جیسے ہو جاؤ گے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو میں بھی کافی موٹا تھا۔ قریب ایک ماہ کے بعد یہاں کی نمی کی وجہ سے ہلکا ہلکا بخار شروع ہو جاتا ہے اور بھوک مر جاتی ہے۔"

"یہ راستہ تم نے کیسے دریافت کیا؟"

"جب میں یہاں لایا گیا تھا تو اس کمرے میں ایک شخص کبھی کبھی دیوار سے ٹکریں مارا کرتا تھا۔ دو تین دن میں نے کوئی توجّہ نہ دی لیکن ایک دن میں نے اس کے جواب میں دیوار کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا تو تھوڑی دیر کے بعد کسی نے میرے کمرے میں دیوار کے قریب سل اُوپر اٹھائی اور سر باہر نکال کر کہا۔ "السّلام علیکم! میں اس قدر ڈرا کہ اگر باہر نکلنے کا راستہ ہوتا تو میں شاید دریا میں بھی چھلانگ لگانے سے دریغ نہ کرتا۔ وہ بولا۔ ڈرو

نہیں۔ میں تمہارا پڑوسی ہوں۔ تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ قاضی ابوداؤد تھا جس نے ایک مقدمے میں سابق وزیر اعظم کی مرضی کے مطابق فیصلہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ راستہ انہوں نے میرے یہاں آنے سے بہت مدّت پہلے کھودا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بے کاری سے اُکتا کر میں نے اس دیوار کے قریب فرش کی دو سلیں اکھاڑ ڈالیں اور فرش کی نم دار مٹی کو ایک ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹھیکرے کے ساتھ کھودنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ چند دنوں میں انہوں نے یہ سوراخ نکال لیا تھا لیکن اس کمرے میں کسی کو نہ پا کر انہیں بہت افسوس ہوا۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی مجھے انہوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا لیکن وہ ڈیڑھ ماہ کے بعد چل بسے۔ پہریدار یہاں صبح و شام صرف دو بار آتے ہیں۔ اس کے بعد سارا دن اور ساری رات ہم ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ صرف جمعہ کے دن وہ صفائی کے لیے آتے ہیں اس دن آپ سوراخ پر سِلیں رکھ دیا کریں اور بہتر ہو گا کہ اپنا بچھونا بھی یہیں ڈال دیا کریں۔ قید تو یقیناً میری طرح آپ کو بھی اتنا ہی ہو گی۔ مجھے معلوم ہے کہ قید خانے کے اس حصّے میں صرف وہی لوگ بھیجے جاتے ہیں جن کا کوئی جرم نہیں

ہوتا لیکن تم تو نوجوان ہو۔ میں حیران ہوں کہ حکومت نے تمہیں اتنی اہمیت کیوں دی ہے؟ میں نے شاید تمہیں کہیں دیکھا ہے؟ چلو دوسری طرف چلیں۔ اُدھر تاریکی ذرا کم ہے۔"

طاہر اجنبی کے ساتھ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اجنبی نے کہا۔ "تم کھانا کھالو۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "مجھے بھوک نہیں۔"

اجنبی نے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ یہاں آ کر پہلے دن کوئی قیدی کھانا نہیں کھاتا۔ میں نے بھی دو دن نہیں کھایا تھا لیکن آہستہ آہستہ عادی ہو جاتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تم یہاں کیونکر پہنچے، میں تمہارے اور کسی کام نہیں آ سکتا لیکن اپنی اپنی سرگزشت سُنا کر ہم ایک دوسرے کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ یہاں آ کر حافظے پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔"

"میرا نام طاہر بن یوسف ہے۔"

”طاہر بن یوسف؟ میں نے یہ نام بھی سنا ہے۔ تم فوج میں تھے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر کس محکمے میں تھے؟“

”کسی میں نہیں۔ میں بغداد میں ایک بہت بلند مقصد لے کر آیا تھا۔“”تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ کوٹھڑیاں صرف بغداد میں بُلند مقاصد لے کر آنے والوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ خلیفہ اور سلطنت کے عہدے داروں کا عتاب صرف ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جن سے خدا خوش ہو۔ اچھا، اب مجھے شروع سے اپنی سرگزشت سناؤ!“

طاہر نے بغداد میں اپنی آمد اور قاسم کے ساتھ تیغ آزمائی کے واقعات سے اپنی سرگزشت شروع کی۔

اجنبی نے اُسے ٹوکتے ہوئے سوال کیا۔ ”مجھے یاد آیا۔ تم وہی نوجوان ہو۔ ارے میں نے اس دن دُعا مانگی تھی کہ خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ اچھا آگے سناؤ!“

طاہر نے خوارزم کے سفیر کے ساتھ ملاقات کا ذکر کیا تو وہ چونک اٹھا۔ ”میری طرف دیکھو میں ہوں وحید الدّین!“

”آپ؟“ طاہر نے اچانک سوال کیا۔

”ہاں! میں وہی بد نصیب ہوں۔ مجھے یہاں سے رہائی کی امّید نہیں اور آپ کو اپنی معصومیت کا یقین دلا کر میں آپ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن چونکہ ہم ساتھی ہیں، اس لیے آپ کی تسکین کے لیے خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ میں نے چنگیز خان کے پاس کوئی ایلچی نہیں بھیجا تھا!“

طاہر نے کہا۔ ”مجھے آپ پر یقین ہے۔ اگر آپ پر وہ کوئی جرم ثابت کر سکتے تو کھلی عدالت میں مقدمہ چلاتے، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو کب اور کیسے اس قید خانے میں بھیجا گیا؟“

”آپ پہلے اپنی سر گزشت ختم کریں۔ پھر میں آپ کو آپ کے تمام سوالات کا جواب دوں گا۔“ طاہر نے آخر تک اپنی سر گزشت سنائی۔ وحید

الدّین کچھ دیر گہری سوچ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ بولا۔ ”اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ آپ کی سر گزشت سننے کے بعد میرا شک یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ میں مہلب بن داؤد کی سازش کا شکار ہوا ہوں۔ یہ شخص بغداد میں چنگیز خان کے سفیر کا ملازم تھا۔ شہزادہ مستنصر کی سفارش پر میں نے اسے اپنے دفتر میں رکھ لیا۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے، میں اب بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ بہت ہوشیار ہے۔ شہزاد مستنصر کی بدولت اس نے خلیفہ تک رسائی حاصل کر لی اور میں محسوس کرنے لگا کہ میں برائے نام وزیر خارجہ ہوں، ورنہ وہ سیاہ و سپید کا مالک ہے۔ اگر میرے دن اچھے ہوتے تو میں پہلے ہی مستعفی ہو جاتا لیکن میرے مقدر میں یہ ذلّت تھی۔ میں نے ایک دفعہ اسے مستعفی ہونے کے لیے کہا لیکن اس نے خلیفہ کے پاس شکایت کی۔ خلیفہ نے مجھے ڈانٹا۔ اس کے بعد میں نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ چنگیز خان کے عروج کی داستانیں مشہور ہوئیں تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر کے خوارزم کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے۔ میں نے اس کی تجویز کی مخالفت کی اور وہ چپ رہا۔ میں

نے وزیر اعظم سے کئی بار شکایت کی کہ یہ شخص خطرناک ہے لیکن اس نے اس بات کی پروانہ کی۔ ایک دن مجھے خلیفہ نے بُلا کر حکم دیا کہ میں چنگیز خان کے نام دوستی کا پیغام بھیجوں لیکن میں نے یہ عذر پیش کیا کہ موجودہ صورت میں ہمارے کسی ایلچی کو خوارزم کی سرحد عبور کر کے قراقرم پہنچنا ممکن نہیں۔ اگر وہ راستے میں پکڑا گیا تو دربارِ خلافت کی بدنامی ہو گی۔ خلیفہ نے میرا اعتراض سُن کر کوئی زور نہ دیا لیکن چند دن بعد مہلب نے بتایا کہ آج وزیر اعظم نے خلیفہ کو ایک خط پیش کیا ہے جو حکومتِ خوارزم نے حکومتِ بغداد کے ایک ایلچی کی تلاشی لینے کے بعد بر آمد کر کے بغداد میں اپنے سفیر کو بھیج دیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بتایا کہ اس خط پر میرے دستخط ہیں۔ اس لیے مجھ سے باز پرس ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ میں روپوش ہو جاؤں لیکن میں نے اس کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ چونکہ میں نے ایسا خط نہیں لکھا، اس لیے مجھے باز پرس کا ڈر نہیں۔ میں ابھی خوارزم کے سفیر، وزیر اعظم اور خلیفہ کے سامنے یہ معاملہ صاف کرتا ہوں لیکن جب میں مکان سے باہر نکلا تو آٹھ دس سپاہی اور کوتوال دروازے پر کھڑے تھے۔ مہلب کے اشارے پر مجھے گرفتار

کر لیا گیا۔ اب مجھے یقین ہے کہ مہلب نے میری جعلی دستخطوں سے یہ خط بھجوایا تھا اور خلیفہ کا میرے بعد اسے وزیر خارجہ کا عہدہ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ خلیفہ کے حکم سے ہوا۔ وہ بدنامی کے خوف سے مجھ پر مقدمہ چلانے سے ڈرتے تھے اور خوارزم کے سفیر کو تسلّی دینے کے لیے انہوں نے مجھے یہاں بھیج کر مشہور کر دیا ہو گا کہ مجرم کہیں روپوش ہو گیا ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں وزیر اعظم اس سازش میں شریک نہ تھا؟"

"نہیں۔ اگر وہ اس سازش میں شریک ہوتا تو میرے ساتھ مہلب کو بھی یہاں ہونا چاہیے تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میری گرفتاری کا ابھی اس کو علم نہیں۔ ورنہ وہ میرے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلاتا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ وہ پہلے درجے کا جی حضوری ہے لیکن اسے تاتاریوں سے نفرت ہے اور وہ خوارزم کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کا حامی تھا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری صرف اپنے نالائق بیٹے سے محبت ہے۔"

طاہر نے کہا۔ ”لیکن خلیفہ نے چنگیز خان کو پیغام بھیجنے کے لیے آپ کا نام استعمال کیوں کیا؟ وہ آسانی سے آپ کو نکال کر مہلب یا کسی اور آدمی کو آلہ کار بنا سکتا تھا۔“ ”اس لیے کہ ایلچی کے پکڑے جانے کی صورت میں کسی ایسے شخص پر حرف آئے جس کی خدمات کے خلیفہ آئندہ کے لیے ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرے متعلق خلیفہ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ میں ایسے معاملے میں راز داری سے کام نہ لوں گا۔“

آگ اور خون

علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ نے پہلی شکست کے بعد شمال مغرب کا رُخ کیا اور دریائے سیحوں کے کنارے پر پڑاؤ ڈال کر جنوب کے شہروں سے افواج کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ قوقند کی فتح کے بعد چنگیز خان نے دریائے سیحوں کے ساتھ ساتھ شمال مغرب کا رخ کرنے کی بجائے اپنی افواج کا بڑا حصّہ جنوب کی طرف منتقل کر دیا اور اس محاذ سے خوارزم شاہ کی توجہ ہٹانے کے لیے اپنے دو بیٹوں کو شمال میں اُترار کی طرف روانہ کر دیا۔ خوارزم شاہ اپنے خیال کے مطابق چنگیز خان کے بیٹوں کو دریائے سیحوں کے کنارے ایک فیصلہ کن شکست دینے کے لیے زبردست تیاریاں کر رہا تھا لیکن اچانک اسے خبر ملی کہ چنگیز خان کی فوج جنوب

مشرق سے دریائے جیحوں کے ساتھ ساتھ سمرقند اور بخارا کا رخ کر رہی ہے۔ محمد شاہ کو ایک طرف اپنی سلطنت کے مضبوط ترین قلعوں کے چھن جانے کا خدشہ پیدا ہوا اور دوسری فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر تاتاری ان دو شہروں پر قابض ہو گئے تو وہ دریائے جیحوں کے کنارے جھیل ارال تک اس کے باقی تمام مورچوں پر آسانی سے قابض ہو جائیں گے اور جنوب میں اس کی رسد و کُمک کے تمام راستے کٹ جائیں گے۔

محمد شاہ نے اس موقع پر بھی اپنے کہنہ مشق فوجی سرداروں کا مشورہ قبول نہ کیا اور کسی ایک میدان میں اپنی قوت کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی فوج کا بیشتر حصّہ مختلف شہروں کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ چالیس ہزار سپاہیوں کو دریا سیحوں کے کنارے کے شہریوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر اس نے بخارا کا رخ کیا اور تیس ہزار سپاہیوں کو وہاں متعین کر کے باقی فوج کے ساتھ سمرقند جا پہنچا۔

اس دوران میں شمال میں چنگیز خان کا ایک بیٹا دریائے سیحوں عبور کر کے اترار پر حملہ کر چکا تھا۔ شہر کا گورنر آخری دم تک لڑتا رہا اور جب تاتاری

قلعے کے دروازے توڑ کر اس کی بچی کھچی فوج تہ تیغ کر چکے تھے تو بھی وہ تنہا ایک برج پر چڑھ کر تیر برسا رہا تھا۔ تیر ختم ہو گئے تو وہ اینٹیں برساتا رہا۔

اسے زندہ گرفتار کر کے چنگیز خان کے پاس بھیجا گیا۔ چنگیز خان نے اس کے کانوں اور آنکھوں میں پگھلی ہوئی چاندی ڈلوا کر ہلاک کر ڈالا۔

چنگیز خان کے دوسرے بیٹے نے تاشقند پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد تاتاری افواج نے مختلف حصّوں میں تقسیم ہو کر دریائے سیحوں کے کنارے اور کئی چھوٹے چھوٹے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

چنگیز خان اپنے بیٹے تولائی کے ہمراہ راستے کی بستیوں اور شہروں کو خون اور آگ کا پیغام دیتا ہوا بخارا کی طرف بڑھا۔ خوارزم شاہ کو سمرقند میں اس کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ فوج کے سرداروں کی اس مرتبہ بھی یہی رائے تھی کہ چنگیز خان کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جائے لیکن خوارزم شاہ نے بخارا کی فصیل کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر اس مرتبہ بھی ان کی رائے ٹھکرا دی اور شہر کی حفاظت کے لیے مزید سپاہی بھیج دیے اور

جنوب کے شہروں کی افواج کو سمرقند بھیجنے کا حکم دیا۔ خوارزم شاہ کو یہ توقع تھی کہ بخارا کی تسخیر میں تاتاریوں کو کئی مہینے لگ جائیں گے اور اس دوران میں وہ سلطنت میں اپنی افواج کا بکھرا ہوا شیرازہ منظّم کر سکے گا۔

چنگیز خان نے چند دن کے محاصرے کے بعد محسوس کیا کہ شہر کو فتح کرنا آسان نہیں۔ گزشتہ فتوحات میں وہ اسلحہ سازی کے بہت سے ماہرین کو گرفتار کر چکا تھا اور ان میں سے بعض اس کی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔ ایک شخص کے مشورے پر چنگیز خان نے فوج کو شہر پر آگ لگانے والے تیر پھینکنے کا حکم دیا۔ آتشیں تیروں سے شہر کے ایک محلے میں آگ لگ گئی اور اس سے تمام آبادی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ترک افواج نے مجبوراً شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن انہیں شکست ہوئی اور تاتاریوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر کر تہ تیغ کر ڈالا۔

فوج کی مدد سے محروم ہو جانے کے بعد اکابرینِ شہر نے چنگیز خان کے پاس صلح کے لیے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ شہر کی ایک ہر دل عزیز شخصیت امام زادہ رُکن الدّین اس فیصلے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے

معززینِ شہر کے سامنے پُرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم کم از کم چھ ماہ تک شہر کی حفاظت کر سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ موجودہ حالات میں سمرقند کی افواج یہاں پہنچ جائیں گی۔ اس وقت چنگیز خان شہر کے دروازے کھلوانے کے لیے ہماری یہ شرط منظور کرلے گا لیکن تاتاریوں کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی معاہدے کے پابند رہ سکتے ہیں، خود فریبی ہے۔ جب تاتاریوں کی افواج شہر میں داخل ہوں گی تو وہ تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گی جو انہوں نے اُترار اور تاشقند والوں کے ساتھ کیا ہے۔“

لیکن امام زادہ رکن الدّین کی آواز صدا بصرا ثابت ہوئی۔ اکابرینِ شہر کے وفد نے چنگیز خان سے ملاقات کے بعد اہلِ شہر کو یہ خوش خبری سنائی کہ تمہاری جانیں تمہاری جائدادیں اور تمہاری عزّت محفوظ ہے۔ شہر کا نیا حاکم بھی مسلمان ہو گا۔ شہر کے دروازے کھل گئے۔

(۲)

رکن الدّین نے درست کہا تھا۔ اہلِ بخارا وحشت اور بربریت کا طوفان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ درس گاہیں جہاں قرآن پڑھا جاتا تھا تاتاریوں کے گھوڑوں کے لیے اصطبل کا کام دے رہی تھیں۔ چنگیز خان بخارا کی عظیم الشان مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اترا:

"یہ تمہارے بادشاہ کا گھر ہے؟" اس نے ایک شخص سے سوال کیا۔

"نہیں یہ خدا کا گھر ہے۔"

چنگیز خان مسجد کے اندر داخل ہوا اور اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری افواج تھکی ہوئی ہیں، انہیں خوراک اور آرام کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے اپنے اپنے گھروں کے دروازے کھول دو اور اس قسم کے کشادہ عمارتیں میرے گھوڑوں کے لیے خالی کر دو اور ان کے لیے چارہ مہیا کرو۔ یاد رکھو تم خدا کے قہر سے ڈرتے ہو اور میں تمہارے

لیے خدا کا قہر بن کر آیا ہوں۔"

چنگیز خان نے ایک مترجم کو اپنا مفہوم بیان کرنے کے لیے کہا اور مسجد سے باہر نکل آیا۔ یہ تمہید تھی۔ اس کے بعد اہلِ بخارا نے جو کچھ دیکھا، وہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ رات کے وقت مردوں کو اپنے گھروں میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ گلیوں، چوراہوں اور سڑکوں پر کھڑے اپنے مکانوں کے اندر تاتاریوں کے وحشیانہ قہقہے اور عورتوں کی جگر دوز چیخیں سن رہے تھے۔ اگر کسی کی غیرت جوش مارتی اور وہ اپنے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا تو تاتاری پہرے داروں کی تلواریں اسے خاک و خون میں لٹا دیتیں۔

امراء کے محلات پر تاتاریوں کا پہرہ اس سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دینے کے بعد ان کے خفیہ خزانوں کا پتہ لگایا جاتا اور جب وہ ایک خزانے کا پتہ دیتے، انہیں یہ کہا جاتا کہ تم نے اور بھی بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ وہ سب کچھ دے بیٹھتے لیکن تاتاری مرتے دم تک ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ بخارا کے باشندوں کے ہاتھ میں بیلچے دے کر امراء

کے مکانات کی بنیادیں کھدوائی گئیں اور جب تاتاریوں کو یقین ہو گیا کہ اب بخارا میں کوئی کارآمد چیز باقی نہیں رہی تو شہر کے تمام باشندوں کو ہانک کر ایک کھلے میدان میں لے آئے۔

اب کسی کو غلط فہمی نہ تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہر طرف عورتوں اور بچوں کی جگر دوز چیخیں سنائی دے رہی تھی، مردوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چیختی چلاتی عورتیں زبردستی کھینچ کھینچ کر مردوں سے علیحدہ کی گئیں۔ بے کس نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان کی آزادی چھن چکی تھی اور شہر میں ان کے مکانات میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اب ان کی عورتیں بھی ان سے چھینی جا رہی تھیں۔ وہ پردہ نشیں عورتیں جن میں آج تک چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا تھا، تاتاری ان کے بچوں اور ان کے شوہروں کے سامنے ان کی عصمت دری کر رہے تھے۔ مردوں کے سامنے تاتاری سواروں کے نیزوں کی دیوار کھڑی تھی اور ان کے ہتھیار چھینے جا چکے تھے۔

امام زادہ رکن الدّین چلایا۔ ''بُزدِلو! کیا دیکھتے ہو! چاروں طرف سے اللہ

اکبر کی صدا بلند ہوئی اور اہلِ بخارا تاتاریوں پر ٹوٹ پڑے۔ خالی ہاتھوں سے تلواروں کا مقابلہ شروع ہوا لیکن چند لمحات میں کئی آدمی تاتاریوں سے گتھم گتھا ہو کر ان کے نیزے، تلواریں اور تیر چھین چکے تھے۔ عورتوں کی عصمت دری کرنے والوں میں سے اکثر کو تلواریں سنبھالنے اور گھوڑوں پر سوار ہونے کا موقع ملا لیکن تاتاریوں کی بیشتر فوج گھوڑوں پر چوکس تھی۔ انہوں نے چند حملوں میں لاشوں کے انبار لگا دیے، تاہم دو ہزار تاتاری مارے گئے۔ تاتاریوں نے غضب ناک ہو کر چند گھنٹوں کے قتل عام کے بعد میدان صاف کر دیا۔ صرف چند عورتیں بچیں۔ ان کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر گھوڑوں کی زینوں کے ساتھ منسلک کیا گیا اور تاتاریوں نے سمرقند کی طرف کوچ کر دیا۔

گھوڑوں کے ساتھ بندھی عورتیں زیادہ دور تک ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکیں۔ جب قیدی عورتیں دم توڑ کر گر پڑیں، تاتاری سوار خنجر کے ساتھ ان کی رسیاں کاٹ دیتے۔

چنگیز خان کو بخارا کی فتح کی خوشی سے زیادہ اپنے دو ہزار آدمیوں کی موت

کا افسوس تھا۔

(۳)

سمرقند دفاعی انتظامات کے لحاظ سے خوارزم شاہ کا مضبوط ترین شہر تھا۔ شہر کی حفاظت کے لیے ایک لاکھ دس ہزار سپاہی موجود تھے لیکن بخارا کی فتح کی غیر متوقع خبر سے سلطان کی رہی سہی خود اعتمادی نہ رہی اور وہ چند سرداروں کو شہر کی قیادت سونپ کر بلخ کی طرف نکل گیا۔ فوج کو جن دو بڑی شخصیتوں سے صحیح رہنمائی کی توقع تھی، وہ سمرقند میں موجود تھیں۔ سلطان کا نوجوان بیٹا جیسے شیر خوارزم کہا جاتا تھا، سلطنت کے شمال مغرب علاقوں میں افواج تیار کر رہا تھا۔ اس نے ایلچی بھیج کر اپنے ضدّی باپ سے سمرقند آنے کی اجازت مانگی لیکن سلطان کی طرف سے یہ جواب ملا ”تم ابھی زیادہ تجربہ کار نہیں ہو۔ جب ضرورت ہو گی تمہیں بلا لیا جائے گا۔“

دوسرا تیمور ملک تھا جس نے قوقند کے معرکوں میں سارے ترکستان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے متعلق سمرقند کے ہر بچے اور بوڑھے کی رائے یہ

تھی کہ وہ ایک لاکھ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تاتاریوں کو میدان میں شکست دے سکتا ہے لیکن سلطان نے سمرقند پہنچتے ہی اسے بلخ کے آس پاس جنگ جو قبائل کو منظّم کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جب خوارزم شاہ بھی سمرقند سے نکل گیا تو تمام لشکر میں مایوسی پھیل گئی۔ اتابک ملک اور سردار ذاتی رقابتوں کے باعث پہلے ہی مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کوئی بااثر شخصیت سرپر نہ ہونے کی وجہ سے یہ اختلاف اور بڑھ گیا۔

محاصرے کے دوران میں چنگیز خان کے بیٹے جو دریائے سیحوں کے کنارے بہت سے شہر فتح کر چکے تھے، قیدیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ اپنے باپ سے آملے۔ سمرقند کی فصیل بہت مضبوط تھی۔ بارہ آہنی دروازے جن کی حفاظت کے لیے برجوں پر تیر اندازوں کا پہرہ تھا، ناقابلِ تسخیر تھے۔

چنگیز خان نے قیدیوں کو فصیل کے ارد گرد مورچے کھودنے کے کام پر لگا دیا اور طویل محاصرے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شہر کی محافظ فوج کو یہ احساس ہونے لگا کہ ایک دو ماہ تک تاتاری آس پاس کے علاقے میں اس

قدر مضبوطی سے پاؤں جمالیں گے کہ باہر سے کوئی کمک اہل شہر کی مدد کے لیے بھیجی بھی گئی تو اس کے لیے شہر تک پہنچنا ناممکن ہو گا۔ مورچے تعمیر کرنے کے لیے تاتاری آس پاس کی بستیوں سے قیدیوں کی نئی نئی ٹولیاں لا رہے تھے۔

ان حالات کے پیشِ نظر فوج کے سرداروں نے شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ترک نہایت بہادری سے لڑے لیکن عین اس وقت جب کہ تاتاریوں کے پاؤں اُکھڑ رہے تھے، چند سردار جنہوں نے پہلے ہی چنگیز خان کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی تیس ہزار فوج کے ساتھ اس سے جا ملے۔ فتح کے بعد چنگیز خان نے پہلے دن اُن کی آؤ بھگت کی۔ انہیں پہننے کے لیے تاتاری سپاہیوں کا لباس دیا لیکن شہر میں قتل عام سے فارغ ہو کر ان تیس ہزار غدّاروں کو ان کے سرداروں سمیت رات کے وقت نیند کی حالت میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چنگیز خان دشمن کے غدّاروں سے کام لینے کا قائل تھا لیکن انہیں زندہ رکھنے کا قائل نہ تھا۔

سمرقند کی فتح کے بعد چنگیز خان نے اپنے بہترین سواروں کو خوارزم شاہ

کے تعاقب میں بھیج دیا۔ چنگیز خان کا خیال تھا کہ اگر خوارزم شاہ کو مہلت ملی تو وہ چند دِنوں میں ایک اور لشکر تیار کر لے گا۔ اس لیے اس نے تعاقب کرنے والی افواج کے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ ہر قیمت پر خوارزم شاہ کا سراغ لگائیں اور جس شہر میں وہ موجود ہو، اس کا محاصرہ کر لیں۔ باقی شہروں اور بستیوں سے کترا کر گزرتے جائیں۔

خوارزم شاہ کو بھی یہ پتہ چل گیا کہ تاتاری اب اس کی سلطنت کے شہروں کو فتح کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔

خوارزم شاہ مختلف شہروں سے گزرتا ہوا نیشاپور پہنچا۔ تاتاری راستے کے شہروں کو چھوڑتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے تو خوارزم شاہ نے ہمدان کا رخ کیا لیکن تاتاری سائے کی طرح اس کے پیچھے تھے۔ ایک مقام پر انہوں نے اسے آلیا اور خوارزم شاہ کے ساتھیوں میں سے چند ساتھیوں میں سے چند ایک کے سوا باقی تمام تہ تیغ کر دیے گئے۔ خوارزم شاہ خود تیروں سے زخمی ہو کر بھاگا۔ اب دنیا میں اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی جان بچانا تھا۔ اس کے ساتھی اس سے تنگ آ چکے تھے۔ اس نے چاروں طرف

سے مایوس ہو کر بحیرہ خزر کے کنارے ڈیرہ ڈال دیا اور تمام قبائل کے سرداروں کی طرف ہرکارے دوڑا دیے لیکن اس کی مدد کے لیے کوئی نہ پہنچا۔

(۴)

خوارزم شاہ کو اب دنیا میں کسی پر اعتماد نہ تھا۔ تاتاریوں کی طرح اسے اپنے سپاہیوں سے بھی ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا۔ وہ اپنے لیے کئی خیمے نصب کرواتا لیکن ایک دو غلام کے سوا کسی کو خبر نہ ہوتی کہ وہ آج رات کہاں سویا ہے۔ ایک رات وہ اپنے کشادہ خیمے سے نکل کر ایک چھوٹے سے خیمے میں جا کر سو گیا۔ صبح کے وقت دوسرا خیمہ تیروں سے چھلنی تھا۔

ایک شام وہ سمندر کے کنارے کھڑا تھا کہ اسے فاصلے پر گرد اُڑتی ہوئی دکھائی دی۔ اسے شک گزرا کہ تاتاری آرہے ہیں لیکن ایک سپاہی نے آ کر خبر دی کہ یہ مسلمانوں کی فوج ہے۔ لشکر قریب آ کر رک گیا۔ وہ

صرف پانچ ہزار سپاہی تھے۔ خوارزم شاہ کو مایوسی ہوئی۔ ایک سوار آگے بڑھا اور خوارزم شاہ کو دور سے پہچان کر گھوڑا بھگاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

یہ جلال الدّین تھا۔

ایک لمحے کے لیے باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے، خوارزم شاہ نے کہا۔ "جلال! گھوڑے سے نہیں اترو گے؟"

"نہیں، مجھے بہت دور جانا ہے۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"تو تم میری مدد کے لیے نہیں آئے؟"

"اس ویران جگہ پر آپ کو کیا خطرہ ہے۔ میں موت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ موت سے بھاگنے والوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

خوارزم شاہ نے آگے بڑھ کر جلال الدّین کے گھوڑے کی باگ پکڑتے

ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں نہیں، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ زمین میرے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ تم میرا آخری سہارا ہو۔ چلو میں تمہیں اپنا خیمہ دکھاتا ہوں، وہ تیروں سے پٹا پڑا ہے۔ آج ساری دنیا میری دشمن ہے۔ کیا میرا بیٹا بھی میرا ساتھ نہیں دے گا؟“

جلال الدّین نے جواب دیا۔ ”کاش آپ نے دنیا کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہوتی۔ آپ کی وجہ سے ملک کو ایک وحشی اور حقیر دشمن کی غلامی نصیب ہوئی۔ آپ نے صرف اپنی جان کے خوف سے سارا ملک بھیڑیوں کے سپرد کر دیا۔ قوم آپ کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ مسلمان آپ کی وجہ سے تاتاریوں کے ہاتھوں اپنی بہو بیٹیوں کی بے حرمتی دیکھ رہے ہیں۔ آپ آج انہیں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ وہ آکر آپ کے خیمے پر پہرہ دیں لیکن کس منہ سے؟“

”جلال! جلال!! میں تمہارا باپ ہوں؟“

”کاش! میں آپ کے گھر پیدا ہونے کی بجائے ایک غریب لیکن بہادر

آدمی کے گھر پیدا ہوتا!"

"جلال! میرا دل نہ دکھاؤ۔"

"کاش! آپ کے پہلو میں دل ہوتا۔ لیکن قدرت نے وہاں گوشت کا ایک بے جان لوتھڑا رکھ دیا ہے۔"

"آخر ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، آپ کے ساتھ میری آخری ملاقات ہے اور میں آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ خزانہ میرے حوالے کر دیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ بخارا اور سمرقند کے خزانوں کی طرح وہ بھی تاتاریوں کے قبضے میں نہ آ جائے۔ مجھے تازہ افواج تیار کرنے کے لیے ایک ایک کوڑی کی ضرورت ہے۔" "تو تمہارا خیال ہے کہ تم تاتاریوں کے ساتھ لڑ سکتے ہو؟"

"میرا شروع سے یہ خیال تھا لیکن آپ نے میرا راستہ روکے رکھا؟"

”جلال! تاتاریوں کے ساتھ لڑنے کا خیال ایک جنون ہے اور میں اس مصیبت میں اپنی رہی سہی پونجی سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ خدا کے لیے میرا ساتھ دو۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ تمہاری جان عزیز ہے۔ اس آسمان کے نیچے ایسی جگہیں ہیں جہاں ہم آرام سے باقی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم مصر چلے جائیں گے۔ اندلس چلے جائیں گے۔“

”میں بزدلوں کی زندگی بسر کرنے والوں کا ساتھ دینے کی بجائے بہادروں کی موت مرنے والوں کا ساتھ دوں گا۔ وہ قوم جو آپ کے تخت و تاج کے لیے خون بہاتی رہی، آج اسے میرے خون اور پسینے کی ضرورت ہے۔ میں اسے پیٹھ نہیں دکھا سکتا۔ ایسے موقعوں پر ایک سپاہی فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر میدان میں کودنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اپنا فرض پورا کروں گا۔ فتح اور شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جیتے جی شکست کا اعتراف ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر میں ان پانچ ہزار سپاہیوں کو بہادروں کی موت مرنا سکھا دوں تو ساری قوم جی اُٹھے گی۔ آپ مصر جائیے۔ مجھے اس خزانے کی ضرورت نہیں، میں

پیٹ پر پتھر باندھ کر اور جسم پر چیتھڑے اوڑھ کر لڑوں گا اور مجھے یقین ہے کہ قوم میرا ساتھ دے گی!"

جلال الدّین نے ہانک کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

"جلال ٹھہرو! مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہاں میرا کوئی نہیں، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

جلال الدّین نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ "چلیے۔"

"لیکن کہاں؟"

"موت کے پیچھے۔ آزادی کی تلاش میں!"

"نہیں نہیں بیٹا! میرا کہا مانو۔ ہم تاتاریوں سے نہیں لڑ سکتے!"

"خدا اور رسول کے احکام سے زیادہ میرے لیے آپ کا حکم مقدم نہیں۔ ہماری منزل اور راستے مختلف ہیں۔ خدا حافظ!"

چند دن کے بعد خوارزم شاہ کو کسی نے تاتاریوں کی آمد کی خبر دی اور وہ

اپنے چند رفیقوں سمیت بحیرہ خزر کے ایک جزیرے میں پناہ گزیں ہو گیا اور وہیں گمنامی کی موت مر گیا۔

(۵)

تاتاریوں کا سیلِ ہمہ گیر ترکستان، خراسان اور ایران کے وسیع میدانوں کا رُخ کر رہا تھا۔ آگ اور خون کے اس طوفان کے سامنے پہاڑ، دریا اور قلعے کوئی شے نہ تھے۔ شمال اور مغرب میں تاتاریوں کے سیلاب کی لہریں سلطنتِ خوارزم کی حدود سے آگے گزر کر دریائے ڈنیپر کے کناروں کو چھو رہی تھیں۔ چنگیز خان کا ایک بیٹا ماسکو کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور دوسرا مشرقی یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کر رہا تھا لیکن خوارزم کی وسیع سلطنت میں ابھی تک ایک ناقابلِ تسخیر چٹان موجود تھی۔ سیلاب کی تند و تیز لہریں کئی بار اس کے اوپر سے گزر گئیں لیکن اسے متزلزل نہ کر سکیں۔ خوارزم کی خاکستر میں ابھی تک آگ کی ایک چنگاری سلگ رہی تھی اور چنگیز خان یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس چنگاری کو ختم نہ کیا گیا تو راکھ کا یہ انبار کسی دن ایک آتش فشاں پہاڑ

بن جائے گا۔ یہ آہنی چٹان اور یہ نہ بجھنے والی چنگاری جلال الدّین تھا۔ ایک بزدل باپ کا بہادر بیٹا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جیتے جی ہار ماننا نہیں جانتے۔ جو فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر لڑتے ہیں۔ طوفان میں کودتے ہوئے سمندر کی گہرائی کی پروانہیں کرتے۔

جلال الدّین نے جانبازوں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ساتھ کئی میدانوں میں تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک جگہ سے شکست کھا کر نکلتا اور دوسرے دِن یہ سُنا جاتا کہ وہ تیس یا چالیس کوس دور اپنی سلطنت کے کسی کھوئے شہر کو واپس لے چکا ہے۔ کبھی اس کے ساتھ پانچ ہزار سپاہی ہوتے کبھی پانچ سو اور کبھی پانچ سے بھی کم لیکن وہ لڑتا رہا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح عقب سے حملہ کرتا، عقاب کی طرح ہراول پر جھپٹتا اور تاتاریوں کے دیکھتے دیکھتے کسی پہاڑی جنگل میں روپوش ہو جاتا۔

رات کے وقت اس کے سوار تاتاریوں کی چھاؤنیوں پر حملہ کرتے، اور آن کی آن میں جلتی ہوئی مشعلوں سے سینکڑوں خیموں کو آگ لگا جاتے۔ وہ تاتاریوں کی ٹڈی دل افواج سے مرعوب نہ ہوا۔ مفتوحہ شہروں اور

بستیوں پر تاتاریوں کے مظالم کی داستانیں اس کا حوصلہ پست نہ کر سکیں۔

بخارا، سمرقند اور دوسرے شہروں پر تاتاریوں کے مظالم کی داستانیں سن کر جنوب کے شہروں کی بیشتر آبادی ہمسایہ ممالک کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ عراق، شام، افغانستان اور مصر کی طرف جانے والے راستوں پر لاکھوں پناہ گزین بچوں، مردوں اور عورتوں کے قافلے بھوک سے مر رہے تھے۔ صاحبِ حیثیت لوگ محمد شاہ کی پہلی شکست کی خبر پاتے ہی دوسرے ممالک میں ہجرت کر چکے تھے۔ لیکن چند اور شہر فتح ہونے کے بعد جب سب کو یقین ہو گیا کہ تاتاری کسی ایسے مسلمان مرد کو زندہ نہیں چھوڑتے جو تلوار اٹھا سکتا ہو تو غریب اور نادار لوگ بھی اپنی بستیاں اور شہر خالی کرنے لگے۔ قافلوں اور قافلوں کے رہنماؤں میں سے بہت کم کو علم ہوتا کہ ان کی منزل کہاں ہے لیکن وہ جا رہے تھے۔ شام مشرق سے تاتاریوں کا خوف انہیں جنوب مغرب کی طرف دھکیل رہا تھا۔

جن قافلوں کا تاتاریوں سے تصادم ہوتا، ان میں سے چند خوب صورت عورتوں کے سوا تمام کو قتل کر دیا جاتا۔

روزِ ازل سے لے کر اب تک دِن کے وقت سورج اور رات کے وقت تاروں نے خدا کی زمین پر اپنی آنکھوں سے ایسے مظالم نہ دیکھے تھے۔

پناہ گزینوں کی زیادہ تر تعداد مرو کا رُخ کر رہی تھی۔ اور یہ وہ شہر تھا جو چھ صدیاں پیشتر ترکستان کے فاتح اعظم قتیبہ بن مسلم باہلی کا مستقر تھا، جہاں سلطان سنجر سلجوقی کی قبر موجود تھی۔

جلال الدّین کی سرگرمیوں کے باعث بیشتر پناہ گزینوں کو تاتاریوں کے ہاتھوں سے بچ کر مرو پہنچنے کا موقع مل گیا۔ چند مہینوں میں مرو میں کئی لاکھ پناہ گزین جمع ہو چکے تھے۔

اہم فیصلے

طاہر کو قید ہوئے دس مہینے گزر چکے تھے۔ ابتدائی چند ہفتے عوام بہت مشتعل رہے لیکن آہستہ آہستہ ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور مظاہرے بند ہو گئے۔ حکومت نے عوام کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالعزیز، عبد الملک اور ان کے ساتھیوں کے متعلق حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کے جرم میں گرفتاری کے احکام جاری کر دیے لیکن سنجیدہ اور بااثر لوگوں کا ایک طبقہ ان کا حامی تھا اور حکومت کو انہیں پرامن طریقے سے گرفتار کرنے کا موقع نہ ملا۔

بخارا، سمرقند، طوس، ترمز اور رے کے متعلق المناک خبریں سن کر اہلِ بغداد نے پھر کروٹ لی اور طاہر کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے

لگا۔ پناہ گزینوں کا ایک قافلہ بغداد پہنچا اور ان کی زبانی تاتاریوں کے روح فرسا مظالم کی داستانیں سننے کے بعد بغداد کی ہر محفل میں خلیفہ اور امرائے سلطنت کی بے حسی پر نکتہ چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ تاتاریوں کے ایران میں داخل ہونے کی خبر سن کر ان کی بے چینی خوف و ہراس میں تبدیل ہو گئی اور لوگ کھلے بندوں وزیر اعظم، خلیفہ اور دوسرے امراء کے خلاف غم و غصّے کا اظہار کرنے لگے۔

ایک رات شہر کی ہر مسجد کے دروازے پر اس مضمون کے اشتہار چسپاں تھے:

"غفلت کی نیند سونے والو! جاگو! ہلاکت اور بربادی کا طوفان بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ جن لوگوں کو تم اپنا محافظ سمجھتے ہو، وہ تاتاریوں کے ساتھ تمہاری عزّت اور آزادی کا سودا کر چکے ہیں۔ کیا اب تک حکومت کی غیر جانبداری یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ طاہر بن یوسف نے خلیفہ اور چنگیز خان کے درمیان جس خفیہ سمجھوتے کا انکشاف کیا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اگر طاہر کا الزام غلط تھا تو حکومت اس پر کھلی

عدالت میں مقدمہ چلانے کی جرأت کیوں نہ کرتی؟ اگر خلیفہ کو علاؤ الدّین محمد خوارزم شاہ سے دشمنی تھی تو وہ چل بسا۔ اب ترکستان، خراسان اور ایران میں تاتاریوں کے ناقابلِ بیان مظالم کی اطلاعات سن کر بھی خلیفہ دشمنانِ اسلام کے خلاف اعلانِ جہاد کیوں نہیں کرتا؟

بغداد کے لوگو! تمہارے غدّار تمہیں اس دشمن کے ہاتھ میں فروخت کر رہے ہیں جو کسی پر رحم کرنا نہیں جانتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے لیے ایک فیصلہ کرو۔ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک پیغام سنایا جائے گا!"

جمعہ کے دن مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور پیغام سنانے والا عبد الملک تھا۔ سامعین محسوس کر رہے تھے کہ طاہر بن یوسف کی روح قید خانے سے نکل کر اس کے وجود میں آگئی ہے۔ اس کی تقریر کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ جن قاضیوں نے طاہر بن یوسف کے خلاف باغی ہونے کا فتویٰ دیا تھا، ان کے مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ شام کے وقت مشتعل ہجوم وزیر اعظم کے محل کے دروازے کے سامنے نعرے لگا رہا تھا۔

(۲)

اکابرینِ سلطنت ایک وسیع کمرے میں خلیفہ کی مسند کے سامنے کرسیوں رونق افروز تھے۔ نقیب نے خلیفہ کی آمد کا اعلان کیا اور امراء اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سپاہی نے مسند کے پیچھے دروازے کا پردہ ہٹایا اور خلیفہ چار حبشی غلاموں کی ننگی تلواروں کے سائے میں مسند پر نمودار ہوا۔ نقیب کے دوسرے اعلان پر امراء اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

خلیفہ کے حکم پر ناظمِ شہر نے اُٹھ کر شہر کی تازہ صورت حالات کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی اور اکثر امراء نے یکے بعد دیگرے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ تمام اس بات متّفق تھے کہ طاہر کی گرفتاری کے بعد عوام بے حد مشتعل ہو چکے ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے قاضی کا مکان صرف اس لیے جلایا گیا ہے کہ انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا تھا اور ان علما نے اس کے بے دین ہونے کا اعلان کیا تھا۔ مشتعل ہجوم ان گھروں پر ہر روز پتھر پھینکتا ہے۔ شہر کی مساجد پر گمراہ قسم کے نوجوان قابض ہو رہے ہیں اور سلطنت کے ایک ایک عہدے دار کو برسرِ منبر

کوسا جا رہا ہے۔ شہر کے کوتوال نے بتایا کہ عبد العزیز اور عبد الملک کی کوششوں سے فوج کے کئی سپاہی اور افسر در پردہ ان باغیانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

خلیفہ نے یہ تمام واقعات سننے کے بعد بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "باغیوں کی سرگرمیوں کے متعلق ہم بہت کُچھ سُن چکے ہیں۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ تم لوگوں نے اب تک کیا گیا ہے۔ کتنے آدمی گرفتار کیے؟"

کوتوال اور ناظمِ شہر اس سوال پر وزیر اعظم کی طرف دیکھنے لگے۔ وزیر اعظم نے اُٹھ کر کہا۔ "امیر المومنین کی اجازت سے میں اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔"

خلیفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وزیر اعظم نے کہا۔ "لوگ اس بات سے زیادہ بد ظن ہوئے ہیں کہ ہم نے طاہر پر مقدمہ چلائے بغیر اسے قید میں ڈال دیا ہے اس نے اپنی تقریروں میں حکومت پر سخت الزامات لگائے تھے۔ اگر اسے عدالت میں لایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ کسی الزام کا

ثبوت نہیں دے سکے گا اور رائے عامہ جو آج ہمارے خلاف ہے کل اس سے کہیں زیادہ اس کے خلاف ہو جائے گی۔ ہم اگر آج اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں تو بغداد کے قید خانے بھر جائیں گے لیکن باغیوں کی تعداد میں کمی نہ ہو گی۔"

"اس کے علاوہ ترکستان کے مفتوحہ علاقوں پر تاتاریوں کے مظالم کی داستانیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب اسلامی ممالک کے باشندوں کو پتہ چلے گا کہ بغداد کے عوام حکومت کو تاتاریوں کے ساتھ ساز باز کرنے کا مجرم گردانتے ہیں اور حکومت کھلی عدالت میں نیک نیتی کا ثبوت دینے کی بجائے لوگوں پر سختی کر کے ان کی آواز دبانا چاہتی ہے تو وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ حکومت واقعی مجرم ہے۔ طاہر نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے ساتھ جو نوکر یہاں سے روانہ ہوئے تھے، ان کے منڈے ہوئے سروں پر سابق وزیر خارجہ اور حضرت امیر المومنین مدّ ظلہ العلیٰ کے دستخطوں سے ایسی تحریر لکھی ہوئی تھی جس میں تاتاریوں کو خوارزم پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی لیکن ہم آسانی

سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ ایک افسانہ ہے۔ وحید الدّین اپنی پہلی سازش کے انکشاف کے بعد اچانک روپوش ہو گیا تھا اور آج تک اس کا پتہ نہیں اور طاہر یہاں سے وحید الدّین کے روپوش ہو جانے سے ایک ڈیڑھ ماہ بعد قراقرم کی طرف روانہ ہوا تھا، اس لیے وہ یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس کے ساتھی وحید الدّین سے کوئی تحریر یا ہدایت لے کر گئے تھے۔

اس کے علاوہ اس کے بیان کے مطابق وہ تینوں آدمی مارے جا چکے ہیں اور ان کے سر خوارزم شاہ کے پاس بھیجے گئے تھے اس لیے وہ اس تحریر کے متعلق بھی کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اسے قاضی کے سامنے لایا جائے تو بغداد کا احمق ترین آدمی بھی اسے جھوٹا خیال کرے گا۔ اس کے برعکس اس پر مقدمہ چلائے بغیر اسے قید میں رکھنے کا کوئی اور سزا دینے سے بغداد کے لوگوں کی بے چینی بڑھتی جائے گی۔“

امرائے سلطنت کی اکثریت نے وزیر اعظم کی تجویز کی حمایت کی۔ خلیفہ نے مہلب بن داؤ کی طرف دیکھا اور اس نے اٹھ کر نہایت پس انداز میں تقریر شروع کی:

"ہم طاہر کو ایک معمولی عقل کا آدمی سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ بغداد کی فضا مکدّر کرنے کے لیے حکومت خوارزم کی ہدایات پر عمل کر رہا ہے۔ اس کی دولت کے قصّے پہلے بھی مشہور تھے اور اب وہ اس مہم کے لیے یقیناً اپنے ساتھ بہت کُچھ لے کر آیا ہو گا۔ وہ نوکر جو اس کے ساتھ گئے تھے، نہایت معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ ممکن ہے کہ دولت کے لالچ سے وہ اس کے مقاصد کا آلہ کار بننے کے لیے تیار ہو گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زندہ ہوں اور طاہر نے انہیں بغداد کے کسی گوشے میں چھپا رکھا ہو اور ان کی موت کا قصّہ اس لیے مشہور کیا ہو کہ ہم ان کی جستجو نہ کریں۔ آپ صرف اس بھروسے پر اسے عدالت میں اپنے الزامات ثابت کرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں کہ اس کے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہیں۔ لیکن اگر اچانک وہ تین آدمی کسی گوشے سے نکل کر عدالت میں آ جائیں تو عوام کو آپ نہیں سمجھا سکیں گے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ وحید الدّین محض اس سازش کو چھپانے کے لیے روپوش ہو گیا ہو، اسی نے ان تینوں آدمیوں کے سروں پر کچھ لکھا ہو اور اس نے خلیفہ کے جعلی دستخط کیے ہوں۔ کسی

کے لیے سابق وزیر خارجہ کے ہاتھ کی تحریر پہچاننا مشکل نہ ہو گا۔ طاہر نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ قراقرم میں ان کے سر مونڈ کر یہ تحریریں پڑھی گئیں۔ اس لیے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بغداد سے طاہر کے ساتھ بھیجنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔"

"وحید الدّین ایک عام آدمی نہ تھا۔ وہ حکومت کا ایک اہم رکن تھا۔ اگر عدالت میں اس کی سازش ثابت ہوئی تو عوام ہم سب کو مجرم گردانیں گے۔ اس لیے میں اسے عدالت میں لانا خطرے سے خالی نہیں سمجھتا۔ تاہم میں وزیر اعظم کی اس رائے کے حق میں ہوں کی سر دست کسی سخت اقدام سے عوام کو مشتعل کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر ہم تدبّر سے کام لیں تو یہ تمام مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ حضرت امیر المومنین مدّ ظلہ، اور قابلِ احترام وزیر اعظم مجھے اجازت دیں تو میں تخلیے میں ایک تجویز پیش کروں گا۔"

خلیفہ نے عصر کے وقت وزیر اعظم اور مہلب کو حاضر ہونے کا حکم دے کر مجلس برخاست کی۔

عصر کے وقت جب وزیر اعظم خلیفہ کے محل کے دروازے پر پہنچا تو شہر کا ناظم اور مہلب باہر نکل رہے تھے۔ وزیر اعظم کے استفسار پر مہلب نے بتایا کہ مجھے خلیفہ نے وقت سے پہلے ہی بلا لیا تھا اور میں اپنی تجویز پیش کر چکا ہوں۔ خلیفہ میرے ساتھ متّفق ہیں اور اب میں آپ کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے خلیفہ کو مشورہ دیا ہے کہ طاہر کو قید سے فرار ہونے کا موقع دیا جائے۔ تاتاریوں کی افواج مرو پر حملہ کر چکی ہیں وہ اور اس کے تمام سر پھرے ساتھی موقع ملتے ہی اس طرف بھاگ جائیں گے۔ اس کے بعد لوگ خود بخود ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد سرکاری جاسوسوں نے بتا دیا تھا کہ اگر اسے گرفتار نہ کیا جاتا تو وہ ایک دن یا دو دن کے اندر بغداد چھوڑنے والا تھا۔ اب ہم اسے رہائی کا موقع دیتے ہی شہر میں منادی کرا دیں گے کہ اسے پکڑنے والے کو ایک بہت بڑی رقم انعام دی جائے گی اور اس کے چلے جانے کے ایک یا دو دن بعد ہم یہ مشہور کر دیں گے کہ وہ خوارزم شاہ کے ایما پر بغداد میں فتنہ پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ ”آپ نے ہمیں یہ راستہ بتا کر ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ میں بھی داروغہ کو حکم بھیجتا ہوں کہ اسے قید خانے سے بھگا دے۔“

مہلب نے کہا۔ ”یہ کام میرے سپرد کیجیے۔ میں کل ناظمِ شہر کے ساتھ خود داروغہ کے پاس جاؤں گا اور اسے سمجھا دوں گا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔“

وزیر اعظم نے کہا۔ ”آپ نے مجھے بہت بڑی ذہنی کوفت سے نجات دلائی، میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

مہلب نے جواب دیا۔ ”یہ میرا فرض تھا۔“

”لوگ بہت زیادہ مشتعل ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں اسے جلدی قید خانے سے نکال دینا چاہیے۔“

”آپ مطمئن رہیں، وہ کل تک آزاد ہو جائے گا۔“

(۳)

صفیہ دریا کے کنارے بالائی منزل کی چھت پر کھڑی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ مغربی افق پر آفتاب کو اپنی آغوش میں لینے والے بادلوں کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ پرندے آسمان کی مشعل کو روپوش ہوتے دیکھ کر اپنے اپنے گھونسلوں میں پناہ لے رہے تھے۔ فضا کے دُھندلکے کے ساتھ چاند کا زردی مائل چہرہ روشن ہونے لگا۔ ستارے آسمان کے آنچل سے جھانکنے لگے اور مغموم کائنات مسکرا اُٹھی۔ فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ماہی گیر اپنی اپنی کشتیاں دوسرے کنارے پر لگا رہے تھے۔ پانی کی سطح سے کبھی کبھی کوئی بے قرار مچھلی ایک دو بالشت اچھلتی پھر روپوش ہو جاتی۔

صفیہ نیچے اترنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بے پروائی سے منہ پھیر لیا۔ یہ قاسم تھا۔

اس نے کہا۔ ”صفیہ سردی لگ جائے گی۔ چلو نیچے!“

صفیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ کر پھر دریا کی طرف دیکھنے لگی۔

"صفیہ! خدا کے لیے بولو۔ مجھے جی بھر کر کوسو۔ میرے لیے تمہاری یہ خاموشی ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ اس دریا کا رخ بدل دینے سے تمہاری کھوئی ہوئی مسکراہٹ واپس دلا سکتا ہوں تو خدا کی قسم میں اس کے لیے بھی تیار ہو جاؤں گا!"

وہ چلائی۔ "تم جھوٹے ہو۔ تم مکّار ہو۔ خدا کے لیے جاؤ مجھے پریشان نہ کرو!"

"بس میں یہی سننے کے لیے آیا تھا۔" اس نے اپنی خفّت کو چھپاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

صفیہ نے اور زیادہ تلخ ہو کر کہا۔ "تم ظالم ہو۔ تم کمینے ہو۔ تم قوم کے غدّار ہو۔ جاؤ ورنہ میں اس چھت سے چھلانگ دوں گی!"

قاسم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ "صفیہ واقعی تمہیں مجھ سے اتنی نفرت "میں تمہیں نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔" اس نے اپنا بازو

چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ طاہر کی وجہ سے ہے۔ وہ بے وقوف بدّو!" قاسم غصّے سے دانت پیس رہا تھا۔

"میں تمہیں ہمیشہ قابلِ نفرت سمجھتی تھی۔"

"تم جھوٹ کہتی ہو۔ تم نے آج جو کچھ ابّا، امی اور سکینہ سے کہا ہے، میں سن چکا ہوں۔ مجھ سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ تم اس جاہل سے محبت کرتی ہو۔ لیکن تمہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ تم میرے پاؤں پر سر رکھنے پر مجبور ہو جاؤ گی!"

صفیہ نے قاسم کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں مر جانا بہتر سمجھوں گی اور میں یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتی کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ میں نے جو کچھ چچا، چچی اور سکینہ سے کہا ہے، تمام دنیا کے سامنے کہوں گی۔ تم زیادہ سے زیادہ موت کی سزا دے سکتے ہو لیکن مجھے اس محل سے زیادہ اس کی قبر کی مٹی عزیز ہو گی۔ تم مجھ سے سب کچھ چھین

سکتے ہو لیکن اس کی محبت نہیں چھین سکتے۔"

"تمہیں اس کی قبر کی مٹی عزیز ہو گی لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اسے قبر کی مٹی بھی نصیب نہیں ہو گی۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں اسے ہر جگہ دیکھ سکوں گی۔ دریا کی ان لہروں میں، چاند کی روشنی میں، ستاروں کی جگمگاہٹ میں۔ وہ ہر وقت میرے پاس ہو گا۔ میں پھولوں میں اس کی مسکراہٹ دیکھوں گی، ہواؤں کی سرسراہٹ میں اس کی آواز سُنوں گی۔ تم اُسے مجھ سے چھین سکتے ہو۔ جُدا نہیں کر سکتے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ تمہاری محبت کو اس بات کی پروا نہیں کہ وہ زندہ رہے یا مر جائے۔ تمہیں اس کی زندگی کے بُلند مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"تم ان بلند مقاصد کے متعلق کیا جانتے ہو۔ ایک گندی نالی میں پلنے والا کیڑا آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرنے والے عقاب کے خیالات کیسے

سمجھ سکتا ہے؟"

"تو کیا تم یہ پسند کرو گی کہ تمہارے عقاب کے پر صرف تمہاری وجہ سے کاٹ ڈالے جائیں؟ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے زندہ رہے تو تم اسے موت کے منہ سے بچا سکتی ہو۔ لیکن تمہیں ایک چھوٹی سے قربانی دینا پڑے گی۔"

"میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔"

"لیکن یہ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں صرف اس کی ذات سے محبت ہے۔ اس کے مقاصد کے لیے قربانی دینا تمہارے لیے آسان نہ ہو گا۔ تمہیں اپنی محبت قربان کرنا پڑے گی۔ بتاؤ تم اس کے لیے تیار ہو؟ بولو! خاموش کیوں ہو گئیں۔ میں آج تمہارا امتحان لینے کے لیے آیا ہوں۔ کان کھول کر سنو۔ اسے قتل کر دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن تمہارا ایک وعدہ اس کی جان بچا سکتا ہے۔ میں اسے قید خانے سے فرار ہونے کا موقع دے سکتا ہوں۔ وہ ترکستان یا کسی اور ملک میں جا کر اپنے بلند مقاصد کے لیے زندہ

رہ سکتا ہے۔“

صفیہ نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا۔ ”اور اس کے عوض مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتے ہو؟“

”یہ کہ تم میرے ساتھ شادی کر لو گی؟“

دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ صفیہ کے کانوں میں طاہر کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ ”آپ ایک عالی شان محل میں رہ کر بھی اپنا دم گھٹتا محسوس کرتی ہیں لیکن ترکستان میں آپ کی ہزاروں ایسی بہنیں جنہیں اس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ اس وقت میری توجہ کی حقدار وہ ہیں۔ اسلام کی وہ بدنصیب بیٹیاں اپنی عراق، عرب اور مصر کے پرامن شہروں میں رہنے والی بہنوں سے پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہیں کہ اگر تمہارے بھائی، شوہر اور عزیز ہماری مدد کو نہ سکتے ہیں تو خدا کے لیے ان کا راستہ نہ روکو!“

دریا میں بہتے ہوئے اس انسان کی طرح جس کے ہاتھ میں کنارے پر اگی

ہوئی گھاس کے چند تنکے آ گئے ہوں۔ صفیہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں لیکن مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ اسے قید سے چھڑانا تمہارے بس میں نہیں۔"

قاسم نے پر امید ہو کر کہا۔ "تم اطمینان رکھو۔ وہ بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔"

صفیہ نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "قاسم میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ عالم اسلام کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر تم مجھے معاف نہیں کر سکتے تو اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھوٹ ڈالو۔ میرا ہونا ایک جیسا ہے لیکن اس کی موت شاید لاکھوں انسانوں کی موت ہو۔"

قاسم نے جواب دیا۔ "تم عنقریب سنو گی کہ وہ خوارزم پہنچ چکا ہے۔ چلو نیچے چلیں۔"

صفیہ اس کے ساتھ چل دی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سکینہ نے کہا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔“

وہ جواب دیے بغیر اپنے بستر پر لیٹ گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔ سکینہ نے اسے اٹھا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”صفیہ صفیہ ! تمہیں کیا ہو گیا۔ بتاؤ۔ خدا کے لیے بتاؤ“ لیکن صفیہ نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”سکینہ جاؤ! مجھے تنہا رہنے دو۔“

(۴)

شام کے وقت قید خانے کی چار دیواری کے اندر داروغہ کے مکان کے ایک کمرے میں مہلب، ناظمِ شہر اور داروغہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ناظمِ شہر نے مہلب سے سوال کیا۔ ”فرض کیجیے۔ اگر آج اس نے کھانا نہ کھایا تو؟“

”تو کل ضرور کھائے گا۔“

داروغہ نے کہا۔ ”میری نظر میں تو وحید الدّین بھی کم خطرناک نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی وقت ہماری گردن پر تلوار ثابت نہ ہو۔ اس لیے بہتر یہ

ہو گا کہ اسے بھی قید خان کی زندگی سے آزاد کیا جائے۔"

مہلب نے جواب دیا۔ "اس کے متعلق بعد میں دیکھا جائے گا۔"

ایک سپاہی نے اندر آکر اطلاع دی کہ قاسم آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

مہلب نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "قاسم؟ بلاؤ اسے!"

قاسم نے آتے ہی شکایت کی کہ وہ اسے دیر سے ڈھونڈ رہا ہے۔

مہلب نے سوال کیا۔ "تمہیں میرے یہاں آنے کی کس نے خبر دی؟ مجھے آپ کی قیام گاہ سے پتہ چلا کہ آپ ناظم کے ساتھ گئے ہیں۔ ناظم کے گھر سے اس جگہ کا پتہ ملا۔ میں آپ سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مہلب نے ناظم اور داروغہ کو اشارہ کیا اور وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ قاسم کرسی پر بیٹھ گیا۔

مہلب نے سوال کیا۔ "آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ کہیے خیریت تو

ہے؟"

"میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔""پوچھیے!"

"مجھے ابّا جان سے معلوم ہوا کہ آپ طاہر کو فرار ہونے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔"

"یہ درست ہے لیکن یہ بات آپ کسی کو نہ بتائیے۔"

"میں بحیثیت ایک دوست کے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی یہ درست ہے؟"

"یہ بالکل درست ہے لیکن اگر آپ کو یہ بات پسند نہ ہو تو فیصلہ بعد میں کیا جا سکتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔" قاسم نے جواب دیا۔ "بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ یہ فیصلہ تبدیل نہ کریں۔"

مہلب نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ

محسوس کر رہے ہیں؟"

قاسم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "میرے پاس بوجھ محسوس کرنے والا ضمیر نہیں۔"

"میں ایسے ضمیر کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ ایسے خطرناک آدمی کو آزاد کیوں کرانا چاہتے ہیں؟ وہ آزاد ہو کر بھی میرا اور آپ کا دشمن رہے گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اُسے۔۔۔۔۔۔؟"

"آپ گھبرائیے نہیں۔ اگر آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ آزاد ہو تو میں اپنی خواہش کے خلاف بھی اسے بھاگ جانے کا موقع دوں گا۔"

قاسم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں آپ کو ایک اور تکلیف دوں گا۔"

"اگر میں اپنے دوست کے لئے کچھ کر سکوں تو مجھے راحت ہو گی۔"

"میری کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری صفیہ

کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ طاہر کو ہم نے اس کے سامنے گرفتار کیا تھا۔ اسے طاہر کے ساتھ صرف اس لیے دلچسپی تھی کہ وہ اسلام کا بہت بڑا خادم ہے۔ اب وہ مجھ سے بدظن ہو چکی ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں تو ہم اسے یقین دلا سکتے ہیں کہ طاہر کو آزاد کرانے میں میری کوششوں کو بھی دخل تھا اور آپ نے میری دوستی کی وجہ سے خلیفہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی۔ شاید اسے میرے کہنے پر یقین آ جائے۔"

مہلب نے کہا۔ "اتنی سی بات؟ میں سمجھتا تھا کہ آپ مجھے کسی بڑے کام کے لیے کہیں گے۔ کل صبح میرا پہلا کام یہی ہو گا لیکن یہی بہتر ہو گا کہ میں اس کے ساتھ باتیں کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ کسی ایسی جگہ باتیں کروں جہاں وہ سُن سکے۔"

قاسم نے جواب دیا۔ "اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اس پر صرف یہ ظاہر ہونا کافی ہے کہ میں آپ کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ وہ یقیناً سُننے کے لیے آئے گی۔"

مہلب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’آئندہ سیاسی زندگی میں آپ کے لیے ایسی ہوشیار ہوئی بہت بڑی معاون ثابت ہو گی۔ میں آپ کے سر پر سپہ سالار کی دستار دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’شکریہ! اور آپ کے متعلق میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ والد کے بعد بغداد کی وزارت عظمیٰ کا قلم دان آپ کے ہاتھ میں ہو گا۔ لیکن مجھے آپ کے متعلق خدشہ ہے کہ آپ بیک وقت دونوں عہدے سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔‘‘

’’اور آپ کے متعلق مجھے یہ خدشہ ہے کہ آپ خلیفہ کا تاج چھیننے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔‘‘ مہلب نے ہنستے ہوئے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ’’لیکن تم جانتے ہو کہ میں خلیفہ کا وفادار ہوں۔‘‘

قاسم نے اُٹھ کر کہا۔ ’’میں مذاق کر رہا تھا۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ آپ صُبح آنے کا وعدہ یاد رکھیے۔‘‘

’’میں ضرور آؤں گا۔‘‘

قدرت کا ہاتھ

طاہر مغرب کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگ رہا تھا کہ پہرے دار آئے اور اس کی کوٹھری کے اندر کھانا رکھ کر چلے گئے گزشتہ دو دن سے اس کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے دُعا سے فارغ ہونے کے بعد بھی اس نے کھانے کی طرف توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر کوٹھڑی میں ٹہلنے کے بعد وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اُٹھا اور کوٹھڑی کے دوسرے حصّے میں جا کر وحید الدّین کو آواز دی۔ ”آج آپ نہیں آئیں گے؟“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

طاہر کچھ دیر اس کے انتظار میں ٹہلتا رہا۔ پھر عشاء کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وحید الدّین نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر سوال کیا۔ ”تمہاری طبعیت اب کیسی ہے؟“

طاہر کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے قریب آ کر کہا۔ ”تم نماز پڑھ رہے ہو؟“

وہ تھوڑی دیر اس کے قریب بیٹھا رہا پھر اچانک بولا۔ ”تمہارے کمرے سے پنیر کی بُو آ رہی ہے۔“

طاہر سنت کی رکعتیں پوری کرنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے پھر زور زور سے سُونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ مجھے آج پنیر کی بُو آ رہی ہے!“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میری قوّت شامہ تو آج کام نہیں کرتی۔ دروازے کے سامنے میرا کھانا پڑا ہے۔ اگر اس میں پنیر ہے تو آپ کھا سکتے ہیں۔“ وحید الدّین نے دوبارہ زور سے سُونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”گوشت بھی ہے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں مجھے ان کمبختوں نے صرف دو عیدوں پر گوشت بھیجا ہے۔ پنیر کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ میری بات پر یقین کرو۔ پہرے داروں میں تمہارا کوئی نہ کوئی عقیدت مند ضرور ہے۔ میں گوشت اور پنیر کا خواہشمند نہیں لیکن ایسے موقعوں پر دوستوں کو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ اُف! تم نماز پڑھ رہے ہو!“

طاہر نے نماز فرض پوری کی اور کہا۔ ”آپ وہ کھانا اُٹھا کیوں نہیں لیتے۔ اگر اس میں پنیر ہے تو وہ سارا آپ کا اگر گوشت ہے تو آدھا آپ کا لیکن اگر صرف سوکھی روٹی ہے تو ساری آپ کو کھانا پڑے گی۔“

”خدا کی قسم میری قوّتِ شامہ مجھے دھوکا نہیں دیتی۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور برتن اُٹھا کر طاہر کے قریب بیٹھا۔ ”خدا تمہارے عقیدت مند کو جزائے خیر دے۔ گوشت بھی ہے اور پنیر بھی۔ ارے روٹی بھی روغنی ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”میرا انتظار نہ کیجئے۔ میں نماز ختم کر کے آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں گا۔“

"بے شک اطمینان سے پڑھو۔ کھانا ہم دونوں کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں پنیر سے شروع کرتا ہوں لیکن تمہارا حصّہ رکھ لوں گا۔ وہ نوالہ چباتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ یہ کسی فیاض آدمی کا کام ہے۔ خدا کی قسم اگر میں رہا ہو کر وزیرِ اعظم بن جاؤں تو بغداد کے تمام فیّاض آدمیوں کو قید خانے کے سپاہی بھرتی کر لوں اور یہ حکم دوں کہ بے گناہ قیدیوں کو دونوں وقت گوشت اور پنیر کھانے کو دیا جائے۔ نہیں بلکہ دودھ، شہد اور پھل بھی۔ میں سرکاری باغات کے تمام پھل قیدیوں کے لیے وقف کر دوں گا۔"

طاہر نے نماز ختم کر کے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو وحید الدّین کے جبڑوں کی آواز اُسے بہت ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک یہ چپاچپ کی آواز بند ہو گئی اور چند لمحات کے بعد طاہر کا ساتھی چلایا۔ "طاہر! طاہر! اس کھانے کو ہاتھ نہ لگانا۔ زہر! زہر!"

طاہر نے دہشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ زمین پر بسمل سا ہو کر تڑپ رہا تھا۔ "میرے دوست خدا حافظ!"

وحید الدّین نے محسوس کیا کہ کوئی اپنے طاقتور ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ چند بار کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے ہاتھوں کا سہارا لے کر سر اوپر اٹھایا اور پھر فرش پر پٹخ دیا۔ طاہر نے اس کو بازو سے سنبھال کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اچانک اس کے جسم کے تمام پٹھے تن گئے اور وہ آخری ہچکی لینے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

طاہر کی حالت اس شخص کی سی تھی جسے اچانک فالج نے آ دبایا ہو۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی اس قدر خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ چند لمحات وہ وحید الدّین کا سر اپنی گود میں لیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کی دھڑکن واپس آنے لگی۔ خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھیں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ وحید الدّین کو ٹٹول رہا تھا۔ اسے بُلا رہا تھا۔ یہ مر چکا ہے۔ اس کے دل نے آواز دی۔ نہیں تُو مر چکا ہے۔ یہ کھانا تیرے لیے آیا تھا اور اب۔

ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں آیا۔ اس کی سانس تیز ہونے لگی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دروازے سے باہر چند آدمیوں کے سیڑھیوں سے اُترنے کی آہٹ سنائی دی اور ایک آن میں اس کی تمام کھوئی ہوئی قوّتیں واپس آ گئیں۔

اس نے وحید الدّین کی لاش اٹھائی اور کوٹھڑی کے دوسرے حصّے میں جا کر سوراخ کے اندر دھکیل کر پتھر کی سلیں اوپر رکھ دیں۔ پاؤں کی آہٹ قریب آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے کھانے کے برتنوں کے قریب پہنچ کر منہ کے بل لیٹ گیا۔ آدمی دروازے پر کھڑے تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے پھر کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور تھوڑے وقفے کے بعد قفل میں چابی ڈالنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر دروازے کی زنجیر کے کھٹ سے گرنے کی آواز آئی۔ دروازے کی چرچراہٹ سُن کر طاہر نے آنکھیں بند کر لیں اور دم سادھ لیا۔

مہلب، داروغہ اور ناظمِ شہر پانچ سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں مشعل تھی۔

طاہر کے جسم کو ٹھوکر مارنے کے بعد مہلب نے کہا۔ ”دیکھا! تم کہتے تھے کہ ذرا اور انتظار کر لیں۔ اس زہر کا ایک قطرہ ہاتھی کو مار دینے کے لیے کافی تھا۔ ذرا مشعل نیچے کرو۔ میں دیکھوں اس نے کیا کھایا ہے۔“

سپاہی نے مشعل نیچے کی اور مہلب نے کہا۔ ”دیکھا میں نے کہا تھا کہ یہ بدّو سب سے پہلے پنیر سے شروع ہو گا لیکن یہ آدھے سے زیادہ چٹ کر گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چبائے بغیر نگل گیا اور ورنہ اس کا ایک ہی لقمہ کافی تھا۔ یہ باقی پنیر اٹھالو کل وحید الدّین کی دعوت ہو گی۔ آؤ میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ اب اسے سنبھالنا سپاہیوں کا کام ہے۔ دیکھو لاش کے ساتھ پتھر ضرور باندھ لینا۔ لیکن وہ اتنا بھاری نہ ہو کہ وہیں ڈوب جائے اور کل ماہی گیر اُسے دکھاتے پھریں۔ پتھر صرف اتنا ہو کہ لاش پانی کی سطح پر ظاہر نہ ہو لیکن بہتی ضرور رہے۔ داروغہ نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کیجئے۔ یہ اس قسم کی بیس لاشیں ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ یہ میرے خاص آدمی ہیں۔“

مہلب نے سونے کے چند سکے نکال کر سپاہیوں میں بانٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا انعام ہے۔“

مہلب، ناظم اور داروغہ چلے گئے۔ سپاہیوں نے طاہر کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور کندھوں پر لاد کر چل دیے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر انہوں نے اسے کشتی میں پھینک دیا۔ طاہر کی کمر میں سخت چوٹ آئی لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ تین سپاہی واپس چلے گئے اور دو سپاہی کشتی کو پانی میں دھکیل کر اس پر سوار ہو گئے۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ”تم اس کی کمر کے ساتھ پتھر باندھو اور چپو سنبھالتا ہوں۔“

”تم سب برے کام مجھ سے کرواتے ہو!“

”اب اس کے ساتھ اور برائی کیا ہو سکتی ہے؟ آج تم یہ کام کرو کل میں کروں گا۔“

”کل بھی دو دو اشرفیاں مل جائیں گی۔ خدا کرے وزیرِ خارجہ چند اور آدمیوں پر بھی اپنے زہر کی آزمائش کرے لیکن دوست اس کام سے وزیر اعظم اور داروغہ نے جو کچھ حاصل کیا ہو گا اس کا ہزارواں حصّہ بھی ہمیں

نہیں ملا۔"

کشتی پر تمام ضروری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ سپاہی نے طاہر کی کمر میں رسی ڈال کر اس کے ساتھ ایک پتھر باندھ دیا۔ منجدھار میں پہنچ کر دونوں نے طاہر کو ہاتھ اور پاؤں سے پکڑا اور آہستہ سے پانی میں ڈال دیا۔

طاہر کچھ دیر دم روکے پانی کے ساتھ بہتا رہا۔ بالآخر اس نے اوپر آنے کی کوشش کی۔ کمر کے ساتھ پتھر پہلے ہی کافی کس کر بندھا ہوا تھا اور بھیگ جانے سے رسی کی گرہ اور زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ تاہم اس نے محسوس کیا کہ وہ پتھر کا بوجھ اٹھا کر تیر سکتا ہے۔ جب تک کشتی کافی دور نہ چلی گئی۔ وہ صرف سانس لینے کے لیے سر اوپر نکال کر تیرتا رہا۔ اس نے چند بار اپنی کمر کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی کی بجائے چند غوطے آ گئے۔ کپڑوں میں پانی رچ جانے کے باعث اس نے محسوس کیا کہ اتنا بوجھ لے کر کنارے تک پہنچنا آسان نہیں۔ اس کا رخ دوسرے کنارے کی طرف تھا لیکن تیز رفتار اور سرد پانی سے کنارے کی طرف ایک گز بڑھنے کے بدلے کئی کئی گز بہاؤ کے ساتھ نیچے جانا پڑا۔

اس کی سانس پھول رہی تھی اور اس کے اعضاء شل ہو رہے تھے لیکن قدرت کی اعانت پر ایک متزلزل نہ ہونے والے یقین نے اس کی حوصلہ کو پست نہ ہونے دیا۔

(۲)

رات کے وقت سونے سے پہلے سکینہ کچھ دیر صفیہ کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ صفیہ بے توجہی سے کبھی کبھی کسی بات کا جواب دیتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔

"جاؤ سکینہ سو جاؤ۔" صفیہ یہ کہتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ سکینہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ برابر والے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازے کا پردہ اٹھایا لیکن کچھ سوچ کر صفیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"صفیہ!" اس نے جھکتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"ابھی لاتی ہوں!"

سکینہ اپنے کمرے سے چاندی کا ایک چھوٹا ساڈبہ اٹھالائی اور کُرسی کھسکا کر صفیہ کے بستر کے قریب بیٹھ گئی۔

"بھلااس میں کیاہے؟" سکینہ نے معصومیت سے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم!"

"دیکھو تو سہی۔" سکینہ نے ڈبہ کھول کر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ صفیہ نے بے پروائی سے گردن اُوپر اٹھائی اور ایک نظر ڈالنے کے بعد پھر اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

سکینہ نے ڈبے سے چمکتے ہوئے موتیوں کا ہار نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا

"یہ لو، میں نے آج ہی منگوایا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ تمہیں شادی کے موقع پر یہ تحفہ پیش کروں گی لیکن میں اتنے دن انتظار نہیں کر سکتی۔ تم

اسے اپنے پاس رکھو۔ جوہری کہتا تھا کہ اس سے بڑے موتی سارے بغداد میں نہیں۔ میں نے اسے ایک ہیرے کی انگوٹھی لانے کے لیے بھی کہا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ بغداد میں اس جیسا ہیرا کسی کے پاس نہیں ہو گا۔ لو صفیہ یہ ہار مجھے پہن کر دکھاؤ۔"

صفیہ بے حس و حرکت موتیوں کے ہار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سکینہ نے اسے بازو سے کھینچ کر اوپر اٹھایا اور اس کی مزاحمت کے باوجود اس کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

صفیہ ہار اتارنے کی کوشش کر رہی تھی اور سکینہ اسے روک رہی تھی اس زور آزمائی میں ہار کی لڑی پر دونوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

سکینہ کہہ رہی تھی۔ "خدا کے لیے اسے اتارو مت۔ یہ بدشگونی ہے۔"

"نہیں مجھے تمہارے موتیوں اور تمہارے ہیروں سے نفرت ہے۔ مجھے اس محل سے نفرت ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہے۔ سکینہ! سکینہ! مجھے تنگ نہ کرو!" اس کشمکش میں ہار ٹوٹ گیا۔ کچھ موتی بستر اور کچھ فرش

بکھر گئے۔ سکینہ ۔نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”تم بہت ظالم ہو!“

صفیہ نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ ”سکینہ مجھے معاف کر دو۔ میں صبح ان موتیوں کو اپنے ہاتھوں سے پرو کر پہن لوں گی لیکن صرف تمہارے لیے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔“

”لیکن تم نے قاسم کے ساتھ شادی کا وعدہ نہیں کیا؟ تم نے کھانا کھاتے وقت امی جان کے سامنے رضامندی کا اظہار نہیں کیا؟ میں جانتی ہوں تم صرف مُجھے رُلانا چاہتی ہو۔“

”سکینہ میرا مطلب تھا کہ اگر میں زندہ رہی تو قاسم کے ساتھ شادی کر لوں گی۔“

”پگلی۔ لوگ جیسے مر کر شادی کیا کرتے ہیں۔“

”لیکن سکینہ !شادی سے پہلے اگر مجھے موت آجائے تو؟“

”بکو نہیں۔ تم اسّی سال تک جیو گی۔“

سکینہ نے موتی چن کر ڈبے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں صُبح خود انہیں پرو کر تمہارے گلے میں ڈالوں گی۔ قاسم، امّی اور ابّا کے سامنے نہیں بلکہ تمام سہیلیوں کے سامنے۔“

سکینہ اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ صفیہ کچھ دیر بستر پر لیٹ کر چھت کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کتاب اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی لیکن چند ورق الٹنے کے بعد کتاب ایک طرف رکھ دی اور شمع بجھا کر سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہ آئی۔

چند کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر اُٹھ کر دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر نکل آئی۔

برآمدوں سے گزرتی ہوئی محل کے دوسرے سرے دریا کے کنارے جا پہنچی۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ وہ ننگے پاؤں ہے لیکن اس نے پرواہ نہ کی۔

وہ کچھ دیر کونے کے کمرے کے سامنے بلند چبوترے پر کھڑی چاند کی

روشنی میں دریا کا منظر دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر پاؤں رکھتی نیچے اُتری اور آخری سیڑھی پر جو پانی کی سطح سے ایک بالشت اونچی تھی، بیٹھ گئی۔ قاسم اُسے یہ خوش خبری دے چکا تھا کہ طاہر آج رات آزاد ہو جائے گا اور شاید آزاد ہوتے ہی بغداد سے نکل جائے۔ اسے جس قدر اُس کے آزاد ہونے کی خوشی تھی، اسی قدر اس بات کا غم تھا کہ باقی تمام زندگی بغداد کا پُر رونق شہر سے سونا نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کی مسکراہٹیں ہمیشہ کے لیے چھن جائیں گی۔ کاش وہ آزاد ہو کر یہاں رہ سکتا۔ کاش! وہ اس کے ساتھ جا سکتی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک مچھلی اُچھلی اور پھر پانی میں غائب ہو گئی۔ صفیہ نے اپنے دل میں کہا۔ مجھ میں اور اس مچھلی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ آسمان کو ایک بڑا سمندر سمجھ کر ایک ہی جہت میں وہاں پہنچ جانا چاہتی ہے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے پر دیکھ کر اسے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید میں اُڑ سکتی ہوں لیکن یہ پانی کی سطح سے اوپر ایک نگاہ سے زیادہ دیکھ بھی نہیں سکتی۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے پر صرف تیرنے کے لیے ہیں۔ اُڑنے کے لیے نہیں۔ یہ پانی کی گہرائی میں غوطہ لگا کر نچلی سطح کی کیچڑ تک پہنچ سکتی ہے۔ نیلگوں فضا میں پرواز نہیں کر سکتی۔

صفیہ یہ محل تیرے لیے ایک جھیل ہے۔ تو نے اس کے گدلے اور بدبُو دار پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے آسمان کی بلندیوں پر اُڑنے والا ایک آزاد پرندہ دیکھا۔ تو نے پانی سے اُچھل کر اس کا ساتھ دینا چاہا لیکن تیرے پاس اُڑنے کے لیے پَر نہ تھے۔ تیرے ساتھی آسمان سے سرگوشیاں کرنے والے عقاب نہیں۔ اس کے بدبُو دار اور گدلے پانی میں رہنے والے کچھوے ہیں۔ لیکن نہیں، تو جھیل میں پیدا ہونے کے باوجود بھی شاید اس عقاب کا ساتھ دے سکتی لیکن شکاریوں نے اسے پکڑ کر ایک پنجرے میں بند کر دیا اور ایک کچھوے نے آکر تجھ سے یہ کہا کہ اگر تو اس کیچڑ میں میرے ساتھ رہنا پسند کرے تو اس عقاب کو پنجرے سے نکال دوں گا۔ تو نے اس عقاب کو آزاد کروانے کے لیے یہ وعدہ کر لیا۔ تو نے بہت اچھا کیا لیکن کیا تو اس قابلِ نفرت کچھوے کے ساتھ کیچڑ میں رہ سکے گی؟ تجھے صرف موت اس کشمکش سے نجات دلا سکتی ہے۔ خودکُشی ۔۔۔۔ نہیں نہیں یہ بُزدلی ہے۔ یہ خدا کی رحمت سے انکار ہے۔ یہ انسانیت کی توہین ہے۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر بلند آواز میں کہا۔ ”میرے اللہ! مجھے ہمت دے، مجھے صبر

دے۔ ایک بے کس عورت جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ آج تیری رحمت کا سہارا لیتی ہے۔

(۳)

وہ اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے اپنے قریب پانی میں ہلکا سا شور سنائی دیا۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سیڑھی سے چند قدم کے فاصلے پر کوئی پانی میں آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ چند سیڑھیاں اوپر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک آدمی پانی میں ڈوب ڈوب کر اُبھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صفیہ نے محسوس کیا کہ اس کی طاقت جواب دے چکی ہے۔ چند گز نیچے جانے کے بعد وہ سیڑھی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دونوں بازو سیڑھی پر پھیلا کر اپنا سر ٹیک دیا لیکن خوف پر ہمدردی غالب آ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے نیچے اُتری۔

"تم کون ہو؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے جنبش تک نہ کی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ صفیہ ذرا اور جرأت کر کے آگے بڑھی اور اس

سے دو سیڑھیاں اوپر کھڑی ہو کر بولی۔ ”میں پوچھتی ہوں تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے؟“

اس نے سر اوپر اُٹھا کر اور ایک نظر صفیہ کو دیکھنے کے بعد پھر نیچے ڈال دیا۔

ایک ثانیے کے لیے صفیہ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”طاہر!۔۔۔۔۔۔ طاہر! آپ۔۔۔۔۔۔ اس حال میں؟“

اس نے دوبارہ گردن اٹھائی۔ ”کون صفیہ؟“

صفیہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اوپر کھینچنے لگی۔ طاہر سیڑھی پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ صفیہ نے اس کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی پتھر کی سل دیکھ کر کہا۔ ”ظالم دغاباز، کمینہ!“

”کون؟۔۔۔۔۔۔ میں؟“ طاہر نے ذرا گردن اٹھا کر سوال کیا۔

"نہیں۔ نہیں میں قاسم کے متعلق کہہ رہی ہوں۔ اس نے آپ کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا تھا۔"

طاہر نے اُٹھ کر اپنا سر ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا محل ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بہت دور آ گیا میں۔ یہ پتھر مجھے بری طرح دوسری دنیا کی طرف دھکیل رہا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے ان دو آدمیوں سے کشتی پر ہی نپٹ لینا چاہیے تھا!"

صفیہ نے کہا۔ "یہاں خطرہ ہے۔ اُٹھیے میرے ساتھ آیئے! طاہر لڑکھڑاتا ہوا صفیہ کے ساتھ چل دیا۔ دونوں کنارے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک گھنے درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔

صفیہ نے پوچھا۔ "آپ زخمی تو نہیں؟"

"نہیں لیکن تھکاوٹ سے چور ہو چکا ہوں۔ میں نے قید خانے کے قریب

سے اس پتھر کے ساتھ تیرنا شروع کیا تھا۔ آپ یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔ لائیے میں یہ پتھر کھول دوں۔ زندہ آدمی کو پتھر باندھ کر دریا میں پھینکنے والا قاسم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔"

"میں نے قاسم کو نہیں دیکھا اور مجھے دریا میں پھینکنے والوں کو یقین تھا کہ میں مر چکا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ اس نئے قید خانے سے نکلنے کا کون سا راستہ ہے؟"

"اور دیکھیے۔ وہ کشتیاں کھڑی ہیں۔ آپ کشتی چلا سکتے ہیں نا؟ ورنہ محل میں ایک نوکر ہے جسے میں آپ کے ساتھ بھیج سکتی ہوں۔"

"نہیں میں کشتی چلانا جانتا ہوں۔ اس دن میری طرح آپ کا وہ نوکر گرفتار تو نہیں ہو گیا تھا؟"

”نہیں۔ میں نے اسے بھگا دیا تھا۔ آپ کے باقی دوستوں میں سے بھی کوئی گرفتار نہیں ہوا۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ مجھ سے بدظن ہو گئے ہوں گے۔ قاسم نے آپ کو ستانے کے لیے مجھ سے کہا تھا۔ بات یہ تھی کہ قاسم نے وہ رقعہ لونڈی سے چھین کر پڑھ لیا تھا۔“

طاہر نے کہا۔ ”آپ کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں قاسم کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کی تسلّی کے لیے یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو بغداد کی تمام خواتین سے زیادہ قابلِ احترام سمجھتا ہوں۔ آپ کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہ کریں۔ میرے دشمن آج سے یہ سمجھیں گے کہ میں مر چکا ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے پھر بغداد آنا پڑے۔ مجھے قید خانے میں انہوں نے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میری بجائے وہ کھانا ایک اور شخص نے کھا لیا۔ وہ میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند تھا۔ ہم تنگ سرنگ کے راستے ایک دوسرے کے پاس آ جا سکتے تھے۔ رات کے وقت وہ میرے کمرے میں آیا۔ میرا کھانا پڑا ہوا تھا۔ اس نے زہر آلود پنیر کھا لیا اور مر گیا۔ میں اسے سُرنگ میں دھکیل

کر اُوپر سِلیں رکھ آیا ہوں۔ اس کے بعد میں دم سادھ کر لیٹ گیا۔ اور انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر دریا میں پھینک دیا۔ مجھے زہر دینے کی سازش میں شہر کا ناظم، قید خانے کا داروغہ اور مہلب بن داؤد شریک تھے۔ قاسم کے متعلق مجھے علم نہیں۔"

"ایسی ناپاک سازش قاسم کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ شام سے تھوڑی دیر بعد اس نے باہر جاتے ہوئے مجھے بتایا کہ مہلب اور ناظمِ شہر اس کے ساتھ آپ کو آزاد کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ وہ ابھی تک شاید واپس نہیں آیا۔"

طاہر نے کہا۔ "قاسم کا اس سازش میں شریک ہونا میں بعید از قیاس نہیں سمجھتا۔ اب آپ کے ذمّے ایک کام ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنے چچا کو ان حالات سے باخبر کر دیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں انہیں آپ کے متعلق بتا دوں؟"

"نہیں، میرے متعلق کچھ نہ بتائیے۔ انہیں صرف یہ بتا دیجیے کہ مہلب

کے دیے ہوئے زہر سے وحید الدّین سابق وزیر خارجہ ہلاک ہو چکا ہے اور وہ چھپا ہوا نہیں تھا بلکہ مہلب نے اسے قید کر رکھا تھا۔ چنگیز خان کو پیغام بھجوانے کی سازش مہلب نے کی تھی اور اب سازش کے انکشاف کے خوف سے اس نے وہ بے گناہوں کی جان لی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وحید الدّین کی لاش اس سرنگ میں پڑی ہوئی ہے۔ اپنے چچا کو مجبور کریں کہ وہ صبح ہوتے ہی قید خانے کی ان کوٹھڑیوں کا معائنہ کریں ورنہ کل رات اسے بھی میری طرح دریا میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہارے چچا ان باتوں پر اعتبار کرنے سے پہلے تم سے یہ پوچھیں گے کہ تمہیں ان واقعات کا علم کیسے ہوا؟ تم اس کا یہ جواب دے سکتی ہو کہ قید خانے کے ایک سپاہی نے یہ واقعات میرے کسی دوست کو بتائے ہیں اور اس نے تمہارے نوکر سعید کو آدھی رات کے وقت تمہارے پاس بھیجا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان واقعات کی چھان بین کرنے کی بجائے فوراً قید خانے کی طرف متوجہ ہوں گے۔"

صفیہ نے کہا۔ "میں اس کا بندوبست کر لوں گی۔ میں علی الصبح گھوڑے پر

سوار ہو کر میدان میں جاؤں گی اور وہاں سے فوراً واپس آ کر چچا کو یہ سب کچھ بتا دوں گی۔ اگر وہ پوچھیں گے تو میں کہوں گی کہ میدان میں مجھے ایک اجنبی نے یہ تمام واقعات بتائے ہیں اور مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ کو باخبر کر دوں۔"

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ خلیفہ کی حمایت کے باوجود مہلب کے لیے بغداد میں رہنا ممکن ہو جائے گا۔ آپ اپنے چچا کو مشورہ دیں کہ وہ داروغہ یا ناظم کو دھمکی دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اصلی مجرم کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن اس سے پیشتر وہ وحید الدّین کی لاش ضرور برآمد کر لیں۔ میں اب جاتا ہوں۔ شاید کل رات میں ترکستان روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ نے وہاں کی کوئی خبر سُنی ہے۔"

"ہاں۔ بہت بری خبریں۔ تاتاری بخارا اور سمرقند کے علاوہ شمال کے کئی اور شہر فتح کر چکے ہیں اور اب ان کی افواج جنوب اور مشرق کے شہروں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔"

بلخ کے متعلق کوئی خبر سُنی؟"

"بلخ پر حملہ ہونے والا ہے۔"

"بہت اچھا۔ میں جاتا ہوں۔"

صفیہ نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ میں ایک بار ٹھکرائی ہوئی درخواست دوبارہ دوہرانا چاہتی لیکن جیتے جی انسان کے ہاتھ اُمّید کے دامن سے جدا نہیں ہوتے۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے یہاں سے لے چلیے۔ اگر اپنے ساتھ نہیں تو مجھے مدینے بھیج دیجیے۔ میں وہاں آپ کا انتظار کروں گی!"

"نہیں۔ نہیں۔ یہ موضوع نہ چھیڑو۔"

"لیکن کیوں؟ آپ مجھے اس قدر قابلِ نفرت کیوں سمجھتے ہیں؟"

"میں آپ کو قابلِ نفرت نہیں سمجھتا بلکہ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اپنی نظروں میں قابلِ نفرت نہ بن جاؤں۔"

صفیہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن دو پہرے دار باتیں کرتے ہوئے بر آمدے سے نکلے اور چبوترے پر کھڑے ہو گئے۔

ایک کہہ رہا تھا۔ "قاسم رات ہوتے ہی کشتی پر دوسرے کنارے گیا تھا ابھی تک نہیں لوٹا۔"

دوسرے نے کہا۔ "بھئی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ کسی جوہری کی دکان لوٹنے گیا ہو گا۔"

"کس کی شادی؟" "ارے قاسم کی۔"

"کس کے ساتھ؟"

"یہ ہمارے اصطبل کے سائیں بھی جانتے ہیں۔ صفیہ کے ساتھ۔"

"بالکل بکواس۔ صفیہ کے متعلق تو اس محل کے چمگادڑ بھی یہ جانتے ہیں کہ اسے قاسم کے ساتھ روزِ پیدائش سے نفرت چلی آتی ہے۔"

"لگاؤ شرط!"

”تم پہلے میرے ساتھ کئی شرطیں ہار چکے ہو۔ پہلے پچھلی شرط کے چار دینار مجھے دے دو۔ پھر نئی شرط لگاؤں گا۔“

”وہ میں تمہیں صبح ہوتے ہی دے دوں گا لیکن مزا جب ہے کہ تم میرے ساتھ بیس دینار کی شرط لگاؤ۔“

”منظور ہے لیکن ایسے نہیں، چلو صادق کے سامنے دونوں قسم کھاتے ہیں۔“

”چلو!“

سپاہی چل دیے اور طاہر نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے؟“

”ہاں! قاسم نے آپ کو اس شرط پر قید سے آزاد کرنے کا ذمہ لیا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کروں اور مجھے آپ کے لیے یہ وعدہ کرنا پڑا۔ اب اس انکشاف کے بعد اس وعدے سے آزاد ہوں گی لیکن اگر اس کے باوجود آپ سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے آپ اپنی نظروں میں قابلِ نفرت بن جائیں گے تو مجھے حکم دیجیے۔ اس دنیا میں ذلّت کا کوئی

گڑھا ایسا نہیں جس میں میں آپ کا نام سن کر آنکھیں بند کر کے کودنے کے لیے تیار نہ ہو جاؤں۔ اس محل میں رہتے ہوئے میرے لیے دو ہی راستے ہیں۔ قاسم کے ساتھ شادی کر لوں یا اس دریا میں ڈوب جاؤں۔ اگر میری یہ قربانی عالمِ اسلام کی بے کس بہنوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ لیکن خدا میرا گواہ ہے کہ میں صرف آپ کو چاہتی ہوں۔ اور جب تک زندہ رہوں گی آپ کو چاہتی رہوں گی۔ اگر یہ ایک جرم ہے تو میں مجرم ہوں۔ اگر اس جرم کی سزا موت ہے تو خدا کے لیے اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیجیے۔ مجھے اس پتھر کے ساتھ باندھ کر دریا میں دھکیل دیجیے۔ میں آپ کو اپنا قاضی بناتی ہوں۔ آپ سے اپنے متعلق فتویٰ پوچھتی ہوں۔ اگر مفلس نے اس کیچڑ میں پلنے والے کیڑوں کی بجائے اپنی محبت کے لیے ایک انسان تلاش کرنے میں کوئی جرم کیا ہے تو بتایئے میری سزا کیا ہے؟ آپ کہتے تھے کہ ترکستان کے میدان خطرناک ہیں لیکن کاش آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ عورت جسے چاہتی ہے اس کے ساتھ تیروں کی بارش میں بھی خوش رہ سکتی ہے۔ لیکن اس کے بغیر اسے سونے کے محل بھی قید خانہ معلوم ہوتے ہیں۔"

وہ رو رہی تھی۔

طاہر یہ محسوس کر رہا تھا کہ دنیا کے تمام عناصر کی قوّتِ تسخیر سمٹ کر اس لڑکی کے وجود میں آ گئی ہے۔ اس نے پہلی بار اس حسین چہرے کی طرف غور سے دیکھا جس میں ہزاروں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ طاہر ضبط نہ کر سکا۔

"صفیہ ! صفیہ !! کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا، مجرم تم نہیں، میں ہوں۔ قراقرم جانے سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھے اس حد تک قابلِ توجہ سمجھتی ہو لیکن اس سفر۔۔۔۔!" طاہر یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔

صفیہ جیسے گہرے پانی میں غوطہ لگا کر سانس لے رہی ہو۔ طاہر کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ پھر امید کا چھوٹا ہوا دامن پکڑ رہی تھی۔ "بتایئے اس سفر میں کیا ہوا؟" بتایئے۔"

"میں ایک لڑکی سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں۔"

طاہر کا خیال تھا کہ وہ یہ الفاظ سُننے کے بعد اس پر حقارت سے ایک نگاہ

ڈالنے کے بعد بھاگ جائے گی لیکن اس جنبش تک نہ ہوئی۔ نفرت اور حقارت کی بجائے اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ تلخ ہونے کی بجائے اس نے میٹھی اور دلکش آواز میں کہا۔ ”تو تم مجھ سے نفرت نہیں کرتے؟“

”میں تم سے کیسے نفرت کر سکتا ہوں۔“

”کیا وہ خوبصورت ہے؟“

”ہاں۔“

”یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گی؟“

”نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔“

”اگر آپ اس کے ساتھ شادی کا وعدہ نہ کر چکے ہوتے تو کیا پھر بھی میری التجائیں ٹھکرا دیتے اور مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتے؟“

”ہاں۔ موجودہ حالات میں فرض مجھے انکار پر مجبور کرتا۔ میں میدان میں

تمہاری حفاظت کرنے کے بجائے اس شہر اور ملک کی چار دیواری پر پہرہ دینا زیادہ آسان سمجھتا ہوں۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”ثریا۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”بلخ میں۔“ ”اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی طرح بغداد میں بھی اس کی ایک بہن آپ کو چاہتی ہے تو کیا وہ اسے اپنی حق تلفی سمجھے گی؟“

”نہیں وہ حسد سے بہت بلند ہے۔“

”ایک عورت دوسری عورت کی مجبوریاں سمجھ سکتی ہے۔ آپ اس کے ساتھ شادی کر لیں۔ میں اس امید پر زندہ رہوں گی کہ میں کسی دن اس سے رحم کی بھیک مانگ کر آپ کے پاس جاؤں گی اور ہم دونوں اپنے لیے آپ کا دامن کشادہ پائیں گی۔ میں اس کی لونڈی بن کر بھی گزارہ کر لوں

گی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ بہت بڑا سہارا ہے۔ اس مضبوط چٹان پر کھڑی ہو کر ساری دنیا کے ساتھ لڑ سکتی ہوں۔ میں اب چچا، چچی اور قاسم کو جواب دے سکتی ہوں۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "صفیہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ترکستان سے فارغ ہوتے ہی یہاں آؤں گا۔ اس وقت تک میرے متعلق شاید تمہارے چچا کی رائے بھی بدل جائے اور میں اس بہت بڑے انعام کے لیے دامن پھیلا سکوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری محبت کے آسمان پر ہر وقت دو ستارے جگمگاتے رہیں گے۔ میری نگاہوں میں تمہارا اور ثریا کا درجہ ایک ہو گا۔"

"میں آپ کے دامن کی گرد بن کر بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ بلخ میں رہنے والی بہن کو میرا سلام دیجیے اور اس کے پاس میری ایک نشانی لیتے جائیے۔" صفیہ نے اپنی انگوٹھی اتار کر طاہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "میں آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔ اگر آپ نے دیر لگائی تو شاید

قدرت مجھے آپ کے پاس لے آئے۔ دنیا کی کوئی خلیج ایسی نہیں جسے محبت کی کشتی میں بیٹھ کر عبور نہ کیا جاسکے۔" پانی میں کشتی کے چپوؤں کی آہٹ پا کر دونوں دریا کی طرف متوجہ ہوئے۔

صفیہ نے کہا۔ "شاید قاسم آرہا ہے۔"

دونوں سمٹ کر درخت کے تنے کے ساتھ لگ گئے۔ کشتی کنارے پر آ لگی۔ قاسم اور اس کے ساتھ دو آدمی کشتی سے اُتر کر محل کے اندر چلے گئے۔

صفیہ نے کہا۔ "وہ شاید مجھے خبر دینے جارہے ہیں کہ آپ آزاد ہو چکے ہیں۔ آپ جائیے۔ جب تک آپ کی کشتی نظر آتی رہے گی، میں یہاں کھڑی دیکھتی رہوں گی۔ لیکن ذرا ٹھہریے۔ پہرے دار آرہے ہیں۔"

پہرے دار آئے اور تھوڑی دیر چبوترے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ ان کی گفتگو کا موضوع ابھی تک صفیہ اور قاسم کی شادی تھا۔

”آخر قاسم میں کیا نقص ہے جو صفیہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ وہ اندھا ہے۔ لنگڑا ہے۔ کانا ہے۔ تمہاری طرح بے وقوف ہے؟“

”ارے کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ صفیہ اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ اس کے قابل کسی سلطنت کا ولی عہد ہی ہو سکتا ہے۔“

صفیہ نے کہا۔ ”اب آپ چلیے!“

طاہر نے اُتر کر ایک چھوٹی سی کشتی کا رسّا کھولا اور اس پر بیٹھ کر چپو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ صفیہ!“

”خدا حافظ!“ صفیہ نے کشتی کو پانی میں دھکیل دیا۔

جب تک کشتی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوئی۔ وہ ”خدا حافظ! خدا حافظ! کہتی گئی۔“

(۴)

صبح کے وقت وزیر اعظم نے صفیہ کی تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''اگر یہ بات صحیح ثابت ہوئی تو میں تمہیں ایک بات کا یقین دلاتا ہوں اور وہ یہ کہ میری بھتیجی کی شادی میرے نالائق بیٹے کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا تھا کہ طاہر ایک مخلص نوجوان ہے۔ میں اس کی گرفتاری کے خلاف تھا۔ اسی لیے میں اسے اور اس کے دوستوں کو بھاگ جانے کا موقع دیتا رہا۔ مجھے یہ پیغام بھیج کر اس کے ساتھیوں نے اپنے خلوص کا دوسرا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ بے خبری میں شاید وحید الدّین کے بعد میری باری آتی۔ مجھے اس بدمعاش نے کہا تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے آج اُسے قید سے فرار ہونے کا موقع دے گا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔''

صفیہ اپنے کمرے میں پہنچی تو قاسم وہاں سکینہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس نے صفیہ کو دیکھتے ہی کہا۔ ''صفیہ میں ایک بہت بڑی خبر لے کر آیا ہوں۔ مہلب نے ابھی مجھے اطلاع دی ہے کہ طاہر قید خانے سے بھاگ گیا ہے۔ میں نے اس سے تفصیلات نہیں پوچھیں۔ میں خبر سُنتے ہی تمہارے

پاس آیا تھا۔ میں ابھی اس کے پاس جارہا ہوں۔ وہ نیچے دریا کے سامنے برآمدے میں بیٹھا ہے۔ وہ واپس آکر تمہیں سارے واقعات بتاؤں گا۔"

سکینہ نے کہا۔ "شاہی قید خانے سے طاہر کے بھاگ نکلنے کی تفصیل بہت دلچسپ ہو گی۔ چلو صفیہ ہم کمرے کے پردے کے پیچھے بیٹھ کر سُنیں۔ کیوں قاسم! ہمیں تمہاری باتیں سُننے کی اجازت ہے؟"

"لیکن اس شرط پر کہ تم جو کچھ سنو وہ کسی سے نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ اسے بھاگنے کا موقع دینے میں میرے چند دوستوں کی کوششوں کا دخل ہے۔"

"واہ ہم کوئی احمق ہیں!" قاسم کمرے سے باہر نکل گیا۔

سکینہ نے صفیہ سے کہا۔ "چلو صفیہ! مجھے اس کے بھاگ نکلنے سے بہت دلچسپی ہے۔"

صفیہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی جان چکی تھی لیکن کچھ سوچ کر وہ سکینہ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔

دریا کے کنارے کمرے میں پہنچ کر وہ دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ مہلب یہ کہہ رہا تھا۔ ”اب مجھے ڈر ہے کہ اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو ہماری شامت آجائے گی۔“

قاسم نے کہا۔ ”نہیں! وہ آپ جیسے محسن کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔“

مہلب نے کہا۔ ”اس کے محسن تو تم ہو۔ میں نے سب کچھ تمہارے لیے کیا ہے اور میں نے اسے بتا بھی دیا تھا کہ تمہیں صرف قاسم کی سفارش پر بھاگنے کا موقع دیا گیا ہے۔“

”لیکن وہ بھلا کیسے ؟“

”کیا تم نے مجھے جو پانچ سو دینار دیے تھے وہ قید خانے کے پانچ پہرے داروں کو خریدنے کے لیے کافی نہ تھے ؟“

قاسم نے پوچھا۔ ”آپ نے اسے کہاں پہنچایا؟“

مہلب نے جواب دیا۔ ”قید خانے سے باہر اُسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ یقیناً

اپنے دوستوں کے پاس گیا ہو گا۔ مجھے اُمّید ہے کہ وہ بہت جلد بغداد چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے دو دوستوں کے سوا کسی سے نہیں ملے گا اور رات کے وقت ہی بغداد چھوڑ کر چلا جائے گا!" "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم اس کے متعلق کچھ نہیں سنیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ حکومت کے بعض عہدے داران اس سے بد ظن ہو گئے ورنہ وہ ایک کار آمد نوجوان تھا۔ بہر حال میرے متعلق وہ بُری رائے لے کر نہیں گیا۔"

صفیہ کی قوّت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے چہرے پر نقاب ڈال کر دروازے کا پردہ اٹھایا اور برآمدے میں داخل ہو کر بولی۔ "تم دونوں کس کو بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ یہ خبر اب تو آدھے شہر میں مشہور ہو چکی ہے کہ ماہی گیروں نے آدھی رات کے بعد دریا سے ایک لاش نکالی ہے اور وہ طاہر کی ہے۔"

قاسم اور مہلب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفیہ کی طرف دیکھنے لگے۔ صفیہ نے کہا۔ "اور چچا جان

تیسرے پہر یہ سُنتے ہی خود قید خانے میں تحقیقات کے لیے چلے گئے تھے۔ وہاں ایک اور لاش ملی ہے اور اس کے منہ میں زہر آلود پنیر تھا۔ وحید الدّین سابق وزیر خارجہ کی لاش۔ اور جانتے ہو کہ چچا کو داروغہ نے کیا بتایا ہے؟ رات کے وقت بغداد کے ایک بہت بڑے غدّار کے حکم سے دو آدمیوں کو زہر دیا گیا تھا۔ ایک وہ جس کے متعلق تم ابھی باتیں کر رہے تھے۔ جس کی لاش بغداد کے کسی چوراہے پر انتقام کے لیے پکار رہی ہے۔ دوسرا وہ جس کے قید ہونے کا علم تمہارے دوست اور اس کے چند ساتھیوں کے سوا کسی کو نہ تھا۔"

مہلب اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ صفیہ نے چلّا کر کہا۔ "زمین تمہارے جیسے بد کردار کو کوئی جگہ نہیں دے گی۔ شہر میں تمہاری تلاش جاری ہے۔ اس کے ہر دروازے پر سپاہی کھڑے ہیں۔ بغداد کا بچہ بچّہ تمہاری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار ہے۔"

قاسم نے صفیہ کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "صفیہ! کیا کہہ رہی ہو۔ ہوش کی بات کرو۔" "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم

کمینے اور مکّار ہو۔"

قاسم نے اس کے منہ پر ایک چپت رسید کی اور اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ وہ چِلاّئی۔ "بزدل آدمی عورتوں کے ساتھ زور آزمائی کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔"

سکینہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ "صفیہ تمہیں کیا ہو گیا۔ قاسم چھوڑ دو اسے۔ آج اس کا دماغ ٹھیک نہیں۔"

صفیہ نے لال پیلی ہو کر کہا۔ "آخر اس کی بہن نکلیں نا۔ لگاؤ تم بھی ایک چپت میرے منہ پر!"

سکینہ نے کہا۔ "صفیہ! خُدا کے لیے زبان بند کرو۔ وہ معزز آدمی کیا خیال کرے گا۔"

صفیہ نے کہا۔ "چور ڈاکو! قاتل!! خدا کے لیے سپاہیوں کو بلاؤ۔ چچا جان اس کی تلاش میں ہیں۔ وہ بھاگ نہ جائے!"

قاسم اسے کمرے سے نکال کر کانپتا ہوا محل کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ خواجہ سرا، لونڈیوں اور نوکروں کو جمع ہوتے دیکھ کر صفیہ خاموش ہو گئی اور پھر نرم ہو کر بولی۔ "مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ میں تمہیں جھوٹ کی سزا دینا چاہتی تھی لیکن اپنے دوست کو چچا جان کے آنے تک ضرور روکو!"

قاسم پریشانی کی حالت میں مہلب سے معذرت کے لیے موزوں الفاظ سوچتا ہوا لوٹا لیکن مہلب وہاں موجود نہ تھا۔ ایک کشتی دریا کے دوسرے کنارے کی طرف تیزی سے جا رہی تھی اور وہ اس پر سوار تھا۔

دوپہر کے وقت وزیر اعظم کے حکم سے شہر میں یہ منادی ہو رہی تھی کہ مہلب کا پتہ دینے والے کو پانچ ہزار اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی۔ عصر کے وقت جب قاسم اپنے باپ سے طویل ملاقات کر کے باہر نکلا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور سکینہ صفیہ سے کہہ رہی تھی۔ "تم نے سنا۔ ابّا جان نے قاسم سے کہا کہ جب تک میں بغداد کا وزیر اعظم ہوں، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ وہ کل مصر روانہ ہو جائے گا۔ ابا جان نے مصر کے

سلطان کو لکھا ہے کہ اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ دے دیا جائے لیکن ان کا غصّہ اُتر جائے گا تو وہ اسے بلا لیں گے۔"

اگلے دن شہر میں یہ خبر مشہور تھی کہ رات کے وقت ایک ہزار سوار تاتاریوں کے خلاف خوارزم شاہ کا ساتھ دینے بغداد چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

شیر خوارزم

جلال الدّین نے افغانستان کی شمالی سرحد سے مرو کے گورنر کو اطلاع کی کہ وہ کم از کم چار ہفتے مرد کی حفاظت کرے اور اس عرصے میں وہ بلخ، ہرات اور دوسرے شہروں سے نئی فوج منظّم کر کے اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا۔

مرو کی حفاظت کے لیے باقاعدہ فوج اگرچہ کم تھی لیکن پناہ گزینوں کی لاکھوں تلواریں موجود تھیں۔ وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ یہاں بخارا، سمرقند اور دوسرے شہروں کی غلطیوں کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ عورتیں تیر اندازی کی مشق کر رہی تھیں، بچّے مکانوں کی چھتوں پر پتھر جمع کر رہے تھے۔ غرض مرو کا ہر گھر ایک قلعہ تھا اور عوام کو امید تھی کہ وہ نہ

صرف ایک طویل مدّت تک شہر کی حفاظت کر سکیں گے بلکہ تاتاریوں سے گزشتہ تمام مظالم کا بدلہ لے سکیں گے۔

مساجد میں ہر نماز کے بعد لوگ خطبۂ جہاد سنتے اور مرو کی حفاظت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادینے کا فیصلہ کرتے۔

ایک صبح جب مرو کی مساجد میں مؤذن اہلِ شہر کو نماز کے لیے بلا رہا تھے۔ تاتاریوں کی ٹڈی دل افواج شہر کی فصیل کے سامنے نمودار ہوئیں۔ آن کی آن میں شہرِ پناہ پر تیر انداز کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے اور وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ تاتاری افواج کی قیادت چنگیز خان کے چھوٹے بیٹے تولائی کے سپُرد تھی۔ چنگیز خان کی نگاہ میں تولائی اپنی بہادری سے زیادہ مکّاری اور دغابازی کی بدولت بہت عزّت حاصل کر چکا تھا لیکن مرو کی فصیل پر انسانوں کے بے پناہ ہجوم اُسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

تولائی تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ شہر کے چند غدّاروں نے جو اس کی

آمد کی خبر پاتے ہی اس کے ساتھ آ ملے تھے۔ جب اسے یہ خبر ملی کہ فصیل پر مردوں کی بجائے عورتیں زیادہ ہیں، تولائی نے یہ سنتے ہی فوج کو طوفانی حملے کا حکم دیا لیکن شہر پناہ سے تیروں اور پتھروں کی بارش نے تاتاریوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ فصیل کے نیچے ہزاروں تاتاری ڈھیر ہو گئے۔ تولائی نے یہ صورت دیکھی تو فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور شہر سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ پانچ دن تک تولائی کو شہر پر قبضہ کرنے کی صورت نظر نہ آئی۔ طاقت کے استعمال سے مایوس ہو کر اس نے حسبِ عادت عیّاری کی خواہش ظاہر کی اور یہ بھی کہلا بھیج کہ ہم بعض باتوں کے متعلق گورنر سے تشفی حاصل کرنے کے بعد لوٹ جائیں گے۔

چند دور اندیش لوگ گورنر کو تولائی کے پاس بھیجنے کے خلاف تھے لیکن گورنر نے انہیں سمجھایا کہ "میں اس کے دھوکے میں نہیں آ سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کرا دے گا لیکن میرے واپس نہ آنے پر ان لوگوں کی بھی تسلّی ہو جائے گی جو اب تک مقابلہ کرنے کی بجائے تاتاریوں سے مصالحت کی توقع رکھتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ جب

تک جلال الدّین کی افواج نہ آ جائیں، ہم اس کے ساتھ صلح کی بات چیت جاری رکھیں۔"

تولائی نے گورنر کا نہایت پر تپاک خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے دل میں بہادروں کے لیے عزّت ہے۔"

اس کی بات چیت شروع ہوئی تو تولائی نے کہا۔ "ہم صرف یہ وعدہ لے کر کہ آپ کی افواج ہمارا پیچھا نہیں کریں گی۔ واپس جانے کے لیے تیار ہیں اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی وعدہ کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جلال الدّین کے ساتھ ہمارے تعلقات خواہ کچھ ہوں، ہم دوبارہ مرو پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس کے عوض آپ کو معمولی تاوان ادا کرنا پڑے گا۔"

گورنر ہر قیمت پر مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا: "ہمارا خزانہ اگرچہ خالی ہے۔ تاہم میں اہلِ شہر سے ایک خاصی رقم جمع کر کے آپ کو دے سکوں گا۔"

"لیکن آپ کا یہ فیصلہ تمام اہلِ شہر کے لیے قابلِ قبول ہو گا؟"

"میں شہر کا گورنر ہوں۔"

یہ صحیح ہے لیکن آپ تاوان ادا کرنے کی ذمہ داری تنہا اپنے سر کیوں لیتے ہیں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ شہر کے بااثر لوگوں کو یہاں بلالیں۔ اگر ان کی موجودگی میں معاہدہ لکھا جائے تو ان میں سے کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔ آپ ان کے نام ایک حکم لکھ بھیجیں۔ میرے خیال میں ہم بہت جلد کسی فیصلے پہنچ جائیں گے۔"

مرو کے گورنر نے شہر کے دس معززین کے نام ایک مراسلہ لکھ کر بھیج دیا۔

گورنر کا مراسلہ پڑھ کر وہ بہت سے لوگوں کے مشورے کے خلاف تولائی کے پاس چلے گئے۔ تولائی ان کے ساتھ بھی خندہ پیشانی سے پیش آیا لیکن تاوان کی رقم کے متعلق ان سب نے کہا۔ "اہل شہر سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

تولائی نے کہا۔ "مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شہر کا خزانہ خالی ہے۔ مجھے آپ

کی مجبوری کا احساس ہے۔ آپ جائیں، کل پھر ملاقات ہو گی۔ بہتر ہو گا کہ کل آپ اپنے ساتھ کے ہر گروہ کا نمائندہ لیتے آئیں۔“

تاتاریوں نے گورنر اور اس کے ساتھیوں کو عزّت و احترام کے ساتھ شہر پناہ کے پاس پہنچا دیا۔ رات کے وقت شہر میں اس خبر پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ کل صلح ہو جائے گی اور تاتاری چلے جائیں گے۔ لیکن پناہ گزین جو تاتاریوں کے ہر حربے سے واقف تھے، اہلِ شہر کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ شہر کے معززین کو بھی تاتاریوں کے متعلق خوش فہمی نہ تھی لیکن گورنر اس بات پر مصر تھا کہ ہمیں صلح کی بات چیت جاری رکھ کر وقت لینا چاہیے۔ اگلے دن قریباً چالیس آدمی گورنر کے ساتھ تولائی کے پاس چلے گئے۔

دوپہر کے وقت تاتاری ان میں سے ہر شخص کو سخت جسمانی اذیتیں دینے کے بعد ان سے شہر کے دوسرے مقتدر لوگوں کے نام خط لکھوا رہے تھے۔ یہ خط شہر کے غدّاروں کی مدد سے ان کے پاس پہنچائے گئے اور عصر کے قریب ستّر اور آدمی تولائی کیمپ میں آ گئے۔

شام کے وقت تاتاریوں نے گورنر، سپہ سالار اور ان کے تین ساتھیوں کے سوا سب کو قتل کر دیا۔

رات کے وقت قریباً ایک سو تاتاریوں نے گورنر کے ساتھیوں کا لباس پہن لیا اور گورنر اور سپہ سالار اور ان کے تین ساتھیوں کو خنجر دکھا کر آگے آگے شہر کے دروازے کی طرف چلنے پر مجبور کر دیا۔ آگے آگے شہر کے چند غدّار بھی تھے جو گورنر سے پندرہ بیس قدم آگے عربی اور فارسی زبان میں بلند آواز سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر انھوں نے فصیل پر پہرے داروں کو صلح کی مبارک باد دیتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

دروازے کے پہرے داروں میں سے ایک نے روزن سے سر نکال کر باہر جھانکا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر بے شمار لوگ جمع تھے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک آدمی نے باہر نکلتے ہوئے سوال کیا۔ ”بہت دیر لگائی آپ نے کیا خبر لائے؟ گورنر کہاں ہے؟“

اور پھر آگے بڑھ کر تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو؟ گورنر کہاں ہے؟“

”وہ آرہے ہیں۔“ غدّاروں میں سے ایک نے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں پانچ چھ اور آدمی باہر نکل آئے۔

گورنر بھاگ کر آگے بڑھا اور چلّایا۔ ”دروازہ بند کر لو تاتاری آ گئے۔ جلدی!“

ایک تاتاری نے تلوار ماری اور اسے زمین پر لٹا دیا۔ تین چار اور آوازیں یہ کہتے ہوئے سنائی دیں۔ ”دروازہ بند کرو تاتاری حملہ کرنے والے ہیں۔“

لیکن تاتاریوں نے انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک لمحے کے لیے پہریدار ششدر ہو کر رہ گئے اور جب تک وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئے مسلمانوں کے بھیس میں تاتاریوں کا گروہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور پہرے داروں نے یہ سمجھ کر تاتاری عقب سے

ارکانِ وفد پر تیر برسا رہے ہیں انہیں اندر گھسنے کا موقع دے دیا۔ مشعلوں کی روشنی میں غیر مانوس صورتیں دیکھ کر وہ چلّائے لیکن تاتاریوں نے آن کی آن میں پچاس ساٹھ آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے۔

چند تاتاری جو اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ فصیل کے پتھروں اور تیروں کا شکار ہوئے لیکن باقی پہرے داروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ تیغ آزمائی کرتے رہے۔

اچانک باہر بے شمار گھوڑوں کی ٹاپوں کی آہٹ سنائی دی۔ پہرے داروں نے دروازے کے اندر لڑنے والوں کا صفایا کر کے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں تاتاری سواروں کا ایک دستہ مار دھاڑ کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اب شہر مرو کے بازاروں میں پتھروں اور تیروں کی بارش کے باوجود دشمن کے ان گنت سواروں کو گشت لگاتا دیکھ رہے تھے۔ آدھی رات تک شہر میں کہرام مچا رہا۔ تیسرے پہر تاتاریوں نے شہر کے

چند اور دروازوں پر قبضہ کر لیا اور بہت سے محلوں میں آگ لگا دی گئی۔ صبح تک یہ آگ ایک وسیع رقبے میں پھیل چکی تھی۔ وہ لوگ جو آگ سے بچنے کے لیے مکانات سے باہر نکلتے، تاتاریوں کی تلواروں کا شکار ہوتے۔ پانچ دن تک شہر میں قیامت برپا رہی۔

چھٹے دن تاتاری مرو کے دروازوں پر اپنی فتح کی یادگاریں یعنی انسانی کھوپڑیوں کے مینا تعمیر کر رہے تھے۔ یہ مینار گزشتہ تمام میناروں سے بلند تھے لیکن تاتاریوں کی لاشیں گننے کے بعد تولائی نے یہ کہا۔ ”ہم نے کسی بڑی سے بڑی جنگ میں بھی اس قدر نقصان نہیں اٹھایا۔ اور اس نقصان کی تلافی اس نے یوں کی کہ مرو میں ایک بہت بڑی چتا تیار کرائی۔ دو دو قیدیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رسیوں سے جکڑ دیا جاتا۔ پھر یکے بعد دیگرے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے۔ وہ تڑپتے اور تاتاری ناچتے اور قہقہے لگاتے ہوئے انہیں آگ میں دھکیل دیتے۔ کھوپڑیوں کی تعداد میں کسی اضافہ کرنے کے لیے حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے گئے۔ ایک حاملہ عورت نے چتا کے سامنے گر کر بچّہ جن دیا اور تولائی نے کہا۔ ”دیکھو۔

دشمن کی عورتیں ہمارے مقابلے کے لیے ایک فوج تیار کر رہی ہیں۔"

ایک تاتاری نے آگے بڑھ کر بچّے کے سر پر پاؤں رکھ کر مسلنے کی کوشش کی لیکن مامتا موت کے سامنے بھی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے لڑکے کو پکڑ کر کلیجے سے لگالیا۔ اسے بچے سمیت آگ میں دھکیل دیا گیا۔ وہ آخری دم تک اپنے جگر کے ٹکڑے کو بازوؤں میں چھپا چھپا کر آگ کے شعلوں سے بچانے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکا۔ وہ دو تاتاری افسروں پر ٹوٹ پڑے اور ان میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ مقتول تولائی کے اپنے قبیلے کا آدمی تھا۔ کمسن لڑکے کو تولائی کے سامنے پیش کیا گیا۔ چنگیز خان کی طرح تولائی کو بھی اپنے خون کی کمزوریاں اور خوبیاں پرکھنے کی عادت تھی۔ اس نے لڑکے کو قریب بُلا کر کہا۔ "تم جانتے ہو ایک تاتاری افسر کے قتل کی سزا کیا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں۔ تمہاری عدالت میں مجرم اور بے

گناہ ایک ہی چکّی میں پیسے جاتے ہیں۔"

"ہم اگر تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں تو تم بڑے ہو کر ایک سپاہی بننے کے لیے تیار ہو جاؤ گے؟"

"تم ذلیل ہو۔ میں اس جگہ مرنا قبول کروں گا۔"

"موت ایک تکلیف دہ چیز ہے۔"

"لیکن مظلوم کے لیے نہیں۔ ظالم کے لیے!"

تولائی خان نے کہا۔ "اسے میرے سامنے پھانسی پر لٹکاؤ۔ تم جانتے ہو پھانسی کتنی تکلیف دہ چیز ہے؟"

بہادر لڑکے نے جواب دیا۔ "تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو۔ میری قوم کو پھانسی نہیں دے سکتے۔ تمہارے نیزے ٹوٹ جائیں گے۔ تمہاری تلواریں کند ہو جائیں گی۔ تمہارے بازو شل ہو جائیں گے لیکن میری قوم کی رگوں میں خونِ شہادت دوڑتا رہے گا۔"

تولائی کے اشارے سے لڑکے کو بدترین جسمانی اذیتیں دے کر ذبح کیا گیا۔ اس شام تولائی خان اپنے چند مُشیروں سے کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں ایک خطرناک دشمن سے پالا پڑا ہے۔ جس قوم کی مائیں اس قسم کے بچّے جن سکتی ہیں وہ دیر تک کسی کی غلام نہیں رہتی۔ میں اس قسم کے بچّوں کو جلال الدّین سے کم خطرناک نہیں سمجھتا!“

مرو کے ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ مکانوں کے زمین دوز کمروں میں چھپے ہوئے لوگوں کو نکال کر قتل کیا گیا۔ تولائی کو شہر کے غدّاروں نے دولت مند لوگوں کی فہرست تیّار کر دی۔ انہوں نے زندگی سے مایوس ہو کر تمام خفیہ خزانے تاتاریوں کے سپُرد کر دیے لیکن تاتاریوں کی تسلّی نہ ہوئی۔ زیادہ مال برآمد کرنے کی کوشش میں تاتاریوں نے ان سب کو طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دینے کے بعد ہلاک کر دیا اور اس کے بعد ان کے مکانوں کی دیواریں کھدوا کر دیکھی گئیں۔

مساجد، درس گاہوں اور کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی۔ صرف چار سو آدمیوں کو جو فنونِ تعمیر اور اسلحہ سازی کے ماہر تھے، تاتاری زندہ پکڑ کر

اپنے ساتھ لے گئے۔

کوچ سے پہلے کسی نے تولائی کو بتایا کہ ابھی تک شہر میں کہیں کہیں زمین دوز مقامات پر مرد اور عورتیں چھپے ہوئے ہیں۔ تولائی نے دو ہزار سپاہیوں کو مرو میں ٹھہرا کر اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کا حکم دیا اور ان سپاہیوں کے افسروں سے کہا۔ "میں خانِ اعظم کو پیغام دے چکا ہوں کی مرو سے ان چند آدمیوں کے سوا جنہیں ہم کار آمد سمجھ کر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں، دشمن کا ایک فرد بھی جان بچا کر بھاگ نہ سکا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے الفاظ غلط ثابت ہوں۔ اس لیے جب تک تمھاری تسلّی نہیں ہو جاتی تم تلاش جاری رکھو۔"

ان سپاہیوں نے ایک مسجد کا مؤذن کسی زمین دوز حجرے سے گرفتار کر لیا اور اسے اذیتیں دے کر مسجد میں اذان دینے کے لیے مجبور کیا۔ اذان سن کر مسجد کے قرب و جوار کی زمین دور پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ تاتاری جا چکے ہیں۔ چنانچہ وہ باہر نکل آئے اور تاتاریوں نے نہیں قتل کر ڈالا۔

اسی طرح وہ ہر محلے میں اذان دِلواتے اور باہر نکلنے والوں کو قتل کر ڈالتے۔ اس کے بعد گلی سڑی لاشوں کے تعفّن سے شہر کی ہوا اس قدر مسموم ہو گئی کہ تاتاری وہاں کسی انسان کا زندہ رہنا ناممکن سمجھ کر چل دیے۔

(۲)

بغداد سے فرار ہو کر طاہر اور اس کے ساتھیوں نے مرو کا رُخ کیا۔ راستے میں ایران کے شہروں کے باشندے جو ایک مدّت سے اپنی شکست کا اعتراف کر چکے تھے، اس کی روح پرور تقریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر نئی منزل پر رضاکاروں کی جماعتیں ان کے ساتھ شامل ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ مرو سے سو کوس کے فاصلے پر طاہر نے مرو کی تباہی کی خبر سُنی اور جلال الدّین کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد جنوب مشرق کی طرف کوچ کیا۔

ایک دوپہر رضاکاروں کی یہ فوج مشرق کی دشوار گزار پہاڑوں میں سے

گزر رہی تھی۔ ہراول دستوں کی قیادت عبد العزیز کے سپُرد تھی اور اس کی رہنمائی کے لیے ایک ایرانی نوجوان اس کا ہم رکاب تھا۔

ایک تنگ گھاٹی سے مُڑتے ہوئے ایرانی نوجوان نے ایک ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے نیچے وادی کی طرف اشارہ کیا۔

عبد العزیز نے دیکھتے ہی بلند آواز میں پکارا۔ "ہوشیار!" سالاروں نے آن کی آن میں یہ پیغام فوج کے آخری سپاہی تک پہنچا دیا۔ طاہر اور عبد المُلک قلب لشکر سے نکل کر گھاٹی کے موڑ پر پہنچے۔ کوئی ایک کوس چوڑی اور تین کوس لمبی وادی کے درمیان دو افواج میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ ایک ترک نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "تاتاری مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں۔ وہ دیکھیے، عقب کی پہاڑی سے تاتاریوں کی مزید فوج اتر رہی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں لیکن تاتاری ان سے تین چار گنا زیادہ ہیں اور عقب کے پہاڑوں سے مزید فوج میدان میں لا رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ

تاتاریوں کی بڑی فوج کے ہراول دستے ہیں اور اس مختصر سی فوج کو اس طرح لڑانے والا سلطان جلال الدّین کے سوااور کوئی نہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "تاتاریوں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک اگر زیادہ فوج پہنچ گئی تو ان کا بچ نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

ترک نے کہا۔ "جلال الدّین کے لیے کوئی بات ممکن نہیں لیکن اس مرتبہ وہ بری طرح نرغے میں آچکا ہے۔"

طاہر کے ساتھی اس کی ہدایت کے مطابق چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر مختلف راستوں سے نیچے اُترے اور وادی کے سرے پر ایک چھوٹے سے ٹیلے کے عقب میں جمع ہو گئے۔ میدان میں بعض تاتاریوں نے انہیں دیکھ بھی لیا لیکن دُور سے انہوں نے یہی سمجھا کہ وہ ان کی کمک کے طوفانی دستے ہیں۔

عین اس وقت جب کہ تاتاری سخت ترین حملہ کر چکے تھے، ان کا ایک سالار تازہ دستوں کو ہدایات دینے کے لیے میدان سے نکل کر گھوڑا بھگاتا

ہوا اس ٹیلے کی طرف بڑھا لیکن قریب پہنچ کر اس نے اپنی آواز کے جواب میں اللہ اکبر کا نعرہ سُنا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تیر اس کے سینے میں لگا۔ چھپی ہوئی فوج دو حصّوں میں تقسیم ہو کر ٹیلے کے گرد چکر لگاتی ہوئی میدان میں آگئی۔ تاتاریوں کے ہوشیار ہونے سے پہلے تین ہزار سواروں کے نیزے ان کے سینوں تک پہنچ چکے تھے۔

تاتاریوں کے پاؤں ایک بار اکھڑے اور پھر انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ ملی۔

اس سے قبل جلال الدّین کوئی چالیس آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے موت کی نیند سلا چکا تھا۔ اس کے اعضاء شل ہو چکے تھے۔ اپنی فتح کا یقین ہوتے ہی وہ میدان سے ایک طرف ہٹ کر گھوڑے سے اُترا اور ایک چھوٹی سے چٹان پر چڑھ کر ایک پتھر کے سائے میں بیٹھ گیا۔

ہانپتے ہوئے اس نے اپنا خود اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ رومال کے ساتھ چہرے کا پسینہ پونچھا اور کمان اٹھا کر بھاگتے ہوئے تاتاریوں پر تیر برسانے لگا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے نئے مدد گار کون ہیں؟

تاتاری میدان میں دس ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ سپاہی شہیدوں کو دفن کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹّی میں مصروف ہو گئے۔

طاہر نے گھوڑے سے اُتر کر خُود اتارا اور ایک ترک سے سوال کیا۔ ”سلطان کہاں ہے؟“

اس کے جواب میں فوج کا ایک افسر گھوڑے سے اُتر کر اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ ”طاہر! طاہر! آخر تم آ گئے۔ میں حیران تھا کہ خدا نے آج ہمارے لیے یہ مددگار کہاں سے بھیج دیے۔ تم سے مجھے یہی توقع تھی۔“

”تیمور ملک؟“ طاہر نے خود کے اندر سے جھانکنے والی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”ہاں میں!“ اس نے خود اُتار کر ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا۔ تیمور ملک کا نام سن کر طاہر کے ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ طاہر نے عبد العزیز، عبد الملک، مبارک اور اپنی فوج کے افسروں کا تعارف کرایا۔

تیور ملک نے گرم جوشی سے ان کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں

آپ کے ساتھیوں کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

عبدالعزیز نے سوال کیا۔ "سلطان کہاں ہے؟"

"سلطان کہاں ہے؟" تیمور ملک نے چند افسروں کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوال دہرایا۔

"سلطان کہاں ہے؟" وہ ایک دوسرے سے حیران ہو کر پوچھ رہے تھے۔

ایک افسر نے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اوپر ایک پتھر کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آیئے۔ میں آپ کو ان سے ملواتا ہوں!"

طاہر کے چند دوست اور سلطان کی فوج کے چند افسر چٹان پر چڑھے۔ سلطان ایک پتھر پر سر رکھ کر گہری نیند سو رہا تھا۔

تیمور ملک نے اس کا بازو پکڑ کر جگانے کی کوشش کی لیکن طاہر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ "نہیں ایسے سپاہی کی نیند بہت قیمتی ہے۔ خدا معلوم کتنے دنوں کے بعد سوئے ہیں۔"

تیمور ملک نے کہا۔ ”تولائی خان کی فوج یہاں سے صرف چار منازل کے فاصلے پر ہے۔ ہمیں جلدی کوچ کرنا ہے۔“

”عالی جاہ! اٹھیے۔“ تیمور ملک نے اس کا بازو پکڑ کر آہستہ سے ہلاتے ہوئے کہا۔ جلال الدّین نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تیمور! کبھی تو مجھے آرام کرنے دیا کرو۔“

”عالی جاہ! تولائی خان کا لشکر ہم سے زیادہ دُور نہیں۔“

”تو تمہارے خیال میں مجھے اس بات کا خیال نہیں تھا۔ مجھے کئی دنوں کے بعد ایک پہر آرام کے لیے ملا تھا۔ وہ بھی تم نے ضائع کر دیا۔ مجھے پانی پلاؤ۔“

ایک افسر نے اپنی چھاگل پیش کی۔ جلال الدّین پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد اٹھ کھڑا ہو گیا۔ طاہر اور اس کے ساتھیوں نے اس سے زیادہ با رعب شخصیت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ سچ مچ ایک چٹان تھا۔

سلطان نے پوچھا۔ ”فوج کہاں سے آئی؟“

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”بغداد سے!“

”بغداد سے؟ تو خدا نے میری دعائیں سن لیں۔ اب ہم دنیا کی ہر طاقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر بغداد کے لوگ بیدار ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ تمام عالمِ اسلام جاگ اٹھے گا اور ہم زمین کے آخری کونے تک اس وحشی قوم کا مقابلہ کر سکیں گے۔“

سلطان آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں شکر کے آنسو تھے۔

”اس فوج کا سالار کون ہے؟“

تیمور ملک نے طاہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کا نام طاہر بن یوسف ہے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے قوقند سے فرار ہوتے وقت میری جان بچائی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بغداد میں ایک نوجوان ہمارے لیے بہت کچھ کر رہا ہے۔ یہ وہی ہے!“

جلال الدّین نے طاہر کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کرتے

ہوئے کہا۔ ”عقابوں کی دنیا میں آرام دہ نشیمن نہیں ہوتے۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے آپ کو ایسی چٹانوں پر سونے کا عادی ہونا پڑے گا۔ میں اس جگہ بیٹھ کر آپ کی لڑائی کا ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ آپ کے بعض سپاہیوں کو سخت تربیت کی ضرورت ہے۔ چند جانیں صرف بے فائدہ جوش کی وجہ سے ضائع ہوئیں۔ ایک نوجوان سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ بالکل ایک عرب کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا آدھا سفید اور آدھا سیاہ تھا اور پچھلی ٹانگ میں تیر لگنے کی وجہ سے وہ تھوڑا تھوڑا لنگڑا بھی رہا تھا۔ میں اسے شاباش دینا چاہتا ہوں۔“

تیمور ملک نے کہا۔ ”وہ یہی ہیں۔ میں ان کا گھوڑا دیکھ چکا ہوں۔“

جلال الدّین نے کہا۔ ”میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں اور اپنے تین بہترین گھوڑوں میں سے ایک آج تمہیں دوں گا۔“

تیمور ملک نے کہا۔ ”طاہر! تم کتنے خوش نصیب ہو۔ سلطان صلاح الدّینؒ نے تمہارے باپ کو اپنی تلوار دی تھی اور خوارزم کے مجاہد اعظم نے

تمہیں اپنا گھوڑا دیا ہے۔"

جلال الدّین نے کہا۔ "سلطان الدّین ایوبیؒ کی تلوار؟"

"ہاں! ان کے باپ کو صلاح الدّین ایوبیؒ نے بہادری کے صلے میں اپنی تلوار دی تھی۔ کیوں طاہر! تلوار اپنے ساتھ لائے ہو یا اس دفعہ بھی بغداد میں چھوڑ آئے ہو؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "وہ تلوار میرے پاس ہے اور میں نے آج اسے پہلی بار استعمال کیا ہے۔" جلال الدّین نے کہا۔ "میں دیکھ سکتا ہوں؟"

طاہر نے تلوار نکال کر پیش کر دی۔ سلطان نے دستے پر صلاح الدّین ایوبیؒ کا نام دیکھ کر تلوار کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "خوش نصیب ہے وہ بیٹا جس کے باپ نے اتنا بڑا انعام حاصل کیا تھا۔ کاش میرا باپ بھی خوارزم کا شہنشاہ ہونے کے بجائے اس اولوالعزم مجاہد کی فوج کا ایک سپاہی ہوتا اور میں بھی تمہاری طرح اس پر فخر کر سکتا۔"

طاہر نے کہا۔ "اگر آپ قبول فرمائیں تو میں یہ آپ کی خدمت میں پیش

کرتاہوں۔"

"شکریہ! لیکن میں اس کا مستحق نہیں اور میں آج یہ دیکھ چکا ہوں کہ تم اس کا حق ادا کرنا جانتے ہو۔" سلطان نے یہ کہتے ہوئے تلوار واپس کر دی۔

(۳)

فوج کوچ کے لیے تیار ہوئی۔ سلطان نے کہا۔ "طاہر! تم بغداد کی طرف ہماری رہنمائی کرو گے؟"

"بغداد؟" طاہر نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ہاں بغداد۔ خلیفہ کے طرزِ عمل میں اس غیر متوقع تبدیلی کے بعد مجھ پر فرض عاید ہوتا ہے کہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی رہی سہی غلط فہمیاں دور کر سکوں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں چند دن قیام کر کے ہم مصر و شام اور عرب کے ممالک کی اعانت سے ایک بہت بڑی فوج تیار کر سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو روانہ کرنے سے پہلے خلیفہ نے

تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا ہو گا۔“

طاہر نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ بغداد سے میرے ساتھ آنے والے رضاکاروں کو حکومت باغی قرار دے چکی ہے۔ میں خود قید خانے سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ بغداد سے صرف ایک ہزار آدمیوں نے میرا ساتھ دیا تھا اور یہ باقی رضاکار ہمارے ساتھ راستے کے شہروں میں شامل ہوئے ہیں۔“

سلطان نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری دعا ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ لیکن میں مایوس نہیں۔ تمہاری آمد اس بات کا ثبوت ہے کہ باہر کے مسلمان ہمارے مصائب کے متعلق بے پروا نہیں۔ وہ وقت آئے گا کہ تمام عالمِ اسلام اس فتنۂ عظیم کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو گا اور میں اس وقت تک اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا۔ جہاں تک ہو سکے گا میں عالمِ اسلام کی حفاظت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا رہوں گا۔ جب تک تاتاریوں کے گھوڑے میری لاش کے اوپر سے نہیں گزر جاتے، میں ہر قدم پر ان کا

مقابلہ کروں گا۔ میں دنیا میں یہ ثابت کر دکھاؤں گا کہ جو جماعت خود مٹنے کا ارادہ نہیں کرتی، اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ میں اسلامی ممالک کے ہر حکمران کے محل کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ میں دنیائے اسلام کے دور افتادہ ممالک میں سونے والے سپاہیوں کو جگاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ میری آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہو گی۔ تیمور! لشکر کو کوچ کا حکم دو۔ ہماری منزل مقصود افغانستان ہے۔"

طاہر تیمور کی زبانی ہرات اور بلخ کی عبرت ناک تباہی کا حال سن چکا تھا۔ تیمور ملک نے اس کی تشویش کی وجہ معلوم کرنے کے بعد اسے تسلّی بھی دی کہ شہر کی بیشتر آبادی حملے سے پہلے ہجرت کر چکی تھی۔

فوج میں بلخ کے کئی آدمی تھے۔ طاہر کے استفسار پر ان سب نے بتایا کہ شیخ عبد الرحمان اپنے مال و متاع کے ساتھ بلخ پر حملے سے کئی ہفتے پہلے رفو چکر ہو چکا تھا۔ تاہم طاہر ہر منزل کے بعد تیمور ملک سے یہ کہتا کہ میں بلخ ضرور جاؤں گا اور تیمور ملک ہر بار یہ جواب دیتا کہ وہاں گلی سڑی لاشوں اور جلے ہوئے مکانات کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔ شہر کی ناقابلِ برداشت بدبُو

تمہیں دو کوس کے فاصلے سے واپس دھکیل دے گی۔

جلال الدّین کو طاہر کی تشویش کا علم ہوا تو اس نے بلخ کے تمام سپاہیوں کو شیخ عبد الرحمان کے متعلق اپنی معلومات بیان کرنے کا حکم دیا۔ اتفاقاً ایک شخص ایسا نکل آیا جس کا بھائی شیخ عبد الرحمان کے پاس ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ حملے سے چار ہفتے پیشتر اپنے گھر کے تمام افراد کے ساتھ بلخ چھوڑ چکا تھا اور رخصت کے وقت اسے اپنے بھائی سے معلوم ہوا تھا کہ سرِ دست شیخ کی منزل غزنی تھی۔ اس کے بعد وہ شاید کسی اور شہر کا رخ کرے۔

سلطان نے طاہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تقدیر کے راستے اچانک ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ہم مرو کی طرف جا رہے تھے لیکن اب شاید تمہاری وجہ سے ہماری منزل مقصود بھی غزنی ہے۔"

راستے میں چند مقامات پر تاتاریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے جو سلطان کی تلاش میں دن رات ایک کر رہی تھیں، مزاحمت کی لیکن سلطان انہیں تہ تیغ کرتا ہوا غزنی پہنچ گیا۔

غزنی میں امین الملک نے ۵۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سلطان کا استقبال کیا۔ چند دنوں میں سیف الدّین اغراق بھی چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ آ ملا۔ اس کے بعد افغانستان کے ملک اور سردار یکے بعد دیگرے اپنی اپنی جمعیت کے ساتھ غزنی پہنچنے لگے۔

(۴)

غزنی پہنچ کر طاہر کو پتہ چلا کہ شیخ عبد الرحمان وہاں دو ہفتے ٹھہر کر ہندوستان کا رُخ کر چکا ہے۔ غزنی کے ایک تاجر نے جس کے ساتھ شیخ کے کاروباری تعلقات تھے، یہ بھی بتایا کہ شیخ موجودہ دور میں صرف مدینے کو محفوظ سمجھتا تھا اور اس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عنقریب بچوں کو مدینے پہنچا دے گا۔

طاہر کے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ وہ خطرے سے بہت دور ہے، اس کی تمام توجہ اب جنگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ غزنی کی مسجد میں چند تقریروں کے بعد اس نے لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔

افغانستان کے علما پہلے ہی جہاد کا فتویٰ دے چکے تھے۔ اب وہ طاہر کی اپیل پر دور دراز کا دورہ کر کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے لگے۔ ایک جمعہ کو طاہر کے بعد عبد المُلک نے بھی تقریر کی۔ اس کی تقریر جس قدر مختصر تھی اس قدر مؤثر تھی۔ اگلے دن سلطان نے غزنی کے چیدہ چیدہ علما کے دو دو وفد بنا کر طاہر اور عبد المُلک کو ان کے ساتھ آس پاس کے علاقوں میں جہاد کی تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔

غیّور افغان جہاد کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جوق در جوق سلطان کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ اس دورے میں طاہر، عبد المُلک سے زیادہ کامیاب رہا اور اس کی وجہ ایک تو اس کی قوّتِ بیان تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس ایک ایسے مجاہد کی تلوار تھی جس کی بہادری کی داستانیں ان کے دلوں پر نقش تھیں۔

افغان دنیائے اسلام کے ہر جلیل القدر سپاہی کو اپنا عزیز دوست خیال کرتے تھے۔

سلطان جلال الدّین نے اپنی قوّت کا اندازہ لگانے کے بعد چنگیز خان کو جو ان دونوں طالقان میں موجود تھا، چند تاتاری قیدیوں کی معرفت یہ پیغام بھیجا۔ ”تم نے بے خبری کی حالت میں ہم پر حملہ کیا۔ تم نے طاقت سے زیادہ عیّاری اور مکّاری سے ہمارے شہر فتح کیے۔ تمہارے سپاہی ایک مدت سے میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ میں اس وقت افغانستان میں ہوں اور تمہیں مقابلے کی دعوت دیتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس دن تمہاری تلواروں کے سامنے بے کسی عورتوں اور بچوں کی گردنوں کی بجائے تلواریں ہوں گی۔ اگر ہمت ہے تو مقابلے کے لیے آجاؤ۔“

چنگیز خان نے شیگی توتو کو ایک زبردست فوج کے ساتھ جلال الدّین کے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ سلطان نے غزنی سے چند کوس آگے نکل کر اس کا مقابلہ کیا۔ تین دن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ ترکوں اور افغانوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بہادری کے جوہر دکھائے، چوتھے دن تاتاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے، سلطان کئی کوس تک ان کا تعاقب کرنے کے بعد انہیں گھیرا کر ایک ایسے علاقے میں لے آیا جہاں تنگ

پہاڑی راستے پر اس نے اپنے بہترین تیر انداز بٹھا رکھے تھے۔ شیگی توتو کی بہت تھوڑی فوج یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی لیکن سلطان نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور دریائے کابل تک تعاقب کیا۔ شیگی توتو نے دریا میں کُود کر جان بچائی۔ تیروں کی بارش میں جب وہ دوسرے کنارے پر پہنچا تو اس کے ساتھ صرف آٹھ آدمی تھے۔

افغانستان میں جلال الدّین کی اس کی فتح کی خبر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ چنگیز خان کو اس شکست کی خبر کے ساتھ ہی یہ خبر بھی ملی کہ کوہ ہندوکش سے لے کر دریائے مرغاب کے ساحل تک تمام قبائل کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے تاتاریوں کی ہر چوکی کے سپاہیوں کا صفایا کر دیا ہے۔ چنگیز خان نے پہلی بار صرف ایک محاذ پر اپنی تمام قوّت جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ زبردست تیاری کے بعد اس نے بلخ اور ہرات کے درمیان ایک وسیع علاقے کو تباہ و برباد کرنے کے بعد دریائے مرغاب کے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا اور فرغانہ سے لے کر آذربائیجان تک بکھری ہوئی افواج کی آمد کا انتظار کرنے لگا لیکن یہ پہلا

موقع تھا کہ چنگیز خان کو اپنی فتح کا پورا یقین نہ تھا اور اسے یہ خدشہ تھا کہ اگر اسے شکست ہوئی تو مفتوحہ ممالک کے تمام وہ لوگ جو ابھی تک تاتاریوں کے مظالم کی وجہ سے سہمے ہوئے ہیں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور جلال الدّین زمین کے آخری کونے تک اس کا تعاقب کرے گا۔

(۵)

لیکن قدرت کو شاید جلال الدّین کے عزم و استقلال کا ایک اور امتحان مقصود تھا۔ مستقبل کے افق پر ایک ہلکی سی روشنی دیکھنے کے بعد اسے پھر ایک بار ادبار کی گھٹائیں نظر آنے لگیں۔ ایک افسوس ناک حادثے نے شیر خوارزم کی شاندار فتح شکست میں تبدیل کر دی۔ شیگی توتو کی شکست کے بعد جو مالِ غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا اس میں ایک خوبصورت گھوڑا بھی تھا۔ اس گھوڑے پر امین الدّین ملک اور سیف الدّین اغراق میں تکرار ہو گئی۔ سیف الدّین کے منہ سے کوئی سخت جملہ نکل گیا اور امین الدّین نے غصے میں آکر اسے ایک چابک رسید کر دیا۔ سیف الدّین کے

بھائی نے فوراً تلوار کھینچ لی اور امین ملک پر حملہ کر دیا لیکن امین کی فوج کے ایک افسر نے پیچھے سے تلوار مار کر اس کا سر قلم کر دیا۔

فوج کے دو بہادر سرداروں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی۔ سیف الدّین اغراق کے چالیس ہزار اور امین الدّین ملک کے پچاس ہزار ایک دوسرے کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

سلطان کو اپنے خیمے میں خبر ملی تو وہ بھاگ کر باہر نکلا اور ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ افغانستان کے ملک اور علما بھی ان دو افواج کے درمیان قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سلطان کے حکم پر امین الدّین ملک معذرت خواہی کے لیے تیار ہو گیا لیکن سیف الدّین کے لیے اپنے بھائی کا قتل معمولی بات نہ تھی۔ اس کا پہلا اور آخری مطالبہ یہی تھا کہ امین ملک کو اس کے حوالے کیا جائے۔ سلطان کو ایک طرف یہ احساس تھا کہ امین ملک پر سختی کی گئی تو اس کے پچاس ہزار سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ دوسری طرف سیف الدّین کے ناراض ہو جانے کی صورت میں اسے چالیس ہزار ترکوں کے بگڑ جانے کا

خطرہ تھا۔

مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ سیف الدّین کو سلطان کی نیّت پر اس لیے بھی شبہ ہوا کہ امین ملک اپنی لڑکی سلطان کے عقد میں دے چکا تھا۔ اس نازک موقع پر نہ علما کی منّتیں کارگر ثابت ہوئیں اور نہ طاہر اور عبد الملک کی تقریروں کا کوئی اثر ہوا۔

سیف الدّین نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہم تاتاریوں کے مقابلے میں سلطان کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ سلطان کے خُسر سے بے عزّتی کروانے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ رات کے وقت اس نے اپنے چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ کرمان کی طرف کوچ کر دیا۔ سلطان کا ایک مضبوط بازو ٹوٹ گیا۔

جلال الدّین کے لشکر میں پھوٹ کی خبر سنتے ہی چنگیز خان باد و باراں کی طرح غزنی کی طرف بڑھا۔ سلطان نے غزنی سے کئی منازل آگے جا کر پڑاؤ ڈال دیا اور چنگیز خان کے راستے کی ہر پہاڑی، ہر گھاٹی، ہر درّے اور

ہر ندی کے پل پر چھاپہ مار سپاہیوں کے پہرے بٹھادیے۔

چنگیز خان کے ساتھ ایک بے پناہ قوّت تھی۔ وہ راستے کی ہر مشکل پر قابو پاتا مزاحمت کی ہر چٹان کو سرنگوں کرتا اور قدم قدم پر اپنے سپاہیوں کی لاشوں کے انبار چھوڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

جلال الدّین کے چھاپہ مار سپاہی اچانک کسی پہاڑی پر نمودار ہوتے اور اس کی فوج کے کسی حصّے پر تیروں کا مینہ برسا کر غائب ہو جاتے۔

جلال الدّین کسی ایک میدان میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ چنگیز خان کی ٹڈی دل افواج کے ساتھ اس کے معمولی لشکر کو کوئی نسبت نہ تھی۔ دوسرے چالیس ہزار ترکوں کے نکل جانے سے اس کے نئے ساتھیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ صرف پندرہ بیس ہزار سپاہی ایسے تھے جن کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر آخری دم تک لڑیں گے۔ باقی فوج کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بار پسپا ہونے کے بعد پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھے گی۔

اس نے فوج کا بیشتر حصّہ امین الملک اور تیمور ملک کے سپرد کیا اور اپنے پرانے جان نثاروں کے طوفانی دستوں کے ساتھ آگے بڑھ کر چنگیز خان کی فوج کے ہراول دستوں کو شکست دی اور قریباً پانچ ہزار سپاہی تہ تیغ کر دیے۔

جب چنگیز خان ہراول کے سالاروں کو لعنت ملامت کر رہا تھا تو اسے یہ خبر ملی کہ جلال کے طوفانی دستوں نے پہاڑیوں کے عقب سے ایک لمبا چکر کاٹ کر عقبی دستوں پر حملہ کر دیا ہے اور رسد کا بہت سا سامان لوٹ لیا ہے۔

مٹھی بھر جماعت کے ساتھ جلال الدّین کی ان کامیابیوں نے اس کی فوج میں پھر ایک نئی روح پھونک دی لیکن تاتاریوں کی قوّت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد جلال الدّین نے یہ فیصلہ کیا کہ دریائے سندھ تک پیچھے ہٹا جائے گا اور اس دوران میں اسے ایک تو مزید تیاری کا موقع مل جائے گا، دوسرے عقب سے چھاپہ مارنے والی فوجیں آئے دن تاتاریوں کے نقصانات میں اضافہ کر کے انہیں پہاڑوں کے اس لامتناہی سلسلے میں اور

آگے بڑھنے کا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں گی اور پسپائی کی صورت میں چنگیز خان کا انجام تمغی تو تو سے مختلف نہ ہو گا۔

صحرائے گوبی کا گرگِ باراں دیدہ ان خطرات سے بے خبر نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیر خوارزم اسے اپنی خطرناک کچھار میں لا رہا ہے لیکن آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنا زیادہ خطرناک سمجھتے ہوئے اس نے قدم قدم پر سخت ترین نقصانات کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جلال الدّین نے امین ملک اور تیمور ملک کو حکم دیا کہ وہ فوراً مستقر کو چھوڑ کر اپنی فوجیں مشرق کی طرف لے جائیں اور خود آٹھ ہزار جانبازوں کے ساتھ تاتاریوں کی رفتار کم کرنے کی تدابیر سوچنے لگا۔

ایک صبح تاتاری جب سورج کے سامنے سر بسجود تھے، جلال الدّین نے ایک پہاڑ کے عقب سے نمودار ہو کر ان کے لشکر کے بائیں بازو پر حملہ کر دیا اور جب تک دوسری وادی سے قلب لشکر کے سپاہی بائیں بازو کی فوج کی مدد کے لیے پہنچے جلال الدّین تین ہزار تاتاریوں کو موت کی گھاٹ

اتار کر پہاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ چنگیز خان نے جلال الدّین کا پیچھا کرنے کی بجائے ہر اول دستوں کو امین اور تیمور ملک کی قیادت میں پیچھے ہٹنے والی فوج کا پیچھا کرنے کا حکم دیا اور باقی لشکر کی رفتار بھی تیز کر دی۔ جلال الدّین کو ایک اور موقع ہاتھ آیا اور اس نے دوپہر کے وقت عقب میں نمودار ہو کر رسد کے دستوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن عقب کی افواج رُک کر مقابلہ کرنے کی بجائے مدافعانہ جنگ لڑتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں۔ جلال الدّین نے رسد کے سامان سے لدے ہوئے خچر منتشر کر دیے اور دور تک تاتاریوں کا پیچھا کر کے ان پر تیر برساتا رہا۔ بالآخر تیسرے پہر اس نے فوج کو رُکنے کا حکم دے کر ایک افسر سے کہا۔ ”خدا خیر کرے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ امین ملک حماقت کر بیٹھا ہے، اس نے تاتاریوں کے ہر اول دستے دیکھ کر میرے حکم کے خلاف ان کے ساتھ لڑائی شروع کر دی ہے۔ ورنہ عقب میں میرے حملے کے باوجود تاتاریوں کے نہ رکنے کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

ترک افسر نے جواب دیا۔ ”امین ملک اتنا بے وقوف نہیں اور اگر ہو بھی تو

تیمور ملک جیسا جہاں دیدہ سپاہی اس کے ساتھ ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "لیکن تاتاری سامان رسد کے ایک خچر کو سو سپاہیوں سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔ آج انہوں نے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس سے دو ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ امین ملک نے یا تو ان کے ساتھ لڑائی شروع کر دی ہے یا وہ ان کے نرغے میں آ چکا ہے۔ ہمیں ان کی مدد کو فوراً پہنچنا چاہیے؟"

(٦)

جلال الدّین کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ چنگیز خان کے ہراول کے چند دوستوں نے تقریباً بیس کوس یلغار کرنے کے بعد امین ملک کے لشکر کو جا لیا۔ امین ملک نے یہ سمجھ کر ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور پیچھے جلال الدّین کے حملوں کے باعث چنگیز خان اتنی بڑی فوج کے ساتھ نہایت معمولی رفتار سے پیش قدمی کر رہا ہو گا، فوج کو ٹھہرنے کا حکم دے کر ان پر حملہ کرنا چاہا لیکن تیمور ملک نے اس ارادے کی مخالفت کی اور اسے

سمجھا یا کہ ہر اول کو اس قدر تیزی سے آگے جانے سے چنگیز خان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ساتھ لڑائی چھیڑ کر ہمیں تاتاریوں کے باقاعدہ لشکر کی آمد تک مصروف رکھا جائے۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ مجھے دو ہزار سواروں کے ساتھ ان دستوں سے نپٹنے کے پیچھے چھوڑ دیں اور اپنی پسپائی جاری رکھیں۔"

لیکن امین ملک نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور پیچھے مڑ کر تاتاریوں پر حملہ کر دیا۔ تاتاری تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ نکلے۔ امین ملک نے لشکر کو دوبارہ کوچ کا حکم دیتے ہوئے تیمور ملک سے کہا۔ "دیکھا آپ نے، مجھے یقین تھا کہ یہ چنگیز خان کے ہر اول دستے نہیں بلکہ کسی طرف سے کوئی اور گروہ اس طرف آنکلا ہے، چنگیز خان کی فوج نے بڑی تیزی سے کام لیا ہو گا تو بھی ہم سے دس کوس دور ہو گی۔"

تیمور ملک نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو لیکن ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔"

امین ملک نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا لیکن اچانک اسے قریباً تین ہزار تاتاری ایک پہاڑی سے وادی کی طرف اترتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس دفعہ تیمور ملک نے اسے سختی سے روکنے کی کوشش کی لیکن جس قدر تیمور ملک کے شکوک پختہ ہو چکے تھے، اسی قدر امین ملک کا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ مختصر سی فوج کسی اور طرف سے آ نکلی ہے اور اس کا چنگیز خان کی باقاعدہ فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جو اس کے خیال کے مطابق ابھی کوسوں دور تھی۔ امین ملک نے تیمور ملک کے خدشات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھر تاتاریوں پر حملہ کر دیا اور چند لمحات کے اندر اندر انہیں روند ڈالا لیکن ان کی تعداد کم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ پہاڑیوں سے ان کے نئے دستے جوق در جوق اتر کر وادی میں داخل ہونے لگے۔ تقریباً ایک پہر لڑنے کے بعد امین ملک نے دیکھا کہ دشمن کی صفوں میں دس بارہ ہزار سپاہی جمع ہو چکے ہیں اور اس نے پریشان ہو کر تیمور ملک سے سوال کیا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

تیمور ملک نے غصّے سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم کر ہی کیا

سکتے ہیں؟ چنگیز خان کے ہر اول کی تمام فوج اس وادی کے ارد گرد جمع ہو چکی ہے۔ آس پاس کی تمام پہاڑیوں سے انہیں مار بھگائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کاش! آپ میرا مشورہ قبول کرتے۔ لیکن اب غلطیوں پر اظہارِ افسوس کا موقع نہیں، تلافی کا موقع ہے۔"

"تو آپ رہنمائی کیجئے۔ مجھے اب ایک سپاہی سمجھئے۔"

تیمور ملک نے امین کو تیس ہزار سپاہی دے کر آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کے لیے کہا اور خود باقی فوج کے ساتھ وادی میں اترنے والی افواج کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ عصر کے قریب یہ وادی اور آس پاس کی پہاڑیاں تاتاریوں سے خالی ہو رہی تھیں لیکن اس عرصے میں چنگیز خان کی باقاعدہ فوج پہنچ گئی۔ امین ملک نے اپنے بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایک پہاڑی سے اُتر کر دوسری وادی میں چنگیز خان کے لشکر کے دائیں بازو پر حملہ کر دیا اور اس کا یہ حملہ فتح کی خواہش سے زیادہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے تھا۔

دوسری وادی میں جہاں تیمور ملک لڑ رہا تھا، چنگیز خان مقدمۃ الجیش کے ساتھ خود پہنچ گیا۔ تیمور ملک نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن تھوڑی دیر چنگیز خان کے میسرہ کی فوج بھی اس وادی میں داخل ہو چکی تھی۔ تیمور ملک شام کی تاریکی سے فائدہ اٹھانے کی امید میں لڑتا رہا۔ دوسری وادی میں امین ملک کے پاؤں اکھڑ چکے تھے لیکن اچانک جلال الدّین کے پہنچ جانے سے بچے کھچے سپاہیوں نے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جان توڑ حملے کرنے لگے۔ جلال الدّین نے چند حملوں میں میدان صاف کر دیا اور امین ملک کے قریب جا کر سوال کیا۔ ”مجھے تمہاری حماقت کی سزا ملی ہے یا قدرت نے میری بد قسمتی میں اضافہ کرنے کے لیے تیمور ملک جیسے جہاں دیدہ سپاہی کے دماغ میں بھی جنون کے آثار پیدا کر دیے ہیں؟“

امین ملک نے ندامت سے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”میرا قصور ہے، تیمور ملک نے مجھے منع کیا تھا۔ میں نے اس کا کہنا نہ مانا۔ مجھے یقین تھا کہ تاتاری بہت دور ہوں گے۔“

”خدا ہر انسان کو تمہارے جیسے احمقوں کی دوستی سے محفوظ رکھے۔ اب

میں تمہیں ایک کام سونپا ہوں۔ تم فوراً غزنی کی طرف روانہ ہو جاؤ اور میرے بیوی بچوں کو لے کر کسی محفوظ مقام کی طرف نکل جاؤ۔ اہلِ شہر کو بھی یہ مشورہ دو کہ وہ ہندوستان کی سرحد کی طرف نکل جائیں۔"

جلال الدّین نے اس وادی میں رہی سہی فوج کو منظم کر کے چند پہاڑیاں عبور کرنے کے بعد تیمور ملک سے نبرد آزما ہونے والی فوج پر حملہ کر دیا اور تیمور ملک کے ارد گرد گھیر اڈالنے والی صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا اس کی فوج کے ساتھ جا ملا۔ جب شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کسی کو دوست اور دشمن کی تمیز نہ رہی، جلال الدّین ایک طرف زور دار حملوں سے میدان خالی کرتا ہوا قریباً آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ وادی سے نکل گیا، لیکن چنگیز خان کے حکم سے تاتاریوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ رات کے وقت اس کے کئی سپاہی گھوڑے زخمی ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گئے اور کئی بھٹک کر اِدھر اُدھر نکل گئے اور بعض نے مایوسی کی حالت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ صبح تک اس کے ساتھ صرف چھ ہزار سپاہی رہ گئے۔ طاہر کے ساتھیوں میں سے اکثر شہید ہو چکے تھے۔ عبدالعزیز اور موسیٰ کو

اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے میدان میں گرتے دیکھا تھا۔

چند دن تک تاتاری سائے کی طرح جلال الدّین کے پیچھے لگے رہے یہاں تک کہ وہ لڑتا بھڑتا دریائے سندھ کے کنارے جانکلا۔

دیارِ غیر

ایک صبح جلال اپنی مختصر فوج کے ساتھ ایک ایسی چٹان پر کھڑا تھا جو تین اطراف سے تاتاریوں کے محاصرے میں تھی اور چوتھی طرف تقریباً تیس فٹ نیچے دریائے سندھ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

چنگیز خان کا حکم تھا کہ جلال الدّین کو ہر قیمت پر زندہ گرفتار کیا جائے۔ چٹان کے گرد جلال الدّین کے بچے کھچے ساتھی اپنی جان کی بازی لگا چکے تھے۔ تاتاریوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ان کی فوج سے ایک سوار جو شکل و صورت اور لباس سے ایک مسلمان عالم معلوم ہوتا تھا، سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے چٹان کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ ”سلطانِ معظّم! اگر آپ ہتھیار ڈال دیں تو خانِ اعظم آپ کی جان بخشی کا

وعدہ کرتے ہیں۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "اگر تمہارے ہاتھ میں سفید جھنڈا نہ ہوتا تو میں تمہاری بات کا جواب تیر سے دیتا۔ جاؤ اس ڈاکو سے کہو کہ میں ذلّت کی زندگی پر عزّت کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

طاہر نے چنگیز خان کے ایلچی کو ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ مہلب بن داؤد تھا۔

چنگیز خان نے چند دوستوں کو حملے کا حکم دیا۔ جلال الدّین کے سپاہیوں کے تیروں اور پتھروں کی بارش سے چٹان کے نیچے تاتاریوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ چنگیز خان نے یہ دیکھ کر زیادہ سپاہی بھیج دیے۔ جلال الدّین کے سپاہی ایک ایک کر کے کٹنے لگے۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے چٹان کے آخری سرے تک جا پہنچا۔ سلطان نے تیمور ملک سے کہا۔ "تیمور! قدرت نے ہمیں آگ اور پانی میں سے ایک شے منتخب کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمہاری رائے کیا ہے؟"

تیمور ملک نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ پانی کی لہریں آگ کے شعلوں کی طرح بے رحم ثابت نہیں ہوں گی۔"

"بہت اچھا۔ میں رہنمائی کرتا ہوں تم سپاہیوں کو تیار ہونے کا حکم دو۔ سلطان نے بھاری زرہ اتار کر پھینک دی۔ گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ایک لمحہ خوفناک لہروں کو دیکھنے کے بعد ایڑ لگا دی۔ تیمور ملک نے چند آدمیوں کے سوا باقی سپاہیوں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا۔

جب اپنی باری آئی تو تیمور ملک کی نگاہ طاہر پر جا پڑی۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر گھوڑے کی گردن پر سر ٹیکے ہوئے تھا۔ اس کی زرہ میں چند تیرا ٹکے ہوئے تھے اور اس کا وفادار نوکر زید نیزے کے ساتھ دو تاتاریوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیمور ملک گھوڑا بڑھا کر آگے بڑھا اور تاتاریوں میں سے ایک کی گردن اڑا دی۔ دوسرے تاتاری کو زید گرا چکا تھا۔ اتنی دیر میں چند اور تاتاری پہنچ گئے۔ تیمور ملک نے طاہر کو کھینچ کر اپنے گھوڑے پر ڈالتے ہوئے زید اور باقی سپاہیوں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے گھوڑے کو چٹان کے سرے پر لے جا کر ایڑ لگا دی۔

عبد الملک دریا کے کنارے تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا لیکن جب طاہر کو تیمور کی حفاظت میں دیکھا تو اس نے بھی چھلانگ لگا دی۔

چنگیز خان نے خوارزم شاہ کو زندہ پکڑنے کی نیّت سے اپنے سپاہیوں کی معمولی تعداد چٹان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی تھی۔ جب تاتاری چٹان کے اوپر کھڑے ہو کر دریا کی طرف اشارہ کر کے چلّانے لگے تو وہ بھاگتا ہوا چٹان پر چڑھا۔ جلال الدّین کے اکثر ساتھی تاتاریوں کے تیروں اور بعض دریا کی تند و تیز موجوں کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن جلال الدّین تیروں کی زد سے دور جا چکا تھا۔ وہ دوسرے کنارے پہنچ کر ایک ٹیلے پر چڑھا اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چنگیز خان نے اپنے بیٹوں اور سرداروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”خوش نصیب ہے وہ باپ جس کا بیٹا جلال الدّین جیسا ہو اور مبارک ہیں وہ مائیں جو ایسے شیروں کو دودھ پلاتی ہیں۔“

چنگیز خان کے بعض سپاہیوں نے جلال الدّین کے تعاقب میں دریا عبور

کرنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے کہا۔ ”یہ دریا ترکستان کے چھوٹے چھوٹے دریاؤں سے مختلف ہے اور دشمن کے ترکش تیروں سے خالی نہیں۔“

تیمور ملک نے طاہر کو دریا کے کنارے لِٹا کر اس کی زرہ کھولی۔ زخموں پر پٹیاں باندھیں اور کہا۔ ”طاہر اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے صبح سے پانی پینے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس لیے بھوک اور پیاس کی وجہ سے چکرا گیا تھا۔ دریا میں ٹھنڈا پانی میں نے جی بھر کر پیا ہے۔“

قریباً سات سو سپاہی دریا عبور کر کے جلال الدّین سے جا ملے۔ سلطان نے اردگرد کی بستیوں پر قبضہ کر کے سامانِ رسد اور چند گھوڑے فراہم کیے اور کوہستانِ نمک کے آس پاس ایک چھوٹے سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ چند دنوں میں اس کی فوج کے منتشر سپاہیوں کی چند اور ٹولیاں بھی اسی سے آ ملیں۔ چنگیز خان نے چند کوس نیچے جا کر کشتیاں فراہم کیں اور

ایک تجربہ کار جرنیل کو اپنے بہترین سواروں کی فوج دے کر دریا پار پہنچا دیا۔ جلال الدّین نے مایوسی کی حالت میں دہلی کا رُخ کیا۔ تاتاری ہندوستان کی ناقابلِ برداشت گرمی میں دور تک اس کا پیچھا نہ کر سکے۔ وہ ملتان، لاہور اور شاہ پور کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے واپس چلے گئے۔

واپسی پر پشاور کو تباہ و ویران کرنے کے بعد چنگیز خان نے سمرقند کا رخ کیا۔ افغانستان کے تباہ شدہ علاقوں میں سے دوبارہ گزرتے ہوئے اس نے رہے سہے ان تمام مردوں کو، جو اس کے ہاتھ لگے قتل کروا دیا اور بے شمار عورتوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

دریائے سندھ کے کنارے سے لے کر بحیرۂ خزر تک تمام اسلامی ممالک پر تاتاریوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ افغانستان سے انتقام لینے کے بعد چنگیز خان کو اطمینان ہو چکا تھا کہ اب مسلمانوں میں سر اٹھانے کی ہمّت نہیں۔ صرف جلال الدّین ایک ایسا دشمن تھا جسے وہ تمام دنیا سے زیادہ خطرناک سمجھتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ملک نہ تھا، فوج عالمِ اسلام کی مدافعت کا آخری قلعہ مسمار ہو چکا تھا۔ پشاور کے قریب تاتاریوں کے ہاتھوں اس

کے بچّے اور بیوی جو امین کی حفاظت میں تھے قتل ہو چکے تھے۔ تکشی خاندان کا وہ آخری چشم و چراغ جس کی مملکت چند برس قبل کوہِ البرز سے لے کر سندھ کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی، ایک بے خانماں مسافر اور ایک بن بلائے مہمان کی حیثیت میں دہلی کے حکمران سلطان شمس الدّین التمش کی مملکت میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن اسے خیر مقدم کی امید نہ تھی۔

جلال الدّین نے دہلی سے چند منازل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال کر اپنے ایک تجربہ کار مشیر عین المُلک اور طاہر بن یوسف کو رہنمائی میں سلطان شمس الدّین التمش کی طرف ایک وفد روانہ کیا۔

(۲)

عین المُلک اور اس کے ساتھیوں کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سلطان التمش نے ان کے ساتھ تین ملاقاتوں کے بعد انہیں چند دنوں تک جواب دینے کا وعدہ کیا۔

اپنے تمام مُشیروں اور فوجی افسروں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد سلطان نے ایک دن ارکانِ وفد میں سے طاہر بن یوسف کو علیحدہ ملاقات کی دعوت دی اور ایک طویل گفتگو کے بعد کہا۔ ”ہم جلال الدّین کی مدد سے انکار نہیں کر سکتے لیکن ہماری مجبوریاں آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارے پاس چنگیز خان کا پیغام پہنچ گیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر ہم نے سلطان جلال الدّین کو پناہ دی یا اس کے ساتھ تاتاریوں کے خلاف کوئی معاہدہ کیا تو وہ ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ ہم اس کی دھمکیوں کی پروا کرنے والے نہیں۔ تاہم سلطان جلال الدّین کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اگر تاتاری یہاں گھُس آئے تو خطرے کے وقت شاید یہاں کی دوسری اقوام ہمارا ساتھ دینے کی بجائے ان کے ساتھ جا ملیں۔ ہمیں چند ہندو راجاؤں نے یقین دلایا ہے کہ تاتاریوں کے حملے کی صورت میں وہ اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے ہمارا ساتھ دیں گے لیکن اگر چنگیز خان انہیں یہ پیغام بھیج دے کہ اس کا مقصد صرف جلال الدّین کو گرفتار کرنا ہے تو وہ یقیناً ہم سے یہ مطالبہ کریں گے کہ ہم اس مہمان کو پناہ دے کر

ہندوستان کی تباہی کا موجب نہ بنیں۔ اگر ہمارے پاس زیادہ افواج ہوتیں تو ہم تو آدھے لشکر کے ساتھ جلال الدّین کے جھنڈے تلے ہندوستان سے باہر نکل کر تاتاریوں کا مقابلہ کرتے اور آدھا لشکر ہندوستان کی حفاظت کے لیے چھوڑ جاتے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ پچھلے دنوں تاتاریوں کے چند دستے دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد لاہور اور ملتان تک لوٹ مار کر گئے تھے اور ہمیں ان کی پیش قدمی روکنے سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ کہیں ہماری غیر مسلم رعایا باغی نہ ہو جائے۔ عین الملک نے ہمیں طعنہ دیا ہے کہ ہم تاتاریوں سے خوف زدہ ہیں۔ ہم اس بات کا جواب دوسروں کے سامنے نہیں دے سکتے لیکن ہم آپ سے کہتے ہیں کہ تاتاریوں سے خوف کھانے کی وجہ یہ نہیں کہ ہم بُزدل ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے رعیت سے مطمئن نہیں۔"

طاہر نے پوچھا۔ "تو کیا میں سلطان جلال الدّین کے پاس یہ جواب لے جاؤں کہ آپ کو ان کا ہندوستان میں ٹھہرنا منظور نہیں؟"

"نہیں۔ آپ نے ہمیں غلط سمجھا۔ اگر ہماری طرف سے سلطان جلال

الدّین کے مکتوب کا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ یہ کہ ہم اپنے ایک مصیبت زدہ بھائی کے لیے اپنا خون تک بہانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن موجودہ حالات میں ان کی اعانت کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اس سلطنت کی حفاظت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر اپنی ساری فوج سلطان کے حوالے کر دیں اور تاتاریوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ ہندوستان کی بجائے کسی ایسے ملک میں لڑی جائے جس کے عوام ہمارے ساتھ ہوں اور ہمیں خدشہ نہ ہو کہ کوئی پیچھے سے ہمیں چھرا گھونپ دے گا۔ ایسی صورت میں نتیجہ اگر ہمارے حق میں ہو تو ہم ہندوستان کو ایک بار کھو کر بھی دوبارہ حاصل کر سکیں گے اور اگر ہمیں شکست ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان کو بھی کھو بیٹھیں گے۔"

طاہر نے کہا۔ "ہم نے ہندوستان کی وسعت سے آپ کی فوجی قوّت کا اندازہ لگایا تھا۔ سلطان جلال الدّین کی جنگ اپنے لیے نہیں، تمام اسلامی دنیا کے لیے ہے۔ وہ بھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ یہ ملک جو ترکستان،

ایران اور افغانستان کے لاکھوں بے خانماں لوگوں کی پناہ گاہ بن سکتا ہے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ دریائے سندھ کے کنارے ان کی لڑائی تاتاریوں کو ہندوستان کے دروازے پر روکنے کے لیے تھی۔ خراسان اور ایران میں ان کی جنگیں عراق، شام اور مصر کی حفاظت کے لیے تھیں۔ ہمارا مقصد ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے کھوئے ہوئے ممالک دوبارہ حاصل کرلیں اور اس مقصد کے حصول کا راستہ بھی ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم جمنا کے ساحل سے لے کر جبل الطارق تک ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ ہمارا ہر ملک اس اجتماعی جدوجہد میں اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لے۔ سلطان جلال الدّین کا یہ خیال تھا کہ وہ آپ کے تعاون سے ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر ایک بار پھر تمام اسلامی سلطنتوں کو دعوتِ عمل دیں گے۔ اگر عالمِ اسلام نے ان کی دعوت پر لبیک کہا تو بہت تھوڑے عرصے میں یہاں سپاہی جمع ہو سکتے ہیں۔“

سلطان التمش نے کہا۔ ”ہم یہاں آنے والے ہر سپاہی کا خیر مقدم کریں گے لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ سلطان جلال الدّین خود یہاں نظر آنے

کی بجائے تمام عالمِ اسلام کا دورہ کریں اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں کا مستقر ہندوستان ہو۔ جتنے سپاہی وہ فراہم کر کے یہاں بھیجیں گے۔ ہم ان کی تمام ضروریات مہیّا کرنے کا ذمّہ لیتے ہیں۔ اس کا خوشگوار اثر یہ ہو گا کہ تاتاریوں کی توجہ ہندوستان سے ہٹ جائے گی اور ہمیں تیّاری کا موقع مل جائے گا۔ اس کے برعکس سلطان جلال الدّین اگر خود ہندوستان میں رہے تو تاتاری ہر کروٹ سے باخبر رہیں گے اور ہماری طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہی ہندوستان پر حملہ کر دیں گے۔ آپ ہماری تمام باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سلطان کو بھی سمجھائیں۔ پھر اگر ان باتوں کے باوجود سلطان نے یہاں ٹھہرنا قرین مصلحت سمجھا تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے محل کا ایک حصّہ ان کے لیے خالی ہو گا اور اگر انہیں ایک مہمان کی حیثیت میں یہاں ٹھہرنا پسند نہ ہو تو ہم انہیں یہ اجازت دے دیں گے کہ وہ اس ملک کے غیر مفتوحہ حصّوں میں سے جو علاقہ چاہیں فتح کر لیں۔ ہم درپردہ ان کی مدد کریں گے اور تاتاریوں کو دور رکھنے کے لیے ان پر ظاہر کریں گے کہ سلطان ہماری مرضی کے بغیر اس ملک میں گھُس آیا ہے۔"

طاہر نے کہا۔ ”میں آج ہی سلطان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور چند دنوں تک سلطان کا جواب آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔“

شمس الدّین التمش نے کہا۔ ”بہتر یہ ہو گا کہ آپ سلطان کو مکتوب میں یہ تمام باتیں لکھ بھیجیں اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سلطان کے پاس روانہ کر دیں۔ عین المُلک نے ابھی سے ہمارے امراء کے ساتھ ساز باز شروع کر دی ہے۔ آپ سلطان کو لکھیں کہ یہاں عین المُلک کی موجودگی ہم دونوں کیلئے نقصان رساں ثابت ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اسے بلا لیں اور ہمارے پاس تیمور ملک کو بھیج دیں۔ وہ نیک نیّت بھی ہے اور معاملہ فہم بھی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم بہت جلدی فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔ سلطان کے پاس آپ اپنے ساتھیوں میں سے جس کو بھیجنا چاہیں اس کے لیے ڈاک کے گھوڑوں کا بندوبست کیا جائے گا اور زیادہ سے زیادہ تین دن میں سلطان کا جواب لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔“

اس ملاقات کے بعد طاہر کے دل میں سلطان التمش کے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں وہ سب دور ہو گئیں، اس نے مہمان خانے میں واپس آ کر

عین الملک کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور سلطان جلال الدّین کے نام مراسلہ لکھنے بیٹھ گیا۔

(۳)

اگلے دن طاہر شہر کی ایک مسجد میں صبح کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو دروازے کی سیڑھیوں پر کسی نے پیچھے سے اس کا دامن پکڑ لیا۔

"کون؟" طاہر نے پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

ایک نو عمر لڑکے نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے جانتے نہیں؟"

"اسماعیل!" طاہر نے اسے جھک کر گلے لگا لیا اور جذبات کے ہیجان میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "تم یہاں کب پہنچے؟ تمہارے نانا کہاں ہے؟ تمہاری نانی کیسی ہے؟ اور ثریا تمہاری بہن کہاں ہے؟"

"چلیے وہ سب گھر پر ہیں۔"

"کہاں؟"

"اسی شہر میں۔ بالکل قریب!"

طاہر کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے کہا۔ "مجھے یہاں ایک ہفتہ ہو گیا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو۔ مجھے بلخ کے قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ تم غزنی جا چکے ہو۔"

اسماعیل نے کہا۔ "کل رات میں نے آپ کو اسی مسجد میں دیکھا تھا لیکن میں دُور تھا، اچھی طرح پہچان نہ سکا اور جب میں نے آپ کا پیچھا کیا، آپ آدمیوں کے ہجوم میں باہر نکل گئے۔ میں نے آپا جان سے ذکر کیا تو انہوں نے جامع مسجد کے دروازے پر پہرہ دینے کے لیے کہا۔ چلیے!"

طاہر اسماعیل کے ساتھ چل دیا۔ منزلِ شوق کی طرف اس کی پاؤں کبھی تیز اور کبھی سست رفتار سے اُٹھ رہے تھے۔

وہ اسماعیل کے ساتھ ایک خوبصورت محل داخل ہوا۔ ثریا مکان کے صحن میں آم کے درختوں کے درمیان کھڑی تھی۔ طاہر اُسے دیکھ کر رُکتا، جھجکتا اور سنبھلتا ہوا آگے بڑھا اور چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ دونوں

کی نگاہیں ایک ثانیہ بھٹکنے کے بعد ایک دوسرے کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ خاموش تھے اور الفاظ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ان کے دل و دماغ سمٹ کر نگاہوں میں آ چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے انہیں دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کسی اور کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنوں کے سوا کارخانۂ حیات کے تمام ہنگامے سو چکے تھے۔

اسماعیل نے کہا۔ ”آپا پہچانا نہیں آپ نے؟ یہ بھائی طاہر ہیں!“

ثریا مُسکرائی اور ایک لمحہ توقف کے بعد آگے بڑھ کر اسماعیل کو گلے لگا کر بولی۔ ”میرے خیال میں تم نے انہیں پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ یہ شاید کوئی اور ہیں۔“

اسماعیل نے پریشان ہو کر طاہر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”خدا کی قسم یہ وہی ہیں؟“

ثریا ہنسی اور طاہر کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھوں میں مسرت کے آنسو

چھپاتی ہوئی مکان کی طرف چل دی۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر وہ چلنے کی بجائے بھاگ رہی تھی۔

"نانی جان وہ آ گئے۔" اس نے ایک دروازے پر رُک کر کہا۔ باہر اسماعیل حیران ہو کر طاہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ ذرا دبلے ہو گئے ہیں۔ شکل تو بالکل وہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ آپا آپ کو نہیں پہچان سکیں۔ آپ میرے ساتھ اندر چلیں۔ نانا جان آپ کو ضرور پہچان لیں گے۔" اسماعیل نے یہ کہتے ہوئے طاہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

طاہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر انہوں نے بھی نہ پہچانا تو؟" اسماعیل نے پھر ایک بار غور سے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں۔ آپ کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پیشانی پر زخم کا ایک نشان ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نانا جان یقیناً آپ کو پہچان لیں گے۔"

اتنی دیر میں شیخ عبدالرحمان باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ چند نوکر اس کے

ساتھ تھے اور وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”سخت نالائق ہو تم! مہمان باہر کھڑا ہے اور تم نے مجھے خبر تک نہیں دی اور وہ دیکھو، اسماعیل بھی کتنا احمق ہے۔ نہ معلوم یہ کب سے وہاں کھڑے ہیں۔“

طاہر نے آگے بڑھ کر شیخ عبدالرحمن سے مصافحہ کیا۔ شیخ اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے ایک میل دوڑ کر آیا ہو۔

اس نے کہا۔ ”آیئے اندر چلیے۔ آپ باہر کیوں کھڑے تھے؟“

اسماعیل نے کہا۔ ”نانا جان! پہچانا آپ نے یہ کون ہیں؟“

”چُپ نالائق۔“

شیخ طاہر کا بازو پکڑ کر مکان کی طرف چل دیا۔ برآمدے کے سامنے سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا لیکن طاہر نے اسے بروقت تھام لیا۔ اسماعیل ہنستا ہوا بھاگ کر ستون کے پیچھے چھپ گیا۔

شیخ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”یہ سنگ مرمر کی سیڑھیاں بہت خطرناک

ہیں۔ میں چوتھی بار یہاں سے پھسلا ہوں۔ اسماعیل کہاں گیا؟ وہ نالائق یقیناً یہیں چھپ کر ہنس رہا ہو گا۔ ابے صابر! شوکت! آج ہی معماروں کو بُلاؤ اور انہیں کہو کہ یہ سنگ مرمر اکھاڑ کر کوئی کُھردرا پتھر لگا دیں۔ لیکن ٹھہرو! ابھی نہیں پھر سہی۔"

(۴)

شیخ نے طاہر کو ایک خوش نما کمرے میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے متعلق مایوس ہو چکا تھا۔ میں تم سے کئی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہاں! پہلے یہ بتاؤ کہ تم دہلی کیسے آئے؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم بلخ جلد پہنچو گے۔ پھر اتنی دیر کیوں لگائی؟"

طاہر نے ان سوالات کے جواب میں مختصر طور پر اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ شیخ نے کہا۔ "اب دوبارہ بھاگنے کا ارادہ تو نہیں؟"

"میں جلال الدّین کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر اسے یہاں سے کوچ کرنا پڑا تو مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑے گا لیکن فی الحال کم از کم ایک ہفتہ میں

یہیں ہوں۔"

"میں عنقریب دہلی چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔"

"آپ کہاں جائیں گے؟"

"مدینہ، بغداد یا دمشق۔ ثریا مدینے جانے پر مُصِر ہے۔ لیکن میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا۔ تمہارے خیال میں کون سا شہر زیادہ محفوظ ہے؟"

"مدینہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔"

"تمہارا گھر بھی وہیں ہے نا؟"

"جی ہاں! مدینے کے بالکل قریب۔ اگر آپ میرے گھر ٹھہرنا قبول فرمائیں تو میں اپنے نوکر کو آپ کے ساتھ بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔"

"شکریہ! لیکن میں دو سال قبل مدینے میں ایک باغ اور ایک مکان خرید چکا ہوں۔ میں نے اپنے دو ملازم دمشق اور بغداد بھیج دیے ہیں۔ انہوں نے وہاں بھی میرے لیے مکان خرید لیے ہوں گے۔ اب ایک بات کا

فیصلہ باقی ہے اور وہ یہ کہ تم اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے یا سرِ دست اس کا ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟" "میری بیوی؟" طاہر نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں ہاں! تمہاری بیوی۔ میرا مطلب ہے شادی کے بعد؟"

شیخ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ عقبی کمرے کا دروازہ کھلا اور شیخ کی عمر رسیدہ بیوی اندر داخل ہوئی۔ طاہر نے اُٹھ کر سلام کیا اور اس نے پیار اور شفقت سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ بیٹا۔"

شیخ نے کہا۔ "ہاں! میں کیا کہہ رہا تھا؟"

حنیفہ نے غصّے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ شاید یہ کہہ رہے تھے کہ اب کسی تاخیر کی بغیر ثریا اور ان کی شادی کر دی جائے۔"

"نہیں نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ثریا کا ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں گے یا اپنے ساتھ لے جائیں گے؟"

”بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب تک یہ جنگ سے فارغ نہیں ہونے ثریا ہمارے سوا اور کہاں رہ سکتی ہے؟“

”یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ شادی کرنے کے بعد اگر یہ ثریا کو اپنے ساتھ لے جانے کا خیال رکھتے ہوں تو ان کا ارادہ تبدیل کر دوں۔“

”لیکن ابھی تک آپ نے یہ فیصلے نہیں کیا کہ شادی کب ہو گی؟“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“

حنیفہ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ ”کب؟“

”رات کو جب اسماعیل نے یہ بتایا تھا کہ اس نے مسجد میں انہیں دیکھا ہے، میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا بلکہ میں نے قسم اُٹھائی تھی کہ اگر یہ مل گئے تو میں فوراً ان کی شادی کر دوں گا۔ اب اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آج ہی قاضی کو بلاتا ہوں؟“

طاہر نے حیا سے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

حنیفہ نے کہا۔ ”لیکن تیاری کرنے اور لوگوں کو دعوت کی اطلاع دینے میں کم از کم دو دن ضرور لگ جائیں گے۔“

شیخ نے کہا۔ ”دو دن ؟ تم اس دن سے تیاری میں مصروف ہو، جس دن طاہر بلخ سے روانہ ہوا تھا۔ دعوت کے لیے تم کہو تو میں شام سے پہلے پہلے سارا شہر یہاں جمع کر سکتا ہوں۔“

”لیکن کم از کم دو دن پہلے تو اطلاع ہونی چاہیے۔ شہر کے امراء کی کئی لڑکیاں ثریا کی سہیلیاں بن چکی ہیں اور انہیں کم از کم ایک دن پہلے بلانا چاہیے۔“

شیخ نے ایک طویل بحث کے بعد ہار مانتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھا پرسوں ہی سہی۔ پرسوں صبح نکاح ہو گا۔“

(۵)

کھانا کھانے کے بعد شیخ نے طاہر کو اپنے پاس ٹھہرانے کے لیے اصرار کیا لیکن طاہر نے کہا۔ ”نہیں۔ اس وقت مجھے اجازت دیجیے۔ شاہی مہمان خانے میں میرے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ شام کو آجاؤں گا۔“

شیخ سے اجازت لے کر طاہر کمرے سے باہر نکلا تو بر آمدے میں اسماعیل منتظر کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ جا رہے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر اور ٹھہر جاتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا۔ استاد نے کہا کہ سبق ختم کیے بغیر چھٹی نہیں ملے گی۔“

شیخ اسماعیل کی آواز سن کر باہر نکل آیا اور بولا۔ ”جاؤ بیٹا! اپنا سبق ختم کرو۔ یہ شام کو آجائیں گے۔“

اسماعیل نے کہا۔ ”شاید یہ راستے سے واقف نہ ہوں!“

شیخ نے کہا۔ ”دیکھا آپ نے، یہ ہر ایک کو اپنے مقابلے میں کم عقل سمجھتا ہے۔“

طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسماعیل! تم جا کر سبق پڑھو۔ میں شام کو آ جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں سیر کے لیے جائیں گے۔“

اسماعیل بادل نخواستہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور طاہر مکان سے نکل کر پائیں باغ میں داخل ہوا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ راستے سے ایک طرف آم کے گھنے درختوں کے درمیان ایک چھوٹے سے حوض میں فوّارہ چھوٹ رہا تھا۔ راج ہنس کا ایک جوڑا پانی میں تیر رہا تھا اور ثریا سنگ مرمر کی پٹڑی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ طاہر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے رُکا اور وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ جا رہے ہیں؟“ ثریا نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ وہ اب طاہر کی طرف دیکھنے کی بجائے آنکھیں نیچی کیے ہوئے تھی۔ طاہر نے اپنا راستہ چھوڑ کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ ”میں شاہی مہمان خانے میں اپنے دوستوں کے پاس جا رہا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا۔“

”اسماعیل کو آپ کے ساتھ بھیج دوں؟“

"نہیں۔ وہ سبق یاد کر رہا ہے۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے۔"

"بات یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔" طاہر سوچ میں پڑ گیا۔

ثریا نے اس کی طرف چونک کر دیکھا اور کہا۔ "کہیے! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ یہ بات شروع کس طرح کروں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ آج شام یا کل صبح کوئی وقت نکالیں۔ اس کے لیے فرصت اور تنہائی کی ضرورت ہے۔"

"اگر کوئی بات اس قدر اہم ہو میں ابھی سُننا چاہتی ہوں۔ شام تک ممکن ہے میری چند سہیلیاں آ جائیں اور مجھے ان کی وجہ سے تنہائی نصیب نہ ہو۔"

"پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ خفا ہونے سے پہلے میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گی؟"

"اگر کوئی ایسی بات ہے جس سے آپ میرے خفا ہو جانے کا خدشہ محسوس کرتے ہیں تو آپ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہہ دیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں خفا نہیں ہوں گی۔"

طاہر نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ بلخ سے بغداد پہنچنے کے بعد میرے ساتھ چند ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں جن کا شادی سے پہلے آپ کے ساتھ ذکر کرنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔"

ثریا نے حیرت زدہ ہو کر طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیے بلخ سے بغداد جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"مجھے معلوم نہ تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

"آپ گھبرائیں نہیں، میں سمجھ گئی، میں آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف کسی گذشتہ فیصلے کا پابند رہنے پر مجبور نہیں کروں گی۔"

”دیکھا، آپ کو ابھی سے غلط فہمی ہو گئی۔ میں صرف اس لیے آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کل آپ کو یہ شکایت نہ ہو کہ آپ نے بے خبری میں اپنے مستقبل کے متعلق کوئی غلط فیصلہ کیا تھا۔“ ثریا نے کہا۔ ”دنیا میں صرف آپ ہیں جس سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کے تذبذب سے مجھے بے چینی ضرور ہوئی ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ بغداد پہنچ کر آپ کو کیا واقعات پیش آئے۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ آپ سے جو کچھ ہوا ہو گا، وہ صحیح ہو گا۔ اگر آپ مجھ سے یہ بھی کہیں کہ آپ کسی اور سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے تو خدا شاہد ہے کہ مجھے آپ سے شکایت نہ ہو گی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرے ہیں۔ اگر وہ کوئی ایسی ہے جسے آپ کی محبت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں تو میں آپ کو شادی کے لیے مجبور نہ کروں گی اور اگر آپ اس لیے بات کرنے سے گھبرا رہے ہیں کہ میں اپنی محبت میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کروں گی تو مجھے یقیناً اس بات کا افسوس ہو گا کہ آپ نے میرے متعلق غلط رائے قائم کی۔“

”لیکن تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں شادی کر چکا ہوں؟“

آپ کی بجائے تم سن کر ثریا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ بولی۔ ”تو پھر اس کے سوا آپ اور کیا کہنا چاہتے کہ میرے علاوہ ایک اور لڑکی بھی ہے جسے آپ مایوس نہیں کرنا چاہتے!“

”اچھا فرض کرو میں یہی کہنا چاہتا ہوں تو؟“

”تو کیا؟“

”تو تم کیا جواب دیتیں؟“

”میں جواب دینے سے پہلے آپ سے کئی سوالات پوچھتی۔“

”کیسے سوالات؟“

”میں پوچھتی، وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟ آپ اس سے کب ملے؟ کیسے ملے؟ اس نے آپ سے کیا کہا؟ آپ نے کیا جواب دیا؟ آپ نے میرا ذکر کیا تو اس نے کیا کہا۔ وہ رحم دل ہے یا جھگڑالو ہے؟“ ثریا ہنسنے لگی۔

"ثریا سنو!" طاہر نے سنجیدہ ہو کر کہا اور وہ چپ چاپ دانتوں میں انگلی داب کر حوض کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز تبسم تھا۔

طاہر نے اپنے ساتھ صفیہ کی ابتدائی دلچسپی سے لے کر آخری ملاقات تک کے تمام واقعات بیان کر دیے۔

اختتام پر ثریا نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "لائیے وہ انگوٹھی کہاں ہے؟"

طاہر نے جیب سے انگوٹھی نکال کر ثریا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ثریا نے اپنی انگوٹھی اُتار کر صفیہ کی انگوٹھی پہن لی اور کہا۔ "مجھے معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو پریشان کیا۔ یہ لیجیے میری انگوٹھی اپنے پاس رکھیے اور جب وہ ملے اسے میری طرف سے پیش کر دیجیے اور میری طرف سے یہ بھی کہیے کہ میں اس کی ایک ادنیٰ خادمہ بن کر رہنا بھی اپنے لیے باعثِ فخر خیال کروں گی۔"

(٦)

طاہر کی شادی سے اگلے دن تیمور ملک دِلی پہنچا۔ لوگ اس کے سپاہیانہ کارنامے سُن چکے تھے۔ جب وہ شہر کے دروازے پر پہنچا تو امرائے سلطنت کے علاوہ شہر کے بہت سے لوگ اس کے اِستقبال کے لیے کھڑے تھے۔ جب وہ شاہی مہمان خانے کی طرف جا رہا تھا، ایک اچھا خاصا جلوس اس کے پیچھے تھا۔

طاہر نے تفصیل سے سلطان کے ساتھ گزشتہ ملاقاتوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک دن دیر سے یہاں تشریف لائے۔ ورنہ دعوتِ ولیمہ میں آپ بھی شریک ہو جاتے۔"

"کس کی دعوتِ ولیمہ؟"

"میری۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"

"کب کیسے؟ کہاں؟"

”کل۔ آپ کو یاد ہے بلخ کے راستے میں جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی، ایک لڑکی میرے ساتھ تھی اور آپ نے اس کی تقریر سن کر مجھے ایک نصیحت کی تھی۔ میں نے آپ کی اس نصیحت پر عمل کیا ہے۔“

”تو وہ بلخ سے یہاں پہنچ گئے؟ تم بہت خوش نصیب ہو!“

”میرا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ عبد الملک بھی آئے گا اور آپ دونوں میری شادی میں شریک ہو سکیں گے۔“

”عبد الملک بغداد روانہ ہو چکا ہے۔“

”کب؟“

”تمہاری مکتوب ملتے ہی سلطان نے مجلسِ شوریٰ طلب کی اور ہمارا متفقہ فیصلہ تھا کہ تمام اسلامی سلطنتوں میں ایلچی بھیج کر انہیں تاتاریوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دی جائے۔ سلطان کی خواہش تھی کہ تمہیں بھیجا جائے لیکن میں نے یہی رائے دی کہ تمہاری دہلی میں بھی ضرورت ہے۔“

طاہر نے کہا۔ ”لیکن میری طرح عبد الملک سے متعلق بھی خلیفہ کی رائے اچھی نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اسے جاتے ہی گرفتار نہ کر لیں۔“

تیمور ملک نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ سلطان کے ایلچی کی حیثیت سے گیا ہے۔ خلیفہ اس قدر رذالت کا ثبوت نہیں دے گا۔ سلطان نے باقی تمام اسلامی ممالک میں بھی اپنے ایلچی روانہ کر دیے ہیں۔“

ایک افسر نے اندر آ کر اطلاع دی۔ ”سلطان نے آپ کو ملاقات کے لیے بلایا ہے۔“

تیمور ملک نے اُٹھتے ہوئے طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”انشاء اللہ! میں واپس آ کر تمہاری شادی پر ایک تحفہ پیش کروں گا۔“

دوپہر کے وقت تیمور ملک سلطان سے ملاقات کر کے واپس آیا تو اس نے طاہر کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ”میں نے تمہیں ایک تحفہ پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم تاحکمِ ثانی دہلی میں رہو گے اور جب تک سلطان جلال الدّین ہندوستان میں ہیں تمہیں دوسرا

حکم نہیں دیا جائے گا۔ میں کل جا رہا ہوں۔ دہلی میں تم سلطان کے سفیر بن کر رہو گے۔ مجھے ڈر ہے کہ بعض ترک سردار سلطان التمش کو ہمارے سلطان کے خلاف اکساتے رہیں گے لیکن تم نے چند ملاقاتوں میں سلطان پر جو اثر ڈالا ہے اس کے پیشِ نظر مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی میں کوئی شخص اس کا ارادہ تبدیل نہیں کر سکے گا۔ تم اپنا کام جاری رکھو اور سلطان، امراء اور عوام کو تاتاریوں کے خلاف متحدہ محاذ میں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ کرتے رہو۔ سلطان التمش یہ سن کر خوش ہوا تھا کہ اب تم خوارزم شاہ کے سفیر بنو گے۔ وہ تمہاری نیک نیتی اور خلوص سے بہت متاثر ہے۔"

شام کے وقت شیخ عبد الرحمان نے تیمور ملک کے اعزاز میں شہر کے معززین کو دعوتِ طعام دی۔ کھانا کھانے کے بعد تیمور ملک نے کہا۔
"طاہر! میں تمہاری بیوی کے لیے بھی ایک تحفہ لایا ہوں۔"

حاضرین گہری دلچسپی کے ساتھ تیمور ملک کی طرف دیکھنے لگے۔ تیمور ملک نے اپنے گلے سے حمائل اتار کر طاہر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی کے لیے میں اس سے بہتر تحفہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میرے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔“

دہلی میں چند دن اور رہنے کے بعد طاہر کو سلطان التمش کی پریشانیوں کی وجوہات معلوم ہوئیں۔ التمش نے دہلی کا تخت و تاج اپنے آقا قطب الدّین ایبک کی وفات کے بعد اس کے لائق بیٹے سے زبردستی حاصل کیا تھا۔ ترک امراء بالخصوص ایبک اس کی کامیابی پر خوش نہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہ کہتا تھا کہ دہلی کے تخت پر التمش کی نسبت اس کا اپنا حق زیادہ ہے۔ سرکش امراء کو التمش کے آہنی ہاتھ مغلوب کر چکے تھے لیکن شمال مغرب سے اسے تاتاریوں کا خطرہ تھا اور جنوب میں راجپوت منظم ہو رہے تھے۔ ان حالات میں التمش کا یہ خدشہ بے جا نہ تھا کہ اگر تاتاریوں یا راجپوتوں کے ساتھ لڑائی کی نوبت آگئی تو اس کی فوج کے بعض ترک سردار جو ابھی تک مطمئن نہیں ہوئے، اس کے دشمنوں کے ساتھ جا ملیں گے۔

جب عین الملک نے دہلی میں پہنچ کر سلطان کے باغی امراء کے ساتھ ساز

باز شروع کر دی تو التمش کو ایک نئے خطرے کا احساس ہوا۔ تیمور ملک سلطان سے ملاقات کے بعد عین الملک کے ساتھ بہت سختی سے پیش آیا۔ رخصت سے پہلے وہ چند سر کردہ امراء سے ملا اور انہیں مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد متفق اور متحد رہنے کی ہدایت کی۔

تیمور ملک کے جانے کے بعد طاہر نے امراء کو متحد کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ چند دنوں میں سلطان کے مخالفین میں سے اکثر امراء نے طاہر کی تقریروں سے متاثر ہو کر یہ حلف اٹھایا کہ وہ خطرے کے وقت سلطان کے ساتھ بے وفائی نہیں کریں گے۔ اس کے بعد طاہر عوام کی طرف متوجہ ہوا۔ دہلی کی مساجد میں اس کی چند تقریروں کے بعد باقی چند امراء نے بھی محسوس کیا کہ اگر وہ الگ تھلگ رہے تو رائے عامہ ان کے خلاف مشتعل ہو جائے گی اور سلطان آسانی سے ان کی سر کوبی کر سکے گا۔ چنانچہ وہ بھی سلطان سے وفاداری کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے۔ طاہر کی ان کامیابیوں کی ایک بڑی وجہ ثریا کی کوششیں تھیں۔ دہلی میں طاہر کی بیوی بننے سے قبل اسے امراء کی بہو بیٹیاں صرف ایک مالدار تاجر کی

حسین بیٹی کی حیثیت سے جانتی تھیں۔ لیکن اس کی شادی میں سلطان اور ملکہ کی شرکت نے اسے تمام بڑے بڑے خاندانوں کی توجہ کا مستحق بنا دیا۔ اب انہیں ثریا کی زندگی کے کئی اور روشن پہلو نظر آنے لگے۔ عورتوں کی محفل میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ جہاں چار عورتیں جمع ہوتیں گفتگو شروع ہو جاتی۔

ایک کہتی۔ ”میں نے سنا ہے کہ اس کا نانا ایک سیدھا سادا تاجر ہے جو صرف روپے کمانا جانتا ہے۔“

دوسری کہتی۔ ”لیکن اس کی نانی بڑی ہوشیار ہے۔ کئی امراء کی بیویاں یہاں تک کہ وزیر اعظم کی بیوی بھی اسے بڑی امّاں کہہ کر پکارتی ہے۔ جو باتوں سے اس کی معترف نہیں ہوتی، وہ اسے کوئی تحفہ دے کر خرید لیتی ہے۔ میں نے سنا ہے، ملکہ کو بھی اس نے جواہرات کا ایک ہار پیش کیا تھا۔“

”اسی لیے تو ملکہ نے بھی ثریا کی شادی پر زیورات سے بھری ہوئی ایک

صندوقچی پیش کی تھی۔"

"میں نے سنا ہے کہ ثریا کا باپ کسی شہر کا حاکم تھا، تاتاریوں کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوا۔" "وہ بڑی خوش نصیب ہے۔ اس کے نانا کے پاس بے پناہ دولت ہے، باپ ایک بہادر سپاہی تھا اور شوہر سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ کا سفیر اور ہمارے ملک کے سلطان کا گہرا دوست ہے۔ کہتے ہیں وہ صورت سے بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آواز میں جادو ہے۔"

دہلی کے با اثر امراء کو متحد کرنے کی مہم میں طاہر کے ساتھ شریک ہو کر ثریا نے جو کامیابی حاصل کی، اس کے باعث اب وہ طاہر کی بیوی اور شیخ کی بیٹی ہونے سے زیادہ قوم کی ایک قابلِ احترام بیٹی کی حیثیت میں پہچانی جاتی تھی۔

اس نے ایک دن شہر کے معزّز گھرانوں کی عورتوں کو اپنے مکان پر کھانے کی دعوت دی اور ان کے سامنے تاتاریوں کے مظالم بیان کرنے

کے بعد یہ اپیل کی کہ وہ مردوں کو خوابِ غفلت سے جگائیں ورنہ وحشت وبربریت کا طوفان ہمسایہ ممالک کو تباہ وبرباد کرنے کے بعد ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اجتماعی خطرے کے مقابلے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ثریا نے انہیں سمجھایا کہ اگر قوم کی عورتیں فرض شناسی کا ثبوت دیں تو مردوں میں سے کسی کو غدّاری کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بیویاں اپنے شوہروں کو، بہنیں بھائیوں کو اور مائیں اپنے بیٹوں کو قوم کا ساتھ دینے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ صرف مردوں کا اتحاد اور ایثار قوم کی بہو بیٹیوں کی حفاظت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

ثریا نے ہندوستان کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اگر سلطان اور امراء کے اختلافات کم نہ ہوئے تو تاتاریوں کی شہ پاتے ہی ہمارے خلاف اس ملک کے کروڑوں غیر مسلم اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ثریا کی تقریر اس قدر مؤثر تھی کہ تمام خواتین نے اپنے اپنے گھر کے

مردوں کو سمجھانے کا عہد کیا۔ یہ ابتدا حوصلہ افزا تھی۔ اس کے بعد ہر محلے کی عورتیں ثریا کو تبلیغ کی دعوت دینے لگیں۔ تقریباً ہر شام کی نہ کسی عورت کے گھر میں جلسہ ہوتا اور ثریا وہاں تقریر کرتی۔

شیخ عبدالرحمن نے طاہر کی موجودگی میں دہلی چھوڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ سندھ ساگر کے علاقے میں ڈیرہ ڈال کر باہر کی اسلامی سلطنتوں سے اپنی اپیل کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

طاہر اور ثریا نے چند ہفتوں میں دہلی کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے سلطان التمش کی درخواست پر اس کی مملکت کے دوسرے شہروں کا رُخ کیا۔ ان کی شہرت ہمیشہ ان سے ایک منزل آگے رہتی۔ ہر شہر میں ان کا نہایت شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ ثریا عورتوں کو تبلیغ کرتی اور طاہر مردوں میں حرارتِ ایمانی زندہ کرتا۔ وہ مساجد میں تقریریں کرتا، فوجی چوکیوں میں جا کر سپاہیوں کی پریڈ دیکھتا اور ان کے ساتھ تیغ زنی، تیر اندازی اور نیزہ بازی کی مشق میں شریک ہوتا۔

الفاظ اور کردار کا غازی جب کئی مہینوں کے دورے کے بعد واپس دہلی پہنچا تو سلطان التمش نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے یقین ہے کہ میں دریائے سندھ سے لے کر کوہ بندھیاچل تک تمام سرکشوں کو مغلوب کر سکوں گا۔ اب تاتاریوں نے ہندوستان کا رخ کرنے کی جرأت کی تو انشاء اللہ ان میں سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا۔“

چند دنوں کے بعد سلطان جلال الدّین کے ایلچی نے دہلی پہنچ کر یہ خبر دی کہ خلیفہ کی طرف سے اپنی درخواست کا حوصلہ افزا جواب سن کر سلطان ہندوستان کی بجائے بغداد کو اپنا مرکز بنانا بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خبر سنانے کے بعد ایلچی نے طاہر کو تیمور ملک کا مکتوب پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

”خلیفہ سے اپنا پیغام کا حوصلہ افزا جواب موصول ہونے پر سلطان نے بغداد جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم چند دنوں میں ملتان پہنچ جائیں گے۔ سلطان کا حکم ہے کہ تم بھی وہاں پہنچ جاؤ۔ سلطانِ معظّم سندھ اور مکران کے راستے بغداد پہنچیں گے۔ سلطان شمس الدّین التمش کو یہ پیغام پہنچا دو کہ بغداد پہنچ کر ہم مصر، شام اور عرب کے ممالک سے اعانت حاصل

کرنے کے بعد انہیں اپنے ارادوں سے باخبر کر دیں گے۔ اس وقت تک وہ اپنی کمانیں درست اور تلواریں تیز کر چھوڑیں۔"

طاہر تیمور ملک کا مکتوب لے کر ثریا کے کمرے میں داخل ہوا۔ ثریا نے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "ایلچی کیا پیغام لایا ہے؟"

طاہر نے اس کے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے کہا۔ "تم خود پڑھ لو۔"

ثریا نے خط پڑھنے کے بعد اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "آپ نے کب جانے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"کل یا پرسوں۔"

"لیکن آپ کچھ پریشان ہیں۔ میری فکر نہ کیجیے۔"

"ثریا! اس میں شک نہیں کہ تم سے جدا ہونا میرے لیے آسان نہیں۔ لیکن میری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں؟"

”بات یہ ہے کہ میں خلیفہ کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ سلطان کا بغداد جانا ان کے لیے تکلیف دہ ثابت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے خلیفہ کے متعلق غلط رائے قائم کی ہو لیکن امرائے سلطنت میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی وقت بھی خلیفہ کو غلط راستے پر ڈال سکتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تاتاری بغداد کے کئی سرکردہ لوگوں کو خرید چکے ہوں گے۔“

ثریا نے کہا۔ ”لیکن عبد الملک کے متعلق آپ کی رائے تھی کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو وہ یقیناً سلطان کو بغداد جانے کا مشورہ نہ دیتا۔“

طاہر نے کہا۔ ”خدا کرے کہ ان کی نیک نیتی کے متعلق عبد الملک کا اندازہ غلط ثابت نہ ہو۔“

شام کے وقت جب شیخ کو طاہر کی تیاری کا علم ہوا تو اس نے بتایا کہ میں صرف تمہاری موجودگی کی وجہ سے دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اب میں مدینے

کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے حج کے بعد دمشق یا کسی اور جگہ جانے کا فیصلہ کروں گا۔

حنیفہ نے طاہر کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! جب تک تم واپس نہیں آؤ گے، ہم مدینے میں ہی قیام کریں گے۔ ہم تمہارا گھر بھی دیکھیں گے۔“

طاہر نے کہا۔ ”میں زید کو آپ کے پاس چھوڑ جاتا ہوں۔ وہ آپ کو ہمارے گھر لے جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کم از کم کچھ عرصہ کے لیے ان کے مہمان بننا قبول کریں گے۔“

حنیفہ نے کہا۔ ثریا نے اگر پسند کیا تو ہم اسے وہیں چھوڑ جائیں گے۔“

شیخ نے کہا۔ ”ثریا نے مجھ سے کہا ہے کہ سلطان جلال الدّین کو فوج کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ سمرقند اور بخارا میں میرا بہت نقصان ہوا ہے۔ تاہم میں ایک لاکھ دینار دیتا ہوں۔ تم یہ سلطان کے پاس پہنچادو۔“ سلطان التمش نے بھی اس کی مدد کے لیے مجھ سے کہا تھا۔

رُخصت کی دن سلطان التمش نے جلال الدّین کی مدد کے لیے اشرفیوں کا

ایک صندوق دیا اور طاہر کو ملتان تک پہنچانے اور صندوق کی حفاظت کے لیے سواروں کا ایک دستہ اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔

بد عہدی

راستے میں کرمان، اصفہان اور دوسرے مقامات کے امراء تاتاریوں کی حوصلہ افزائی سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ سلطان جلال الدّین نے آئندہ کے لیے اطاعت اور فرماں برداری کا وعدہ لے کر ان کی گزشتہ خطائیں معاف کیں اور جنگ کے لیے تیاری کا حکم دے کر بغداد کا رُخ کیا۔

بغداد سے واپس آ کر عبد المُلک سلطان کو یقین دلا چکا تھا کہ تاتاریوں کا خطرہ بغداد سے بہت قریب دیکھ کر خلیفہ کا خط بھی بہت حوصلہ افزا تھا لیکن طاہر، تیمور ملک اور سلطان کے چند اور ساتھی پوری طرح مطمئن نہ تھے۔

تیمور ملک نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ چند دن بغداد کی حدود سے باہر قیام کریں اور چند آدمیوں کو بغداد بھیج کر تازہ حالات معلوم کریں، ممکن ہے کہ خلیفہ آپ کو دور رکھ کر مدد کیلئے تیار ہو لیکن ایسے آپ کا بغداد میں داخل ہونا گوارا نہ ہو۔

اس قسم کے تمام اعتراضات کے جواب میں سلطان نے کہا۔ ”خلیفہ نے دشمن کے مقابلے میں ایک ہو جانے کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ انہوں نے ہمارے مکتوب کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ دوسرے سلاطین کو متحد ہوتا دیکھتے ہی اپنی افواج ہماری مدد کے لیے بھیج دیں گے اور دوسرے سلاطین نے ہماری مدد کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ انہیں خلیفہ کے تعاون کا یقین دلایا جائے۔ اس صورت میں ہمارے لیے یہی راستہ ہے کہ ہم بغداد چلے جائیں اور خلیفہ کی طرف سے شام، مصر اور مراکش کے سلاطین کے نام یہ پیام بھجوائیں کہ جہاد میں انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر خلیفہ کی نیّت صاف نہ بھی ہو تو بھی ہمیں یقین ہے کہ وہ بغداد میں ہم پر ہاتھ نہیں اٹھا سکے گا۔ اگر رائے عامہ کے خوف

سے ایک عرصہ کے لیے وہ طاہر اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیاں نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گئے تھے تو ہمارے خلاف بھی وہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکیں گے کہ ہمیں ایک کر کے بغداد چھوڑنے پر مجبور کیا جائے اور ہمیں اس کی پروا نہیں لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ خلیفہ سے پہلی ملاقات میں ہیں ہم ان کے تمام شبہات دور کر دیں گے، ہم ان سے کہیں گے کہ آپ ہمارے باپ کی غلطیاں معاف نہیں کر سکتے تو ہمیں سزا دے لیجیے۔ لیکن مسلمانوں کو تاتاریوں کی غلامی سے بچایئے! ہمیں خوارزم کا سلطان سمجھنے کی بجائے ایک ایسا انسان سمجھئے جو اسلام کی ناموس کے لیے آپ کے جھنڈے تلے ایک سپاہی کی حیثیت میں لڑنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔"

طاہر نے کہا۔ "ان سب باتوں کے باوجود اگر آپ برا نہ مانیں تو میری رائے یہی ہے کہ آپ مجھے اور عبد الملک کو بغداد بھیج دیں۔ ہم چند دنوں میں حالات کا جائزہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ خلیفہ اور ان کے حکام جو سلوک ہمارے ساتھ کریں گے، اس سے ان کی نیّت

ظاہر ہو جائے گی۔ اگر ہم واپس نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں آپ کی طرف داری کے جرم کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور آپ کے متعلق بھی ان کا ارادہ نیک نہیں اور اگر ہم واپس آ گئے تو آپ کو بغداد کے تمام حالات سے آگاہ کر سکیں گے۔"

سلطان جلال الدّین نے اس رائے سے اتفاق کیا اور طاہر، عبد الملک اور مبارک کو بغداد جانے کی اجازت دے دی۔ طاہر کے ساتھ بغداد سے آئے ہوئے رضاکاروں میں سے تیس نوجوانوں کو بھی چند دنوں کے لیے بغداد جانے کی اجازت مل گئی۔

(۲)

شام کے وقت بغداد کے وزیر اعظم نے صفیہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! پورے دس سال خلیفہ کی خدمت کرنے کے بعد مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا اور نہ ہی مجھے امید ہے کہ کوئی مجھ پر اعتبار کرتا ہو گا۔ میرا سب سے بڑا گناہ شاید یہ تھا کہ بعض

معاملات میں خدا کی مرضی کے خلاف خلیفہ کے اشاروں پر چلتا رہا لیکن عالمِ اسلام پر عبرت ناک تباہی لانے کے لیے میں خلیفہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سنو! جلال الدّین خوارزم شاہ خلیفہ سے اعانت کی توقع پر بغداد آرہا ہے۔ میرے اصرار پر خلیفہ نے اسے ایک حوصلہ افزا خط لکھا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرا یہ فعل شاید میری گزشتہ تمام غلطیوں کا کفّارہ ہو سکے گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو ہماری بھلائی منظور نہیں۔ آج وہ منافق اور غدار مہلب بن داؤد تاتاریوں کا خاص ایلچی بن کر بغداد پہنچ گیا ہے۔ اس کے ساتھ چند تاتاری سردار بھی ہیں۔ خلیفہ تاتاریوں سے پہلے ہی مرعوب تھا، مہلب نے اس کے رہے سہے اوسان خطا کر دیے ہیں۔ خلیفہ کو اس نے سمجھایا ہے کہ اگر تم جلال الدّین کو پکڑوا کر تاتاریوں کے حوالے کر دو تو بغداد تباہی کی آگ سے بچ جائے گا اور چنگیز خان کے جانشین تمہیں ہمیشہ عزّت و احترام سے دیکھیں گے۔ خلیفہ کی تسلّی کے لیے تاتاریوں سے انعام کی توقع میں چند مفتیوں نے بھی یہی فتویٰ دے دیا ہے کہ تاتاریوں کو خُدا نے زمین کے وسیع حصّے پر حکومت عطا کی ہے۔ ان کی مخالفت خدا کی مرضی سے بغاوت ہے اور

جلال الدّین کے مذہبی عقائد درست نہیں۔ اس لیے بغداد کے لوگوں پر اس کی اعانت فرض نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مہلب چند دن پہلے سے یہاں سرگرمِ عمل تھا لیکن مجھے اس کی آمد کا صرف اس وقت پتہ چلا جب وہ چند تاتاری سرداروں کے ساتھ خلیفہ کے دستر خوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ میں نے خلیفہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن مہلب کی باتوں سے متاثر ہو کر خلیفہ خدا سے زیادہ تاتاریوں سے ڈرتا ہے۔ آج رات پھر خلیفہ نے مجھے اور فوج کے چند عہدیداروں کو ملاقات کی دعوت دی ہے اور مجھے امید ہے کہ آج خلیفہ کے محل میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ سلطنت کے بڑے بڑے عہدیداروں میں سے کوئی بھی خوارزم شاہ کی مدد کر کے تاتاریوں کی دشمنی مول لینے کے حق میں نہیں۔ لیکن میں آخری فرض ادا کروں گا۔ آج میں قاسم کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں لیکن وہ بہت دور ہے۔ میں تمہیں ایک بڑا کام سونپ کر جا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ خلیفہ کو ناراض کر کے بہت کم لوگ اس کے محل سے زندہ نکل کر اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ شاید میرا انجام بھی ان سے مختلف نہ ہو۔ اگر میں آدھی رات تک گھر نہ آسکوں تو تم سعید کو بلا کر

یہ خط اس کے حوالے کر دو۔ اور اسے یہ ہدایت کرو کہ وہ جس قدر جلدی ممکن ہو اسے جلال الدّین کے پاس پہنچا دے کیونکہ اگر خلیفہ نے جلال الدّین کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ آج رات ہی فوج بھیج دے گا اور مجھے وہ افشائے راز کے ڈر سے گھر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں نے سعید کو سمجھا دیا ہے۔ وہ طاہر کے پرانے رفقاء میں سے چند نوجوانوں کو جمع کر کے اس پُل کے قریب میرے حکم کا انتظار کرے گا۔ ابھی تک میں نے اسے نہیں بتایا کہ اسے کس مہم کے لیے بھیجا جائے گا اور ضرورت کے بغیر میں ایسا اہم مراسلہ اس کے سپرد کرنا بھی نہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ خلیفہ میری بات مان لے اور جلال الدّین کو یہ مراسلہ بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے۔ بہر حال اگر میں آدھی رات تک نہ آسکا تو بغداد کے وزیر اعظم کی زندگی کا آخری فرض اس کی بھتیجی پورا کرے گی سعید اور طاہر کے دوسرے ساتھی مجھ سے زیادہ تمہارا اعتبار کرتے ہیں۔“

صفیہ نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیے۔ میری طرف سے کوتاہی نہیں ہو گی۔“

وزیر اعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ اگر قاسم بھی یہاں ہوتا تو بھی شاید اس کام کے لیے میری نگاہ تم پر ہی پڑتی۔“

وزیر اعظم شاہی محل کی طرف چل دیا۔

(۳)

عشاء کی نماز سے تھوڑی دیر بعد وزیر اعظم کے محل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ محل کے تمام نوکر اس کے گرد جمع تھے۔ اس کے سینے اور پسلیوں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔

وزیر اعظم نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں سوال کیا۔ ”میں یہاں کیسے پہنچا؟“

ایک نوکر نے جواب دیا۔ ”آپ دروازے پہنچ کر گر پڑے تھے۔ ہم آپ کو یہاں اٹھالائے۔“

”اور وہ نوکر جو میرے ساتھ تھے؟“

ایک نوکر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مجھے معمولی زخم آئے ہیں۔ حامد قتل ہو گیا ہے؟“

”تم نے انہیں پہچانا؟“

”جی میں نے مہلب کو پہچان لیا تھا۔ جب آپ خلیفہ کے محل سے باہر نکلے تھے تو وہ آپ کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں سیڑھیوں سے پہنچ کر چند قدم کے فاصلے پر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپ نیچے اتر رہے تھے تو چار نقاب پوش آدمیوں نے درختوں کے سائے سے نکل کر آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ مُڑ کر دروازے کی طرف بھاگے لیکن مہلب نے آپ کا راستہ روک کر آپ پر خنجر کے دو تین دار کر دیے اور مدد کے لیے شور مچانا شروع کر دیا۔ حامد مجھ سے آگے تھا، اس نے مہلب پر حملہ کیا لیکن وہ ایک طرف ہو کر بچ گیا اور حامد ایک نقاب پوش کی تلوار سے گھائل ہو کر گر پڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک نقاب پوش کو مار گرایا۔ باقی تین نقاب پوش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک اور کو بھی گرا دیا۔ اتنی دیر میں خلیفہ کے محل کے سپاہی باہر نکل آئے اور مہلب نے جلدی سے

سیڑھیوں پر چڑھ کر کہا۔ سپاہی آرہے ہیں۔ بھاگ جاؤ۔ وہ بھاگ گئے تو میں آپ کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ وہاں سے محل کو رُخ کر رہے تھے۔ میں بھاگ کر آپ کے پاس پہنچا اور چند قدم آپ کے ساتھ چل کر اس خیال سے رک گیا کہ مبادا وہ آپ کا تعاقب کریں۔ جب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ آپ محل کے قریب پہنچ چکے ہیں تو میں بھی آ گیا۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "سعید کہاں ہے؟"

سعید نوکروں کو ادھر ادھر ہٹا کر وزیر اعظم کے بستر کے قریب آ کھڑا ہوا۔ وزیر اعظم نے اپنی بیوی، صفیہ، سکینہ اور سعید کے سوا باقی تمام نوکروں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔

جب کمرہ خالی ہو گیا تو اس نے سعید سے کہا۔ "تمہارے ذمہ جو کام ہے وہ صفیہ تمہیں بتا دے گی۔ تمہارے ساتھی تیار ہیں؟"

"جی ہاں!"

وزیر اعظم پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میرے بعد تمہارے لیے

بغداد چھوڑ کر مصر چلے جانا بہتر ہو گا۔ میں صرف تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔"

صفیہ نے کہا۔ "چچا میں نے ابھی تک آپ کو ایک بات نہیں بتائی۔ " "طاہر زندہ ہے۔ اور اگر آپ کا انتقام کسی اور نے نہ لیا تو وہ ضرور لے گا۔"

"بیٹی! سچ کہو، میرے دل میں ایک بہت بڑا بوجھ تھا۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ اسے مُردہ سمجھ کر دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ سعید کو بھی معلوم ہے۔"

وزیر اعظم نے جواب طلب نگاہوں سے سعید کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ "جی ہاں وہ زندہ ہے!"

وزیر اعظم نے صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صفیہ بیٹی! میرے جانے سے پہلے خلیفہ تیس ہزار سپاہی سلطان کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کر چکا تھا۔ اب تمھیں اپنا فرض پورا کرنا ہے وہ۔۔۔ آج رات کافی دور جا

چکے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ سکینہ! مجھے تمہارے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کبھی فرصت نہ ملے۔۔۔۔۔۔ آج میرے پاس بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔!"

سکینہ آنسو بہاتی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ وزیر اعظم نے چند ثانیے اس کی طرف دیکھنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور درد سے کراہنے لگا تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے پانی مانگا۔ سعید نے اس کی گردن کو ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور صفیہ نے پانی کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ سکینہ نے کہا۔ "انہیں غش آ گیا ہے۔"

سعید نے جلدی سے اس کا منہ کھولا اور صفیہ کو پانی ڈالنے کے لیے کہا۔ صفیہ نے اس کے منہ میں پانی ڈالا لیکن وہ حلق سے نیچے اترنے کی بجائے باچھوں سے باہر آ گیا۔ وزیر اعظم نے آنکھیں کھولیں اور چند بار اُکھڑے اُکھڑے سانس لینے کے بعد ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سکینہ اور چچی کو اس کی لاش کے ساتھ لپٹ کر روتے ہوئے چھوڑ کر صفیہ آنسو بہاتی ہوئی باہر نکل آئی سعید اس کے پیچھے تھا۔

”میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“ اس نے کہا۔

صفیہ نے جواب دیا۔ ”ٹھہرو! میں بھی آتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد صفیہ اپنے کمرے سے نکلی۔ اس نے سواری کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کی کمر سے تلوار لٹک رہی تھی۔ اس نے ایک خادمہ کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیتے ہوئے کہا۔ ”صبح یہ رقعہ سکینہ کو دے دینا!“

سعید حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”چلو سعید!“

”لیکن آپ ہمارے ساتھ جائیں گی؟“

”ہاں! میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ چچا نے کہا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری اور اہم ترین فرض ہے اور میں اسے پورا کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔“

”مجھے تم پر اعتبار ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ شاید تمہاری طرف سے کسی پیغام کو اہمیت نہ دیں۔ اس کے علاوہ مہلب مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں یہاں ٹھہر کر اس گھر کی سیاہ بختی میں اور اضافہ نہیں کروں گی۔“

(۴)

سورج نکلنے سے تھوڑی دیر بعد طاہر اور اس کے ساتھی ایک پہاڑی علاقے سے گُزر رہے تھے۔ ایک کشادہ وادی میں داخل ہوتے ہی انہیں سامنے کی پہاڑیوں سے آنے والی پگڈنڈی پر آٹھ دس سوار سرپٹ آتے ہوئے دکھائی دیے، جن کے پیچھے پچاس کے لگ بھگ سواروں کا ایک اور دستہ آ رہا تھا۔ طاہر غور سے دیکھنے کے بعد عبد المُلک کی طرف متوجہ ہوا۔ ”معلوم ہوتا ہے وہ بھاگنے والوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

عبد المُلک نے کہا۔ ”وہ پیچھے سے تیر بھی چلا رہے ہیں۔ وہ دیکھیے، ایک آدمی زخمی ہو کر گر رہا ہے۔ وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو کر ان کے گرد گھیرا

ڈال رہے ہیں اور وہ آٹھ دس آدمی صرف جان بچا کر بھاگنا چاہتے ہیں، لڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔"

طاہر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔ "جلدی! وہ ان کے نرغے میں آنے والے ہیں۔"

آن کی آن میں طاہر اور اس کے ساتھی پہاڑی سے اتر کر وادی میں پہنچ گئے۔ طاہر نے بلند آواز میں کہا۔ "عبد الملک! وہ دیکھو سب سے آگے شاید ایک عورت ہے۔ تم اس کے بائیں طرف سے گھیرنے والے سواروں کو روکو! میں دائیں طرف جاتا ہوں۔ وہ دونوں طرف سے ان کی تیروں کی زد میں آچکے ہیں۔ ان کے لیے ایک پگڈنڈی چھوڑ دو۔ اگر انہوں نے ہمیں بھی تعاقب کرنے والوں کا ساتھی سمجھ کر اِدھر اُدھر مُڑنے کی کوشش کی تو وہ مارے جائیں گے۔"

طاہر کے ساتھیوں نے دو حصّوں میں تقسیم ہو کر تعاقب کرنے والوں کا راستہ روک لیا اور بھاگنے والے انہیں اپنے مددگار سمجھ کر کچھ دور جانے

کے بعد رک گئے۔ طاہر نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں پوچھا ”تم ان لوگوں کا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟“

اس کے جواب میں تعاقب کرنے والوں میں سے ایک شخص نے جس کا سر اور چہرہ آہنی خود میں چھپا ہوا تھا اور اپنے لباس سے بغداد کی فوج کا افسر معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ خوارزم شاہ کے جاسوس ہیں۔ تم ہمارا راستہ مت روکو!“ ”تم خلیفہ کے سپاہی معلوم ہوتے ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ خلیفہ اور خوارزم شام کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہو چکا ہے۔“

”یہ باتیں ہم بہتر جانتے ہیں۔ تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ ہم تمہیں ہٹنے پر مجبور کر دیں گے۔“

”نہیں، جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ انہوں نے کیا جرم کیا ہے۔ ہم ان کی حفاظت کریں گے۔“

”ہمیں شک ہے کہ وہ خوارزم شاہ کے پاس جا رہے ہیں۔“

”تمھیں محض شک کی بنا پر لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور خوارزم شاہ کے پاس جانا جُرم نہیں۔“

”تو پھر مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ!“

طاہر نے جواب دیا۔ ”مسلمان کی جان بہت قیمتی ہے۔ بہتر یہی ہے واپس چلے جاؤ۔ تم تعداد میں پندرہ بیس زیادہ ہو لیکن میرے ساتھ وہ سپاہی ہیں جو کئی میدانوں میں اپنے بازو آزما چکے ہیں۔ ہم تمھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم خلیفہ کے دشمن نہیں۔ تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ میں ایک آدمی ان کی طرف بھیجتا ہوں۔ اگر وہ ہماری تسلّی نہ کر سکے تو ہم انہیں خود پکڑ کر بغداد لے جائیں گے۔“

طاہر نے عبدالملک کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کہا۔ ”آپ جا کر دریافت کیجیے، وہ کون ہیں؟“

فوجی افسر نے کہا۔ ”لیکن تم کون ہو؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ ہم مسلمان ہیں، تاتاری نہیں۔“

"اگر تم تاتاری ہوتے تو ہمارا راستہ کبھی نہ روکتے۔"

"خوف کے باعث یا دوستی کی وجہ سے؟" افسر نے قدرے تذبذب کے بعد گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہارا لہجہ اور تمہاری آواز کسی ایسے آدمی سے ملتے ہیں جسے میں جانتا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح ہر معاملے میں ٹانگ اڑایا کرتا تھا۔"

"شاید میری صورت بھی اس سے ملتی ہو اور بھی ہو سکتا ہے کہ میں ہی وہ آدمی ہوں۔"

"وہ مر چکا ہے۔"

"کبھی کبھی مردے بھی زندہ ہو جایا کرتے ہیں؟"

"تم بالکل طاہر بن یوسف کی طرح بولتے ہو۔"

"طاہر بن یوسف مر چکا ہے اور آج اس کا ایک دوست اس کا پیچھا کرتے کرتے ملک عدم کی حدود میں پاؤں رکھ چکا ہے۔ تمہاری آواز اور تمہارا

لہجہ ایک ایسے آدمی سے ملتا ہے جس نے عہدے کے لالچ میں اپنے دوستوں کو پکڑوانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"تم کون ہو؟"

"اگر تم دوستوں کو بھول جانے کے عادی نہیں تو شاید مجھے پہچان لو۔"

طاہر نے یہ کہتے ہوئے خود اُتار دیا۔

"طاہر۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔؟"

"ہاں۔ افضل کیا تم مجھے اپنی صورت نہیں دکھاؤ گے؟ ابھی تمہیں شک ہے تو ذرا آگے آجاؤ!"

"لیکن تمہیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں مجھے زہر دیا گیا تھا لیکن ہر زہر ہلاک نہیں ہوتا!" "طاہر خدا شاہد ہے کہ میں اس سازش میں شریک نہ تھا اور تمہیں پکڑوانے کے لیے میں نے کوئی سازش نہیں کی؟"

طاہر نے خود سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پکڑوانے کا موقع ہی نہ ملا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تم کس نیّت سے یہاں پہنچے ہو اور یہ لوگ جن کا تم پیچھا کر رہے ہو، کون ہیں؟“

”میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے میرا راستہ روک کر سپہ سالار کے احکام میں مداخلت کی ہے؟“

”سپہ سالار! وہ کہاں ہے؟“

”میں یہ نہیں بتا سکتا۔“

”تو تمہاری خیر اسی میں ہے کہ واپس چلے جاؤ۔“

”تم جانتے ہو کہ میں بُزدل نہیں۔“

”جب تک تم غدّار نہ تھے میری یہی رائے تھی لیکن غدّاری اور بہادری ایک ہی وجود میں جمع نہیں ہو سکتیں۔“

”مجھے صرف ان لوگوں کے تعاقب کا حکم تھا۔ اگر راہ چلتوں پر تلوار

اٹھانے کی اجازت ہوتی تو تم مجھے بزدلی کا طعنہ نہ دیتے۔"

"جب تم جانتے ہو کہ ہماری لاشیں روندے بغیر تم ان کا پیچھا نہیں کر سکتے تو تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟"

افسر نے کوئی جواب نہ دیا اور تذبذب کی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں عبد الملک گھوڑا دوڑاتا ہوا طاہر کے قریب پہنچا اور افضل کی طرف نیزہ تان کر حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ طاہر نے کہا۔ "عبد الملک لڑائی کی ضرورت نہیں، یہ ہمارے دوست افضل ہیں اور اب واپس جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

عبد الملک نے جواب دیا۔ "یہ اب اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ افضل تیار ہو جاؤ!"

"نہیں نہیں۔ عبد الملک ٹھہرو!" طاہر چلایا لیکن عبد الملک نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا کر افضل پر حملہ کر دیا۔ افضل نے بچاؤ کی کوشش کی لیکن عبد الملک کا نیزہ اس کے سینے کے آر پار ہو گیا۔

طرفین پر ایک لمحہ کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ عبد الملک گھوڑا موڑ کر ان کے درمیان آ کھڑا ہوا اور افضل کے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ”تم میں سے اور کون ہے جو خلیفہ کا نمک حلال کرنا چاہتا ہے؟ یہ خشک زمین منافقوں، بُزدِلوں اور غدّاروں کے خون کے لیے ترس رہی ہے۔ میری طرف دیکھو، میں عبد المُلک ہوں۔ شاید تم میں سے اکثر مجھے پہچانتے ہوں۔“

عبد المُلک نے ایک لمحہ کے لیے خود اتار کر پھر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اے کاش! تم جینا اور مرنا جانتے۔ تم کمزور کے سامنے شیر اور طاقتور کے سامنے بھیڑیں بن جاتے ہو۔ تم عورتوں پر تیر برساتے ہو لیکن مردوں کو دیکھ کر تمہارے ہاتھ کانپتے ہیں۔ جاؤ جا کر اپنے سپہ سالار سے کہو کہ جس جنگل میں وہ شکار کھیلنے آیا ہے وہاں خرگوش نہیں، چیتے رہتے ہیں۔ خوارزم شاہ کے ساتھ چند آدمی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہزاروں سے لڑنا جانتا ہے۔ جاؤ اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ ہماری تلواریں تمہارے خون سے شرمائیں گی تو میں شاید تمہیں بھاگنے کا موقع نہ دیتا۔“

افضل کے ساتھی یکے بعد دیگرے کھسکنے لگے اور تھوڑی دیر میں میدان خالی ہو گیا۔

عبد الملک طاہر کے قریب آیا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

”جلدی چلیے، صفیہ آپ کا انتظار کر رہی ہے؟“

”صفیہ!“

”چلیے وہ زخمی ہے۔“

طاہر نے دوسرا سوال کے بغیر گھوڑا چھوڑ دیا۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے جب گھوڑے کی رفتار کم ہوئی تو اس نے عبد الملک سے سوال کیا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”میں انہیں اس پہاڑی کے پیچھے ندی کے کنارے چھوڑ آیا ہوں۔“

”زخم خطرہ تو نہیں؟“

”اسے دو تیر لگے ہیں۔ ایک کا زخم معمولی ہے لیکن دوسرا بری طرح اس کی پسلی میں پوست تھا۔ میں نے نکال دیا ہے لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

”خدا خیر کرے۔“

(۵)

صفیہ پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سعید اسے پانی پلا رہا تھا۔ طاہر کو دیکھا تو وہ اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی لیکن آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ طاہر نے بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیا اور آہستہ سے زمین پر لِٹا دیا۔

”صفیہ! تم یہاں کیوں آئیں؟“ طاہر نے درد بھری آواز میں کہا۔ صفیہ نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”اب ان باتوں کا وقت نہیں۔ دیکھیے کہ ندی کس قدر چھوٹی ہے لیکن اس کا پانی

کس قدر شفاف ہے۔ دریائے دجلہ بہت بڑا ہے لیکن اس کے گندے پانی سے اکتا گئی تھی۔ آپ کے گاؤں کے نخلستانوں میں بالکل اسی قسم کی ندیاں بہتی ہوں گی۔ ٹھنڈے میٹھے اور شفاف پانی کی ندیاں۔ میں ان کی تلاش میں یہاں پہنچ گئی۔"

طاہر نے چند ساتھی اس کے قریب پہنچے۔ عبدالملک انہیں لے کر ایک طرف ہو گیا۔

صفیہ نے کہا۔ "آپ مغموم کیوں ہیں۔ میری طرف دیکھیے۔ میں خوش ہوں۔ ہاں، میں اس ندی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ اگر میں مر جاؤں تو مجھے اس ندی کے کنارے چھوڑ جایئے۔"

"نہیں نہیں۔ صفیہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تمہارے زخم معمولی ہیں۔ میں تمہیں ان نخلستانوں میں لے جاؤں گا جن میں ٹھنڈے، میٹھے اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔ اب حوادث کے طوفان کی کوئی لہر ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے گی!"

صفیہ نے کہا۔ ”اور ہم ہر صبح گھوڑوں پر سوار ہو کر صحرا کی طرف سیر کے لیے جایا کریں گے۔“

”ہاں صفیہ۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”اور میں آپ کے ساتھ نیزہ بازی کی مشق کیا کروں گی اور پھر میں نخلستانوں میں پھول تلاش کیا کروں گی۔ اور جب آپ لڑائی کے لیے جایا کریں گے تو میں ریت کے ٹیلوں پر چڑھ کر آپ کی راہ دیکھا کروں گی۔“ صفیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے موت کا کوئی غم نہیں۔ آپ میرے ہیں! آپ میرے ہیں! اس نے آنکھیں بند کر لیں۔“

”صفیہ صفیہ!“ طاہر نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

صفیہ نے آنکھیں کھولیں لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ طاہر نے عبد الملک کو آواز دی۔ وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ طاہر نے کہا۔ ”اسے غش آگیا ہے۔ پانی لاؤ!“

پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد صفیہ کے چہرے پر کچھ تازگی آگئی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ”شاید میں سوگئی تھی۔ اس نخلستان میں۔۔۔۔۔۔ شفاف پانی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ میں وہاں کھڑی تھی۔۔۔۔۔۔ اور آپ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے کہیں۔۔۔۔۔ بہت۔۔۔۔۔۔ دور۔“

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ چھا رہی تھی۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ آپ دیر نہ لگائیں اور یہاں سے۔۔۔۔۔۔ ایک منزل۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔!“

عبد الملک نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر طاہر کی طرف دیکھا اور انا للہ و انا الیہ راجعون، کہہ کر سر جھکا دیا۔ طاہر دنیا و مافیہا سے بے خبر اس محبت و وفا کے پیکرِ مجسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبد الملک نے صفیہ کے چہرے پر اپنا رومال ڈال دیا اور طاہر کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”طاہر! اُٹھو! حوصلے سے کام لو!“

طاہر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عبد الملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ عبد الملک نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیے۔ طاہر بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ عبد الملک نے کہا۔ "طاہر! شاید دنیا میں کوئی انسان اس قابل نہ تھا جس کے لیے وہ زندہ رہتی!"

تھوڑی دیر بعد طاہر کے ساتھی ندی کے کنارے اس کی لاش کو پتھروں کے انبار کے نیچے فون کر چکے تھے۔ طاہر نے چند جنگلی پھول چُنے اور صفیہ کی قبر پر بکھیر دیے۔

عبد الملک نے کہا۔ "چلو اب دیر ہو رہی ہے۔"

طاہر نے گھوڑے پر سوار ہو کر سعید سے پوچھا۔ "سپہ سالار کتنی فوج کے ساتھ آرہا ہے۔"

"بیس ہزار کے ساتھ۔"

طاہر نے عبد الملک سے کہا۔ "وزیر اعظم کا خط مجھے دو!"

طاہر نے خط پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد کہا۔ ”تو مہلب وہاں پہنچ چکا ہے۔ اب بغداد کا خدا حافظ!“

عبد الملک نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ سلطان نے ہمارے مشورے کے خلاف بغداد کا رُخ نہ کر لیا ہو۔ ہمیں ان کے پاس جلد پہنچنا چاہیے۔“

”چلو!“ طاہر نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔

راستے میں سعید سے چند سوالات پوچھنے کے بعد طاہر کو پتہ چلا کر وہ راستے میں سپہ سالار کی فوج سے کترا کر نکلے تھے لیکن ہراول کے ایک دستے نے انہیں ایک پہاڑی پر سے گزرتے دیکھ کر تعاقب شروع کر دیا تھا۔

(۶)

سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ کے ساتھ قریباً اڑھائی ہزار جانباز تھے۔ بغداد سے قشمور کی قیادت میں بیس ہزار سپاہیوں کی آمد کی خبر سنتے ہی اس نے دو ہزار سپاہیوں کو گھات میں بٹھا دیا اور خود پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر ایک پہاڑی پر خلیفہ کی افواج کا انتظار کرنے لگا۔ اسی

اثنا میں اسے خبر ملی کہ خلیفہ کا ایک اور سالار مظفر الدّین دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شمال مشرق سے اس کے گرد گھیر اڈالنے کے لیے یلغار کر رہا ہے۔

وزیر اعظم کا مکتوب پڑھنے اور طاہر، عبد الملک اور سعید سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جلال الدّین کو یقین ہو چکا تھا کہ خلیفہ کے سپاہی اسے ہر قیمت پر گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ یہاں سے بچ کر نکل گیا تو بھی وہ اس وقت تک اس کا تعاقب کریں گے جب تک وہ تاتاریوں کے ہاتھ نہیں آجاتا۔

جب قشمور کی فوج دکھائی دی تو سلطان نے طاہر کے ہاتھ میں صلح کا جھنڈا دے کر اسے صلح کی بات چیت کے لیے بھیج دیا۔

طاہر نے قشمور کے سامنے یہ درخواست پیش کی کہ اوّل تو بغداد جانے کے لیے راستہ نہ روکا جائے۔ سلطان کو یقین ہے کہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ اس کی غلط فہمیاں دور کرے گا ورنہ اسے یہاں ٹھہر کر خلیفہ سے

پیغام رسانی کا موقع دیا جائے اور اگر یہ دونوں درخواستیں ناقابلِ قبول ہوں تو سلطان واپس جانے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

قشمور جلال الدّین کے ساتھ صرف پانچ سو آدمی دیکھ کر اپنی قوتِ تسخیر کا مظاہرہ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "ہمارا پہلا اور آخری فیصلہ یہ ہے کہ سلطان اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔"

طاہر نے اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قشمور نے سنی ان سنی ایک کر دی۔ اس نے اس کے باقی جرنیلوں سے اپیل کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ طاہر نے مایوس ہو کر کہا۔ "میں تمہارے پاس دوستی اور محبت کے پھول لے کر آیا تھا لیکن تم عداوت کے کانٹوں کے لیے دامن پھیلا رہے ہو۔ میں صلح کا ایلچی بن کر آیا تھا لیکن تم جنگ چاہتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کی جائے گی۔ افسوس! سب کچھ کھو بیٹھنے کے باوجود مسلمان اس بات پر فخر کر سکتے تھے کہ دنیا میں ان جیسا

مہمان نواز کوئی نہیں لیکن آج یہ سعادت بھی اہلِ بغداد سے چھن گئی۔ جلال الدّین لڑائی سے نہیں ڈرتا لیکن آج وہ تلوار جو بار ہا تاتاریوں کے خون میں ڈوب چکی ہے، مسلمانوں کی تلواروں سے ٹکراتے ہوئے یقین شرمائے گی۔ خدا معلوم اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہو گا۔ تم گواہ ہو کہ ہم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ ہمارے سر تھوپی جارہی ہے۔"

قشمور نے کہا۔ "جاؤ ہمیں اس لڑائی کا نتیجہ معلوم ہے اور ایک ساعت کے اندر اندر تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔"

طاہر نے گھوڑے کی باگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ خوارزم کی طرح بغداد کی عظمت کے دن بھی گنے جاچکے ہیں اور ہم میں سے کسی ایک کی فتح دونوں کی شکست ہو گی!"

طاہر نے گھوڑے کو ایڑ لگادی اور آن کی آن میں سلطان کے پاس پہنچ گیا۔

قشمور کی فوج کے عرب سپاہیوں کے لیے مہمان نوازی کے متعلق طاہر کا طعنہ ناقابل برداشت تھا۔ ان میں سے اکثر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ لڑائی میں

حصّہ نہیں لیں گے۔ ایرانی اور ترک سرداروں میں سے بھی بعض تذبذب میں تھے اس لیے قشمور نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً حملہ کرنے کا حکام دے دیا۔

جلال الدّین نے اپنے عقب میں چھپی ہوئی فوج کو ہدایت بھیج کر قشمور کی فوج کا مقابلہ کیا۔ بغدادی فوج کے قلب اور دونوں پہلوؤں پر چند حملے کرنے کے بعد اس نے پسپائی شروع کر دی۔ قشمور نے یہ سمجھتے ہوئے کہ سلطان میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔ اس کا پیچھا کیا۔ سلطان رُک رُک کر لڑتا ہو قشمور کی فوج کا بیشتر حصّہ ان دشوار گزار پہاڑیوں میں لے آیا جہاں اس کے تیر انداز گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اچانک اپنے آگے پیچھے، دائیں اور بائیں پتھروں اور تیروں کی بارش دیکھ کر قشمور نے محسوس کیا کہ اس نے سلطان کی فوج کی تعداد کا اندازہ لگانے میں دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ تنگ گھاٹیوں میں وہ اپنی فوج کے نصف سے زیادہ سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر پیچھے مڑا۔ واپسی پر قریباً تین کوس تک راستے کے ہر ٹیلے سے تیروں اور پتھروں کی بارش میں سے گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ

مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہ کی۔

چند کوس قشمور کا تعاقب کرنے کے بعد سلطان واپس چلا آیا۔ راستے میں مظفر الدّین کے دس ہزار سپاہیوں سے اس کی مُڈ بھیڑ ہوئی۔ مظفر الدّین کی فوج قشمور کی شکست کے بعد بد دل ہو چکی تھی۔ اس نے معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

ان فتوحات کے بعد رضاکاروں کے دستے جوق در جوق سلطان کی فوج میں داخل ہونے لگے اور چند ماہ میں اس کے سپاہیوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ تبریز کا گورنر تاتاریوں کا حلیف تھا۔ سلطان نے اسے غدّاری کی سزا دینے کے لیے تبریز کی طرف پیش قدمی کی۔ گورنر تاتاریوں کی مدد کا انتظار کیے بغیر بھاگ گیا اور سلطان نے شہر پر قبضہ کر لیا. تبریز پر قابض ہونے کے بعد سلطان نے آس پاک کے چند اور علاقے فتح کیے۔ اس اثنا میں اسے بغداد کے خلیفہ الناصر الدّین اللہ کی وفات اور اس کے بیٹے ظاہر کی مسند نشینی کی خبر ملی۔

ایک اور کوشش

ناصر کی وفات کی خبر ملتے ہی سُلطان نے طاہر اور عبد المُلک کو بُلا کر خلیفہ ظاہر کی عادات و خصائل کے متعلق چند سوالات پوچھے۔ طاہر نے سلطان کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ظاہر سے صرف ایک بار ملا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے لیکن بد طینت نہیں۔ وہ اپنے باپ کی طرح تاتاریوں کو اپنا دوست نہیں سمجھتا۔“

عبد المُلک نے کہا۔ ”میں اسے مدت سے جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمام اسلام کے اتحاد کا بہت حامی ہے۔ جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، وہ اپنے باپ کی ضد ہے لیکن وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے والوں میں سے نہیں۔ تاہم بغداد میں اگر کوئی صحیح رہنمائی کرنے والا ہو تو اس سے

بہت کام کیا جاتا ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "میرے خیال میں تم دونوں اسی کے لیے بہترین مشیر بن سکتے ہو۔ اگر میں تمہیں اپنے ایلچی بنا کر اس کے پاس بھیجوں تو وہ یقیناً تمہاری باتوں پر توجہ دے گا۔ بغداد میں تاتاریوں کا اثر ورسوخ بہت بڑھ چکا ہے اور بغداد کی غیر جانب داری کے باعث اہلِ مصر اور شام ہمارا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تم بغداد جاؤ۔ خلیفہ ظاہر کو تاتاریوں کے خلاف تمام اسلام ممالک کی رہنمائی کے لیے آمادہ کرو اور انہیں یقین دلاؤ کہ جب تم میں زندہ ہوں، تاتاریوں کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول رکھوں گا۔ اگر وہ چاہیں تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بغداد میں تمام اسلامی ممالک کی افواج اکٹھی کر سکتے ہیں اور انہیں یہ بھی بتاؤ کہ جس دن ہم بغداد، مصر، عرب اور شام کی افواج کے ساتھ تاتاریوں پر حملہ کریں گے، اسی دن ہندوستان میں ہمارا حلیف سلطان التمش تاتاریوں کے خلافِ اعلانِ جنگ کر دے گا اور ایران، ترکستان اور خراسان کے عوام جب تک دبے ہوئے ہیں، اچانک اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ مجھے اب

یہ احساس ہوا ہے کہ مجھے اعانت کے لیے کسی کے پاس جانے کی بجائے یہاں رہ کر اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ اگر میں اس بے سر و سامانی کی حالت میں چند برس تاتاریوں کے ساتھ لڑتا رہا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان میری امداد کے لیے ضرور آئیں گے۔ چند دنوں تک آذر بائیجان سے دس پندرہ ہزار اور سپاہی میرے ساتھ آ ملیں گے اور فوج کی اتنی تعداد کے ساتھ میں انہیں کم از کم دو برس اور پریشان کرتا رہوں گا۔ اس عرصہ میں تم سارے عالمِ اسلام کو جگا سکتے ہو!"

"ہم تیار ہیں۔" طاہر اور عبد الملک نے یک زبان ہو کر کہا۔

سلطان نے کہا۔ "مبارک کو میرے پاس رہنے دو، وہ صرف ایک سپاہی ہے اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

چند دن بعد طاہر اور عبد الملک بغداد پہنچ چکے تھے۔ خلیفہ ظاہر نے ان کی آمد سے باخبر ہوتے ہی انہیں ملاقات کے لیے بلایا۔

پہلی ملاقات کے بعد طاہر نے جلال الدّین کے نام جو خط لکھا، اس کا مفہوم

یہ تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مہلب جو وزارتِ عظمٰی کا امیدوار تھا، خلیفہ سے ہماری ملاقات کے بعد اچانک روپوش ہو گیا ہے۔ خلیفہ نے فوج کی تنظیم کا کام عبدالملک کے سپرد کر دیا ہے اور میرے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کا ایلچی بن کر شام، مصر، عرب، مراکش اور اندلس جاؤں۔ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔" حج چونکہ قریب تھا۔ اس لیے عبدالملک نے طاہر کو مشورہ دیا کہ تم سب سے پہلے مکّہ جاؤ۔ وہاں ہر ملک کے مسلمان جمع ہوں گے اور تمہارے لیے جہاد کی تبلیغ کا بہترین موقع ہو گا۔ اس کے علاوہ راستے میں تم اپنے گھر بھی جاسکو گے۔

(۲)

ایک دن شام سے کچھ دیر پہلے زید ایک خوب صورت بچے کو اٹھائے نخلستان سے باہر کھُلی فضا میں ٹہل رہا تھا۔ اچانک اسے کچھ فاصلے پر ایک

سوار سرپٹ آتا ہوا دکھائی دیا۔ زید چند قدم آگے بڑھ کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ سوار نے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا اور چہرے سے اپنی نقاب سرکا کر اوپر کر دیا۔ زید نے "طاہر! طاہر!" کہتے ہوئے بھاگ کر ایک ہاتھ سے اس کے گھوڑے کی باگ پڑی۔ بچہ اس غیر متوقع ہلچل سے گھبرا کر ایک لمحہ کے لیے مُنہ بسورنے کے بعد بلک بلک کر رونے لگا۔

زید نے جلدی سے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "واہ! اپنے ابّا کو دیکھتے ہی میری شکایت شروع کر دی اور آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ گھوڑے سے اُتر کر اسے چپ کیوں نہیں کراتے؟"

طاہر نے گھوڑے سے اُتر کر بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بچہ اچانک خاموش ہو گیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس کی چمکتی ہوئی زرہ پر ہاتھ مارنے لگا۔

"میں گھر خبر دیتا ہوں۔" زید نے یہ کہہ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور نخلستان کی طرف بھاگنے لگا۔

طاہر نے آہستہ آہستہ چند قدم نخلستان کی طرف اٹھائے اور پھر رُک کر بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ بچہ اب زرّہ سے توجہ ہٹا کر خود کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ طاہر نے سر جھکا دیا۔ بچے کے ننھے ننھے نرم اور خوب صورت ہاتھ اس کے گالوں سے لگے، اس کے دل میں ایک لطیف اور خوشگوار دھڑکن پیدا ہوئی اور اس نے بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے تھوڑی دیر کے لیے اس کی ساری توجہ اور محبت سمٹ کر بچے کے ننھے معصوم اور خوب صورت چہرے پر مرکوز ہو گئی۔ وہ بے اختیار اس کے گالوں، اس کے ہونٹوں، اس کی پیشانی اور اس کی آنکھوں پر بوسے دے رہا تھا۔ ”میرا بیٹا! میری زندگی!! میری روح!!!“

طاہر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کے دروازے کے قریب ہو چکا تھا۔

”اگر آپ نے چند دن اس طرح پیار کیا تو یہ بگڑ جائے گا۔“ طاہر نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ثریا چند قدم کے فاصلے پر دروازے سے باہر ایک کھجور کے درخت کے نیچے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"ثریا میری۔۔۔۔۔؟"

ثریا نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ طاہر نے پریشان سا ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ چند قدم دور احمد بن حسن، شیخ عبدالرحمن، سعیدہ اور حنیفہ صحن سے دروازے کی طرف آرہے تھے۔ طاہر نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کو ثریا کے سپرد کیا اور مکان کے صحن میں داخل ہوا۔

گھر کے افراد اور طاہر کے درمیان ابھی آٹھ دس گز کا فاصلہ تھا کہ نخلستان کے ایک طرف سے اسماعیل اور امین بھاگتے ہوئے نمودار ہوئے اور طاہر کے ساتھ لپٹ گئے۔

اسماعیل ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ہم تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے کہ زید نے آپ کے آنے کی خبر دی۔"

جب گھر کے تمام افراد طاہر کے گرد حلقہ بنائے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے تو اسماعیل نے شیخ کی طرف ایک شرارت آمیز

تبسم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نانا جان! آپ نے پہچانا نہیں؟ یہ بھائی طاہر ہیں۔“

شیخ غضب ناک ہو کر عصا بلند کرتے ہوئے چلّایا۔ ”ٹھہرو! نالائق!! اور اسماعیل بھاگتے ہوئے کئی گز دور جا کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ حنیفہ زیرِلب مسکرا رہی تھی لیکن حنیفہ اور سعیدہ نہ تو شیخ کے غصّے کی وجہ جان سکیں نہ اسماعیل کے قہقہوں کا راز۔

(۳)

عشاء کی نماز کے بعد طاہر کے ارادوں سے واقف ہو کر ثریا نے حج اور اس کے بعد اسلامی ممالک کی تبلیغی مہم میں طاہر کا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ سعیدہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ثریا کے متعلق میں جو کُچھ سُن چکی ہوں، اس سے میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہاری بہت بڑی مددگار ثابت ہو گی۔“

شیخ نے کہا۔ ”مجھے اس پر اعتراض نہیں۔ لیکن بچّہ؟“

سعیدہ نے کہا۔ ”وہ میرے پاس رہے گا۔ اب بھی وہ میرے سوا کسی اور کے پاس نہیں جاتا۔“

سعیدہ کے اصرار پر حنفیہ اپنی نواسی کے بیٹے کو اس کے پاس چھوڑنے پر رضامند ہو گئی۔

اسماعیل جو ایک کونے میں کھڑا تھا بول اُٹھا۔ ”میں حج کرنے کے بعد ان کے ساتھ جاؤں گا۔“ شیخ نے کہا۔ ”چپ رہو۔ تمہاری تعلیم کا زمانہ ہے۔“

احمد بن حسن نے کہا۔ ”آپ بے حد مصروف آدمی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ اسماعیل کی تعلیم و تربیت مجھے سونپ دیں۔ امین کے ساتھ اس کا دل لگا رہے گا۔“

شیخ نے کہا۔ ”میں چند دن سے یہی سوچ رہا تھا لیکن حیران ہوں کہ اس نالائق کے بغیر میرا دل کیسے لگے گا۔ میں اس کی شوخیوں اور شرارتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں جس قدر اس کے قہقہوں سے خفا ہوتا ہوں، اسی قدر انہیں سننے کے لیے بے قرار رہتا ہوں۔ یہ میرے بڑھاپے کی زندگی

کا ایک جزو بن چکا ہے۔ بچپن میں یہ میرے جوتے چھپا دیا کرتا تھا اور اب ان میں کھجوروں کی گٹھلیاں ڈال دیتا ہے۔ میں خفا ہوتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچتا ہوں کہ اگر یہ اس قسم کی شرارتیں نہ کرتا تو میری زندگی کس قدر بے کیف ہوتی۔ لیکن تعلیم کے لیے مجھے اس کو آپ کے پاس چھوڑنا ہی پڑے گا۔ ادھر آؤ اسماعیل!"

اسماعیل ندامت سے سر جھکائے آگے بڑھا اور شیخ نے پیار سے اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ "بیٹا! میں حج کے بعد تمہیں یہاں چھوڑ دوں گا لیکن اس شرط پر کہ تم ہفتے میں دو بار شہر میرے پاس ضرور آیا کرو گے! بیٹا! میرا کاروبار اتنا وسیع ہے کہ اسے سمیٹنے کے لیے بھی ایک مدّت چاہیے!"

"تو میں ہر روز آپ کے پاس آیا کروں گا۔ شام کو میں اور امین گھوڑوں پر سوار ہو کر صحرا کی طرف جانے کی بجائے شہر چلے جایا کریں گے۔"

"بہت اچھا! میں ہر روز تمہاری طرف سے ایک نئی شرارت کے لیے تیار رہا کروں گا۔"

”نانا جان!“ اسماعیل نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ ”مجھے معاف کیجیے۔ میں آئندہ کبھی شرارت نہیں کروں گا!“

رات کے وقت شیخ عبدالرحمن اپنے بستر پر نیم خوانی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے کہا۔ ”کون ہے؟“

”نانا جان! میں ہوں۔“ اسماعیل نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”نانا جان!۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔!“

”ہاں بولو!“

”نانا جان! معاف کیجئے، آپ کے ساتھ آئندہ کوئی شرارت نہ کرنے کا وعدہ کرنے سے پہلے میں ایک شرارت کر چکا تھا۔“

”میرے موزوں میں پھر گٹھلیاں ڈال دی ہوں گی۔ اچھا جاؤ میں صبح نکال لوں گا۔“

”نہیں نانا جان! میں خود نکال دیتا ہوں۔“

تھوڑی دیر شیخ کے بستر کے نیچے تاریکی میں ہاتھ مارنے کے بعد اسماعیل نے کہا۔ ”نانا جان! اگر اجازت ہو تو شمع لے آؤں۔ مجھے تمام جوتے نہیں ملے۔“

شیخ نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی سعادت مندی کا ثبوت دینے پر تلے بیٹھے ہو۔ جاؤ لے آؤ شمع!“

اسماعیل دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ہاتھ میں لے کر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ امین بھی تھا۔ اسماعیل نے امین کے ہاتھ میں شمع دیتے ہوئے تمام جوتے اکٹھے کر کے اُٹھا لیے۔ شیخ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ ”اب یہ تمام جوتے باہر کیوں لے جا رہے ہو؟“

اسماعیل نے پریشان سا ہو کر جواب دیا۔ ”دھونے کے لیے نانا جان!“

”دھونے کے لیے؟“

”ہاں نانا جان! بات یہ ہے آج میں نے ان میں گٹھلیوں کی بجائے رس دار کھجوریں ڈال دی تھیں۔“

”ٹھہرو نالائق!“ شیخ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسماعیل اور امین جلدی سے باہر نکل گئے۔

(۴)

سونے سے پہلے ثریا نے طاہر سے کہا۔ ”آپ نے ابھی تک اپنے بیٹے کا نام نہیں پوچھا؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”میں نے دہلی سے رخصت ہوتے ہوئے ایک نام بتا دیا تھا۔ تم نے عبدالعزیز کے سوا کوئی اور نام تو نہیں رکھ دیا؟“

”نہیں، میں نے یہی نام رکھا ہے۔“

طاہر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا بہترین دوست تھا۔“

”آپ نے ایک وعدہ پورا نہیں کیا۔“

طاہر نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

ثریا نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ کو بغداد جانے کا موقع ملا تو۔۔۔۔۔؟“

”ثریا! یہ قصّہ نہ چھیڑو!“ ”میں شام سے آپ کو بہت پریشان دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہیں، بتائیے کیا ہوا؟“

”ثریا! یہ بہتر ہوتا کہ آج تم یہ قصّہ نہ چھیڑتیں!“

”مجھے معاف کیجئے۔ اگر وہ میری وجہ سے آپ کے ساتھ خفا ہو گئی ہے تو میں خود بغداد جاکر اسے منالوں گی۔“

طاہر نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”اسے منانا اب کسی کے بس میں نہیں۔ وہ مجھ سے بہت دور جاچکی ہے۔“

”کیا اس کی شادی کسی اور۔۔۔۔۔؟“

”نہیں نہیں۔ ثریا وہ اس دنیا میں نہیں۔“

"اوہ! معاف کیجیے۔"

طاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا باہر گھوم آؤں۔" اور وہ باہر نکل گیا۔ چاند کی روشنی کھجور کے درختوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ طاہر باہر نکل کر ایک گِرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ وہ چاند کی روشنی اور تاروں کی چھاؤں میں صفیہ کے ساتھ گزری ہوئی ملاقاتوں کا تصور کر رہا تھا۔ چاند کی مسکراہٹوں اور ستاروں کے قہقہوں کے باوجود فضا میں ایک اداسی سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ آخر کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ثریا!"

ثریا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

"نہیں ثریا! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا۔" ثریا آگے بڑھی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پھیلا دیے اور وہ اس سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔

”مجھے بتائیے، اسے کیا ہوا؟ کاش میں اپنی جان پر کھیل کر اسے واپس لا سکوں میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن آپ کے چہرے پر ہلکا سا ملال بھی برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔!“

طاہر ثریا کو ساتھ لے کر پھر اسی درخت کے تنے پر بیٹھ گیا اور بولا ”ثریا! تم میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک انسان تمنّا کر سکتا ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ زندگی کے کسی حادثے نے مجھے تم سے بے پروا کر دیا ہے لیکن صفیہ کی موت ایک ایسا واقعہ ہیں جسے میں جلد نہ بھول سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مسکراہٹ میرے ہر زخم کے لیے مرہم کا کام دے سکتی ہے لیکن صفیہ کی موت کے بعد اکثر میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ مجھے شاید اس دنیا میں خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ایک ایسی مسکراہٹ کی یاد جس میں اشکوں اور آہوں کے ہزاروں طوفان پنہاں تھے، مجھے ہمیشہ بے چین رکھے گی!“

ثریا نے کہا۔ ”میں اس کے متعلق سُننا جانتی ہوں۔ شاید آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ میں مسرت کی مسکراہٹوں میں ہی نہیں، غم کے آنسوؤں

میں بھی آپ کی شریک ہوں۔"

"تو سنو!"

طاہر صفیہ کی داستانِ حیات کے آخری ورق اُلٹ رہا تھا اور ثریا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

جب طاہر نے یہ قصہ ختم کیا تو ثریا نے کہا۔ "جب آپ اس مہم سے فارغ ہو کر بغداد جائیں تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ میں اس کا ادھورا کام پورا کروں گی

(۵)

بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک کے شہریوں سے حوصلہ افزا پیغامات نے سلطان جلال الدّین اور اس کے سپاہیوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ سلطان نے آذر بائیجان پر یلغار کی اور بہت سے علاقے ان حکمرانوں سے چھین لیے جنہیں سلطان سے غدّاری کے صلے میں تاتاریوں نے حکومت عطا کی تھی۔ پھر اس نے گرجستان اور تفلیس کا رُخ کیا۔ تفلیس

میں اس کی فتوحات کی رفتار حیرت انگیز تھی لیکن اچانک اسے کرمان سے براق حاجب کے باغی ہو جانے کی اطلاع ملی۔ سلطان نے اپنے ساتھ تین ہزار اور سوار لے کر یلغار کرتا ہوا سترہ دن میں تفلیس سے کرمان پہنچا۔ براق حاجب نے معذرت کی اور اپنے وعدوں پر قائم رہنے کا یقین دلایا۔ سلطان واپسی پر چند روز اصفہان ٹھہرا۔ یہاں اسے خلیفہ ظاہر کی وفات اور خلیفہ مستنصر کی جانشینی کی خبر ملی اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ خبر ملی کہ تفلیس میں تاتاریوں کے ہاتھوں بکے ہوئے سرداروں نے پھر بغاوت کر دی ہے اور وہ عیسائیوں کی مدد سے آذربائیجان کے شہروں پر حملے کر رہے ہیں۔ سلطان یہ سُن کر یلغار کرتا ہوا آذربائیجان پہنچا اور چند ہفتوں میں باغیوں کی سرکوبی کرنے کے بعد تبریز لوٹ آیا۔

تبریز پہنچ کر سلطان کو معلوم ہوا کہ تاتاریوں کی ٹڈی دل افواج رے کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ سلطان کے پاس فوجی قوّت زیادہ نہ تھی لیکن آئے دن اسے یہ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ طاہر کی کوششوں سے دور دراز کے اسلامی ممالک سے رضاکاروں کے دستے بغداد میں جمع

ہو رہے ہیں۔ بعض رضا کار براہ راست تبریز کا رخ کر رہے تھے۔ تاتاریوں کے رے پہنچ جانے کے بعد سلطان کو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ تاتاری موصل کی طرف پیش قدمی کر کے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک سے اس کی رسد و کمک کے راستے منقطع کرنا چاہتے ہیں۔ سلطان نے یہ خدشہ بھی محسوس کیا کہ اگر تاتاری رے سے ہمدان پہنچ گئے تو ممکن ہے کہ وہ کُردستان اور موصل تک ایک طویل دفاعی مورچہ بنانے کی بجائے سیدھے بغداد پر حملہ کر دیں اور عالمِ اسلام کا یہ آخری مورچہ بھی نابود ہو جائے۔

چنانچہ سلطان نے تاتاریوں کی تمام توجہ اپنی طرف مبذول رکھنے کے لیے اصفہان کا رخ کیا اور چند دن کی تیاری کے بعد وہاں سے رے کی طرف کوچ کر دیا۔

رے کے قریب تاتاریوں کے لشکر سے مقابلہ ہوا اور جان توڑ حملوں سے اس نے تاتاریوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن سلطان کے بھائی غیاث الدّین نے جو فوج کی بائیں بازو کی قیادت پر فائز تھا، بدترین غدّاری کا ثبوت

دیا اور اپنی فوج کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تاتاریوں نے سلطان کی فوج کا ایک بازو خالی دیکھ کر قلب پر حملہ کر دیا اور اس کی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ سلطان نے پیچھے ہٹ کر دوبارہ لشکر کو منظم کرنے کے بعد حملے کیے لیکن تاتاریوں کے لشکر کی تعداد اور غیاث الدّین کی غدّاری نے اس کے سپاہیوں کو بددل کر دیا تھا۔ وہ فتح سے مایوس ہو کر فقط سلطان کے حکم کی تعمیل میں لڑ رہے تھے۔ تاتاریوں کی ایک فوج عقب میں پہنچ کر گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلطان نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر فوج کو پسپائی کا حکم دیا اور مار دھاڑ کرتا ہوا میدان سے نکل گیا۔ تاتاریوں نے اصفہان تک سلطان کا تعاقب کیا لیکن صحرائے گوبی میں چنگیز خان کی وفات نے تمام شہزادوں اور سرداروں کو ایک ہونے پر مجبور کر دیا۔

واپس تبریز پہنچ کر سلطان نے عبد الملک کی وساطت سے خلیفہ مستنصر کو خط لکھا کہ اب فیصلہ کن جنگ کا وقت آ گیا ہے۔ آپ تیار رہیں۔ تاتاریوں کے واپس آنے تک کوہ البرز سے لے کر آرمینیا تک ان کے

عیسائی حلیفوں کی گوشمالی کے لیے میرے مٹھی بھر سپاہی کافی ہیں۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد اگر مجھے بغداد آنے کی اجازت دی جائے تو میں تاتاریوں کی دوبارہ دریائے جیحوں عبور کرنے تک ایک ناقابلِ تسخیر فوج منظّم کر سکوں گا اور ہم تاتاریوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑ سکیں گے۔ اگر خلیفۃ المسلمین کو کسی مصلحت کے تحت میرا بغداد آنا منظور نہ ہو تو میں بغداد کی حدوں سے باہر کسی شہر کو اپنا مستقر بنا کر بغداد کی افواج کا انتظار کروں گا۔

طاہر بن یوسف کی طرف سے سلطان کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ مصر اور مراکش کے سلاطین سے امداد کا وعدہ لے کر واپس حلب پہنچ چکا ہے اور شام کے عوام اور امراء سے اسے امداد کی توقع ہے۔

سلطان نے اسے یہ پیغام بھیجا کہ تم شام میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد فوراً ہندوستان روانہ ہو جاؤ اور سلطان التمش کو اس کے وعدے یاد دلاؤ۔ جس وقت ہم منظم ہونے کے بعد ایران یا خراسان میں تاتاریوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کریں گے، سلطان کو اطلاع بھیج دی

جائے گی۔ اس صورت میں اگر سلطان التمش افغانستان کی طرف سے تاتاریوں پر حملہ کر دے تو ان کی توجہ بٹ جائے گی اور یہ ہمارے لیے بہت بڑی مدد ہو گی۔ بہتر ہو گا کہ جب تک یہ وقت نہ آئے تم ہندوستان میں رہو۔ کئی جنگیں لڑنے کے بعد سلطان جلال الدّین آذربائیجان کے شمال اور مغرب میں وسیع علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اس کے سپاہی ان لامتناہی جنگوں سے دل برداشتہ ہو چکے تھے لیکن سلطان ان کے سامنے بار بار بغداد، مصر، مراکش، شام، عرب اور ہندوستان کی مدد سے تاتاریوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا وعدہ دہرا کر ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ اس کے علاوہ بعض مقامات سے رضا کاروں کے جتھے بھی پہنچ رہے تھے۔

بغداد کے متعلق عبد الملک کی اطلاعات بہت حوصلہ افزا تھیں لیکن تشویش کے بغیر نہ تھیں۔ خلیفہ مستنصر فوج کی تنظیم کے لیے طاہر کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ ترک رضا کاروں کی علاوہ اس نے بغداد میں آنے والے رضا کاروں کے لیے بھی اپنی فوج کے دروازے کھول دیے

تھے۔ اس نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک بہت بڑی فوجی درس گاہ بھی قائم کر دی تھی اور عبد الملک کو اس درسگاہ کا ناظم اعلیٰ بنا دیا تھا۔ یہ سب باتیں بہت حوصلہ افزا تھیں۔ لیکن عبد الملک نے سلطان کے نام اپنے چند مکتوبات میں بعض خدشات کا اظہار بھی کیا تھا۔ اسے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کے خلیفہ درپردہ سب کو تسلّی دیتا ہے لیکن بغداد کے عوام کے سامنے سلطان کی حمایت کرنے سے گھبراتا ہے۔ تاتاریوں کا سفیر جو اس کے باپ کے عہد میں بغداد سے نکالا جا چکا تھا، اب پھر واپس آ گیا ہے اور خلیفہ کے ساتھ اس کی لمبی چوڑی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ تاہم جب خلیفہ سے اس کی شکایت کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں تیاری کے لیے وقت چاہیے اور اس مقصد کے لیے تاتاریوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنا ضروری ہے۔

عبد الملک نے سلطان جلال الدّین کو یہ بھی لکھا کہ تاتاری سفیر لوٹ مار کی بے پناہ دولت کا ایک حصّہ بغداد لے آیا ہے اور اس سے سلطنت کے عمال، علما اور اہلِ الرائے طبقے کو خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بعض

لوگ اعلانیہ طور پر تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کی مخالفت کر رہے ہیں۔

لیکن جلال الدّین مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ شمال مغرب کی مہم سے فارغ ہوتے ہی تبریز پہنچا۔ تبریز میں چند دن قیام کے بعد اسے اطلاع ملی کہ تاتاریوں نے چنگیز خان کے بیٹے تولائی خان کی قیادت میں دریائے سیحوں عبور کر لیا ہے اور ملتِ اسلامیہ کے چیدہ چیدہ غدّاروں کا وفد خلیفۂ بغداد کے پاس بھیج دیا ہے۔

سلطان نے عبد الملک کے نام ایک طویل مراسلہ بھیج کر ہمدان کا رخ کیا۔

آخری شکست

ملاقات کی درخواست کا جواب آنے پر عبد الملک خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خلیفہ نے عبد الملک کی خواہش کے مطابق اس کے ساتھ تخلیہ میں ملاقات کی۔

خلیفہ مستنصر نے جلال الدّین کا مکتوب پڑھ کر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ تولائی خان نے پانچ لاکھ سپاہیوں کے ساتھ دریائے سیحوں عبور کر لیا ہے اور ضرورت کے وقت شاید وہ پانچ لاکھ اور کمک منگوا سکیں۔ تمہارے خیال میں اس وقت سلطان جلال الدّین کے پاس کتنی فوج ہو گی؟"

عبد الملک نے جواب دیا۔ "یہ درست ہے کہ سلطان جلال الدّین کے

پاس اس وقت بہت تھوڑی فوج ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس نے ساٹھ ستّر ہزار سپاہیوں کے ساتھ افغانستان میں شیکی توتو کی دو لاکھ فوج کو عبرتناک شکست دی تھی اور اب مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ کرمان، آذربائیجان، قفقاز، تفلیس اور آرمینیا کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر چکا ہے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "اس وقت ہماری ساری فوج تین لاکھ ہے۔ فرض کرو اگر بغداد سے باہر کسی میدان میں شکست ہو جائے تو تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کا کیا حشر ہو گا؟"

عبد الملک نے کہا۔ "اگر خلیفۃ المسلمین آج ہی اعلانِ جہاد کر دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک ہفتے کے اندر اندر صرف اس شہر سے تین لاکھ رضاکار بھرتی کر دوں گا اور پھر آپ دیکھیں گے کہ مراکش سے لے کر عراق تک ان گنت سپاہی آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہوں گے۔ وہ صرف آپ کے اعلان کے منتظر ہیں۔ تاتاریوں نے آج تک ہم پر فتح حاصل نہیں کی، ہمارے انتشار سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ جس دن بغداد کی افواج ہمدان پہنچیں گی، اسی دن ہندوستان سے سلطان التمش بلخ تک پہنچ چکا ہو گا اور ترکستان، خراسان اور ایران کی بجھتی ہوئی راکھ میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس حالت میں تاتاری دریائے سیحوں سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "عبد الملک ہمیں ڈر ہے کہ اگر شکست ہوئی تو بغداد کا انجام کیا ہو گا؟"

"فتح اور شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ڈر سے آج تک کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ آپ سوچئے کہ جلال الدّین اس وقت عالمِ اسلام کا آخری مورچہ سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر یہ مورچہ ٹوٹ گیا تو ہم تاتاریوں کے سیلاب کو بغداد کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکیں گے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ بغداد سے ہماری افواج کب روانہ ہوں گی۔ وقت بہت کم ہے اور ضروری ہے کہ لڑائی سے کچھ عرصے پہلے ہمارے افواج سلطان کے پاس پہنچ جائیں تاکہ وہ انہیں تربیت

دے سکیں۔"

"لیکن میں یہ بھی ڈر ہے کہ باہر کے ممالک نے ہماری مدد نہ کی تو تاتاری موقع پاتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"آپ اپنا فرض پورا کیجئے اور یقین رکھیے کہ دوسروں کو پیچھے رہنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ بغداد کے اکثر علما تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کے مخالف ہیں؟"

"اکثر نہیں، صرف چند۔ اور انہیں علما کہنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ملّت کے غدّار ہیں جو اپنے ضمیر کی قیمت تاتاریوں کے سفارت خانے سے وصول کر چکے ہیں۔"

"لیکن عوام کی ایک بہت بڑی جماعت پر ان کا اثر ہے۔"

"آپ کے اعلانِ جہاد کے بعد ان کا اثر زائل ہو جائے گا۔"

”تمہیں معلوم ہے کہ ترکستان سے بھی چند علما اور سرداروں کا وفد میرے پاس آیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن یہ صرف وہ لوگ ہیں جو قوم کے نوجوانوں کے خون اور قوم کی بہو بیٹیوں کی عصمت کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ جو قوم کسی کی تلوار سے مغلوب ہونے والی نہ تھی اسے ان کی غدّاری نے مغلوب کیا ہے۔ لیکن امیر المومنین یہ بحث کا وقت نہیں۔ کیا ہم صرف اس لیے دائمی ذلّت قبول کر لیں گے کہ ہم میں چند غدّار پیدا ہو چکے ہیں؟ اور آپ کا کیا خیال ہے کہ ان لوگوں نے سلطان جلال الدّین کے ساتھ غداری کی ہے وہ وقت آنے پر آپ کے ساتھ غدّاری نہیں کریں گے؟ وہ لوگ آپ کے پاس تاتاریوں کی دوستی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ تاتاری مسلمانوں کے دوست ہیں تو انہیں بھی اپنا خیر خواہ سمجھئے، اور اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ تاتاریوں سے بڑھ کر اس وقت ہمارا کوئی دشمن نہیں تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ہمارے بدترین غدّار ہیں۔“

”عبد الملک تم ہمیشہ میں اپنے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دیا کرتے ہو

لیکن یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ تاتاریوں کے ساتھ جنگ کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔"

عبد الملک نے بدحواس ہو کر خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو کیا آپ کا ارادہ بدل چکا ہے؟ ہماری یہ تمام تیاریاں محض دکھاوا تھیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ سلطان نے بغداد کی امید پر ہندوستان چھوڑا تھا۔ آپ کے والدِ بزرگوار کی حوصلہ فرائی سے اس نے مایوسی کی تاریکیوں میں امید کے چراغ روشن کیے اور اس کے بعد اس نے صرف اس امید پر آج تک ہمّت نہ ہاری کہ تاتاریوں کے ساتھ فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے لیے آپ اسے اپنا ایک وفادار سپاہی سمجھتے ہوئے اس کی مدد کریں گے۔ اب وہ ہمدان کے قریب پڑاؤ ڈال کر بغداد کی فوج کا انتظار کر رہا ہے اور اب تک ایک مٹھی بھر جماعت صرف اس لیے اس کا ساتھ دے رہی ہے کہ آپ کی مدد سے وہ تاتاریوں سے انتقام لے سکیں گے۔ یاد رکھیے کہ بغداد سے مدد نہ پہنچنے پر وہ اپنا فرض پورا کرے گا اور آپ سے مایوس ہونے کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بعض ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ جائیں لیکن

تاتاریوں کی فتح کے بعد کوئی بھی دیانت دار مؤرّخ یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ کو تاتاریوں نے شکست دی، بلکہ وہ یہی کہیں گے کہ جب وہ آخری بار تاتاریوں سے نبرد آزما ہوا تھا تو اس کے بھائی اس کی تلوار چھین چکے تھے۔ اب یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ دنیا کی آپ کے متعلق کیا رائے ہو گی؟"

خلیفہ نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ دنیا ہمیں اسلام کا دُشمن سمجھے گی؟"

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ خدا کے لیے یہ کہیے کہ میں آپ کی ذات سے سوءِ ظن کا مجرم ہوں۔ مجھے سزا دیجیے!"

خلیفہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو۔"

"کہاں؟ فوج کے مستقر میں؟"

"نہیں دوسرے کمرے میں۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ شاید وہ تمہیں ہماری مجبوریوں کی وجہ سمجھا سکیں۔" خلیفہ نے یہ کہتے ہوئے تالی

بجائی۔ ایک غلام کمرے داخل ہوا۔ خلیفہ نے کہا۔ ”عبد الملک کو ہمارے دربار میں پہنچا دو۔“

(۲)

عبد الملک دربار میں داخل ہوا۔ وہاں سلطنت کے چیدہ چیدہ عہدیداروں کے علاوہ شہر کے وہ علما بھی تھے جو تاتاریوں کی حمایت اور خوارزم شاہ کی مخالفت میں فتوے شائع کر کے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ خلیفہ کی مسند سے نیچے دائیں طرف شہزادہ معتصم رونق افروز تھا اور اس کے ساتھ علما اور سرداروں کا وہ گروہ کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا جو ترکستان سے بغداد کے خلیفہ اور عوام کے نام تاتاریوں کی دوستی کا پیغام لے کر آیا تھا اور ان کے درمیان ایک جانی پہچانی صورت دیکھ کر عبد الملک کا خون کھولنے لگا۔ یہ مہلب بن داؤد تھا۔ عبد الملک کو اس سے قبل بغداد میں اس کی آمد کی خبر نہ تھی۔ وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نقیب نے مسند کے عقب میں دروازے سے سر نکال کر خلیفہ کی آمد کا

اعلان کیا اور حاضرین اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

خلیفہ نے مسند پر رونق افروز ہونے کے بعد عبد الملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عبد المُلک ہم تمہاری باتیں سن چکے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد ہمارا فرض ہے۔ لیکن معززین جن میں ترکستان کے قابلِ عزّت علما کا وفد بھی شامل ہے، تمہاری اس تجویز کے مخالف ہیں۔ ہم تمہیں ان سب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کا موقع دیتے ہیں۔ اگر انہیں قائل کر سکے تو ہم کل ہی افواج کو یہاں سے روانگی کا حکم دے دیں گے۔ ورنہ ہمیں امید ہے کہ تم ان کے دلائل پر توجہ دو گے۔“ عبد المُلک کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا منہ بند کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ تاہم اس نے کھڑے ہو کر ایک پر جوش طویل اور مدلّل تقریر کی اور بیٹھ گیا۔

بغداد کے علما کو معلوم تھا کہ عبد المُلک اور اس کے ساتھی عوام کو مشتعل کرنا جانتے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی نے فوراً اُٹھ کر جواب دینے کی جرأت نہ کی۔ خلیفہ نے ارکانِ وفد کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی عبد المُلک

کی تقریر کے بعد پریشان نظر آتے تھے۔ مہلب خلیفہ سے بولنے کی اجازت لے کر اُٹھا۔

وہ رائی کا پہاڑ بنانا جانتا تھا۔ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں کو مایوسی کی آخری حد تک پہنچادینا اس کے لیے مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ وہ تاتاریوں کو سینکڑوں کوس دور دیکھنے کی بجائے بغداد کی گلیوں اور بازاروں میں دیکھ رہے تھے۔ مہلب کی تقریر کے بعد ترکستان اور پھر بغداد کے چند علمانے ان کی تائید میں تقریریں کیں اور آخر میں سپہ سالار اور اُمرائے سلطنت نے اپنے خیالات پیش کیے۔ کم و بیش سب کی رائے تھی کہ تاتاریوں کے خلاف جنگ کرنا خودکشی ہے۔

تقریروں کا دوسرا دور جلال الدّین کی شخصیت اور اس کے مذہبی عقائد پر اعتراضات سے شروع ہوا اختتام پر خلیفہ نے عبدالملک سے سوال کیا۔ ”کیوں عبدالملک! تمہاری تسلّی ہوئی یا نہیں۔ جب قوم کے رہنماؤں کی یہی رائے ہے تو ہم ان کے خلاف کیسے جاسکتے ہیں؟“

عبد الملک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی تقریر کا ہر لفظ سامعین کے لیے ایک چبھتا ہوا نشتر تھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ خلیفہ حیران تھا کہ میں نے اسے بولنے کا موقع کیوں دیا۔ عبد الملک کہہ رہا تھا۔

''میری تسلّی ہو چکی ہے۔ مجھے وہ چٹان نظر آرہی ہے جس کے ساتھ قوم کی کشتی ٹکرا کر پاش ہونے والی ہے۔ لیکن آپ یا تو غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا اپنے آپ کو جھوٹی تسلّی دے رہے ہیں۔ یہ لوگ قوم کے رہنما نہیں اور تاتاریوں کی حمایت میں جو آواز انہوں نے یہاں بلند کی ہے، وہ ان کے دل سے نہیں پیٹ سے نکلی ہے۔ ترکستان کے ان آٹھ دس غدّاروں کو قوم کے علما اور سردار کہنا ان ہزاروں علما اور امراء کی توہین ہے جنہوں نے تاتاریوں کی غلامی پر موت کو ترجیح دی اور ہمارے شہر کے یہ بزرگ جو آج بڑے بڑے قیمتی جبّے پہن کر آپ کے دربار میں آئے ہیں، وہ ہیں جو عوام کو اپنی صورت دکھانے سے شرماتے ہیں۔ ان سے پوچھئے۔ کیا ان میں سے کسی کی یہ جرأت ہے کہ بغداد کی کسی مسجد کے منبر پر کھڑا ہو

سکے؟ مجھے اجازت دیجیے تو میں ایک دن میں بغداد کے ہزاروں علما اس محل کے سامنے کھڑے کر دوں اور ان میں سے ہر ایک تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کی تائید کرے گا۔ قوم کے رہنما وہ نہیں جو قوم کو فروخت کر چکے ہیں۔ قوم کے رہنما وہ ہیں جو قوم کے لیے مرنا اور جینا جانتے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین! میں جانتا ہوں کہ میری تقریریں بے سود ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تاجر مسلمانوں کو تاتاریوں کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ یہ لوگ جو آپ کو یقین دلا رہے ہیں کہ تاتاری اہلِ بغداد کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے نہیں توڑیں گے، میں انہیں یقین دلایا ہوں کہ جب تاتاریوں کی تلوار بے نیام ہو گی تو وہ سرخ اور سفید خون میں تمیز نہیں کرے گی۔ یہ مدافعانہ جنگ میں ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں لیکن تباہی میں انہیں ہمارا حصّے دار ضرور بننا پڑے گا۔ مجھے شاید بغداد چھوڑنا پڑے لیکن جب تک میں یہاں ہوں میں ان نام نہاد علما کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے خلاف فتوے شائع نہ کریں اور سلطنت کے ان عہدیداروں سے بھی یہی کہوں گا کہ وہ میرے راستے میں کانٹے نہ پھینکیں، میں انہیں کچلنا جانتا ہوں۔ بغداد میں ان بزرگوں کی کوششوں کے باوجود ایسے لوگ

موجود ہیں جنہیں لاٹھی سے ہانکنا آسان نہ ہو گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ بغداد کے اندر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تاتاری سلطان جلال الدّین کا خیال چھوڑ کر یہاں آنا زیادہ مناسب خیال کریں۔ میں سرکاری افواج کو ورغلانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا لیکن وہ رضاکار جو باہر سے صرف جلال الدّین کی مدد کے ارادے سے آئے ہیں، میں انہیں وہاں بھیجنے میں حق بجانب ہوں۔ ممکن ہے کہ حکومتِ بغداد اور تاتاریوں کی مصالحت کے متعلق سنتے ہی وہ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ وہ جس مقصد کے لیے آئے ہیں اسے پورا کریں۔ میں اب جاتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ایک بات پر خلیفۃ المسلمین کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مہلب بن داؤد وحید الدّین اور سابق وزیر اعظم کا قاتل ہے۔ میرا یہ کہنا بے سود ہے کہ اسے گرفتار کیا جائے۔ لیکن خلیفہ کے محل سے نکلتے ہوئے کسی پر عقب سے حملہ کرنا، خواہ وہ خلیفہ کی اجازت سے ہو یا بغیر اجازت کے، ایک غیر شریفانہ عمل ہے اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کچھ احتیاط کا بھی عادی ہوں۔ محل سے باہر اس وقت کم سے کم دس ہزار آدمی ہیں جو شام تک

میرے واپس نہ جانے کی صورت میں محل کی تلاشی لینے کی کوشش کریں گے۔۔۔اب میں جاتا ہوں۔“

محل سے باہر نکلتے ہوئے عبد الملک کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ کہہ رہا تھا۔ ان پتھروں میں زندگی پیدا کرنا میرے بس میں نہیں۔ بغداد کی تباہی مقدر ہو چکی ہے۔

دروازے سے باہر آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ اس کی زبان سے ایک اہم اعلان سننے کے لیے بر قرار تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر چلنے کی بجائے بھاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کسی نے راستہ روکنے کی جرأت نہ کی۔ شام تک یہ خبر سارے شہر میں مشہور ہو چکی تھی کہ خلیفہ اور تاتاریوں میں دوستانہ معاہدہ ہو چکا ہے۔ رضاکاروں کے دستے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی فکر کر رہے تھے۔

رات کے وقت عبد الملک، سلطان جلال الدّین اور طاہر بن یوسف کے نام طویل مراسلے لکھ رہا تھا اور اس کے مکان سے باہر بغداد کے کئی

نوجوان اور فوجی درس گاہ کے طلبا پہرا دے رہے تھے۔

(۳)

سلطان جلال الدّین ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے بغداد کی افواج کا انتظار کر رہا تھا۔ جوں جوں تاتاریوں کی افواج قریب آ رہی تھیں۔ سلطان کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ایک دن سلطان طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد حسب معمول ایک پہاڑی پر چڑھ کر بغداد سے آنے والی پگڈنڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چند افسر بھی کھڑے تھے۔ اُسے دور ایک بلند پہاڑی کے دامن میں پندرہ بیس سوار دکھائی دیے۔ تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد سلطان خوشی سے چلا تھا۔ ''وہ آ گئے! وہ آ گئے! وہ بغداد سے تین لاکھ فوج کی آمد کی خبر لا رہے ہیں۔ دیکھا، تم کہتے تھے کہ عبد المُلک کا جواب آنے میں چند دن اور لگیں گے، لیکن میں کہتا تھا کہ اگر آدھی رات کے وقت بھی میرا ایلچی بغداد پہنچا تو عبد المُلک اس وقت خلیفہ کو جگا کر میرے مکتوب کا جواب حاصل کرے گا۔ تم خلیفہ کے متعلق شکوک ظاہر کیا کرتے تھے لیکن میں یہ کہتا تھا کہ ابھی خلیفہ کے خاموش رہنے میں

بہت سے مصلحتیں ہیں۔ ہم اب تولائی خان کو وہی سبق دیں گے جو ہم نے افغانستان میں شیگی توتو کو دیا تھا۔ خلیفہ کے ایلچی آرہے ہیں۔ فوج کے تمام سپاہیوں کو حکم دو کہ خیموں سے باہر نکل کر ان کا خیر مقدم کریں!"

تھوڑی دیر بعد سلطان کے سپاہیوں کی مختصر سی جماعت قطاریں باندھے کھڑی تھی۔ سوار قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اترے۔ سلطان نے اپنے چند سالاروں کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور کہا۔ "تم بہت جلد پہنچے۔ تم سب میری طرف سے خلعت کے حق دار ہو۔"

ایک شخص نے آگے بڑھ کر عبد الملک کا مراسلہ پیش کیا۔ سلطان نے کہا۔ "یہ مراسلہ پڑھنے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بغداد کی افواج کب وہاں سے روانہ ہوں گی؟"

وہ ایک دوسرے کی طرف پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ سلطان نے مراسلہ کھولتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یقیناً ان باتوں کا علم نہیں ہو گا۔ عبد الملک بہت محتاط آدمی ہے۔

مراسلہ پڑھتے وقت سلطان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جس پر اچانک بجلی گر پڑی ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مراسلہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گر پڑا۔ وہ مُسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ آنسوؤں سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے معلوم تھا لیکن مایوسی کی انتہا انسان کو خود فریبی کا عادی بنا دیتی ہے۔ میں ریت پر محل تعمیر کر رہا تھا۔ مبارک! عبدالملک کا خط پڑھ کر ان سب کو سُنا دو اور اس کے بعد جو جانا چاہیں، انہیں میری طرف سے اجازت ہے۔ میں طاقت کے خلاف لڑ سکتا ہوں۔ مایوسی کے خلاف لڑ سکتا ہوں لیکن قدرت کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔ مجھے قدرت سے شکایت نہیں۔ ہم پر قدرت کا یہ احسان معمولی نہ تھا کہ اس نے مٹھی بھر انسانوں کو کئی برس تک تاتاریوں کا سیلاب روکنے کی ہمّت دی۔ لیکن جب مسلمان ہی بیدار نہیں ہوتے، جب وہ اجتماعی زندگی پر انفرادی موت کو ترجیح دینا چاہتے ہیں تو قدرت سے کیا شکایت؟ قدرت کسی کے لیے اپنا قانون نہیں بدلتی۔“

سلطان نے ایلچیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم جاؤ! عبد المُلک نے مجھے لکھا ہے کہ وہ چند دن تھوڑے بہت سپاہی لے کر میرے پاس پہنچ جائے گا۔ اسے کہو کہ اب اس کا آنا بے سود ہو گا۔“

سلطان اپنے خیمے میں چلا گیا۔ شام تک چند جاں نثاروں نے کئی بار اس سے ملنے کی کوششیں کی لیکن خیمے کے دروازے پر پہرے دار ہر بار انہیں یہ کہ کر روک دیتا کہ سلطان سو رہا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ جب تم میں نہ بلاؤں، میرے پاس کوئی نہ آئے۔

چند دن کے بعد سلطان نے آذربائیجان کا رُخ کیا۔

(۴)

سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ تبریز کے شمال مغرب میں ایک پہاڑی قلعے میں مقیم تھا۔ تاتاریوں کا لشکر اس کے تعاقب میں تہران تک پہنچ چکا تھا لیکن پہاڑوں پر شدید برف باری کے باعث مشرق اور جنوب سے تاتاریوں کی فوری پیش قدمی کا خطرہ نہ تھا۔ سلطان کے ساتھی ایک ایک

کر کے رخصت ہو چکے تھے اور اب اس کے ساتھ ڈیڑھ سو کے قریب صرف وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہ تھا اور جو زندگی اور موت میں اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ سلطان زیادہ وقت تنہائی میں گزارتا۔ دنیا میں اس کی تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ تیور ملک اور دوسرے جاں نثاروں کی شہادت کے بعد اسے حوصلہ اور تسلّی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وہ صرف جینے کے لیے جی رہا تھا۔

بغداد سے حوصلہ شکن پیغام کے بعد اس نے زندگی کی حقیقتوں سے کنارہ کش ہونے کے لیے شراب نوشی شروع کر دی۔ ہوش کا ہر لمحہ اپنے لیے ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوئے وہ مدہوش رہنے لگا اور جب مدہوشی کی حالت میں بھی تلواروں کی جھنکار کا تصوّر اسے پریشان کرتا تو وہ رقص و سرور کی محفل آراستہ کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن اسے سکون نصیب نہ ہوتا اور ہو اپنے ساتھیوں سے کہتا۔ شراب اور راگ بغداد کے امراء کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بیگانہ کر دیتے ہیں لیکن مجھے ان سے بھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا۔ میں ایک بہت بڑا مینار ہوں جس کی بنیادیں ہِل چکی ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ! مجھے ڈر ہے کہ جب میں گروں گا تم نیچے دب جاؤ گے۔ کبھی وہ قلعے کا دروازہ کھلوا کر باہر نکل جاتا اور پہروں برف باری کے طوفان میں پہاڑیوں پر گھومتا رہتا۔ کبھی وہ شراب کا جام ہونٹوں تک لے جا کر پھینک دیتا اور صراحیاں توڑ ڈالتا۔ کبھی وہ کونے میں پڑی ہوئی تلوار اٹھاتا، اسے نیام سے نکال کر دیکھتا اور اپنے کسی ساتھی کو بلا کر کہتا۔ ”دیکھو، میرا منہ چڑا رہی ہے۔ نہیں شاید میری طرح یہ بے جان لوہا بھی مُضطرب ہے۔ شاید اسے بھی خود فراموشی کی ضرورت ہے۔ جاؤ! اسے شراب کے مٹکے میں ڈبو دو!“

ایک دن برف پڑ رہی تھی۔ قلعے کے اندر سلطان کے سامنے رقص و سرور کی محفل گرم تھی۔ شراب کے دور چل رہتے تھے۔ دروازے کے پہرے دار نے آ کر اطلاع دی کہ بغداد سے عبد المُلک آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آ پہنچا ہے۔ اور وہ حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

سلطان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”عبد المُلک! وہ یہاں کیسے پہنچا؟ اسے اب

مجھ سے کیا کام ہے؟ اور کون ہے اس کے ساتھ؟"

"پانچ سپاہی اور میں!"

"تم نے اسے یہ کیوں بتایا کہ ہم یہاں ہیں؟"

"میں نے کہا تھا کہ آپ یہاں نہیں لیکن وہ پاس کی بستی سے ایک رہنما اپنے ساتھ لایا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آذربائیجان میں کئی ہفتے بھٹکنے کے بعد اس نے بڑی مشکل سے آپ کا سراغ لگایا ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "سلطانِ معظّم۔ ممکن ہے کہ وہ بغداد سے کوئی اچھی خبر لایا ہو۔"

سلطان نے چلّا کر کہا۔ "میرے سامنے بغداد کا ذکر نہ کرو۔ بلاؤ اُسے!"

عبد الملک نے کمرے میں داخل ہو کر محفل کا رنگ دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

"آؤ عبد الملک! آگے آ جاؤ۔ رُک کیوں گئے؟ میرے قریب بیٹھو۔"

سلطان نے یہ کہتے ہوئے شراب کا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

خوارزم شاہ نے گانے والوں سے کہا۔ ”تم کیوں خاموش ہو گئے۔ گاؤ۔“

راگ پھر شروع ہوا۔ سلطان نے شراب کی صراحی سے پھر پیالہ بھرا اور چند گھونٹ پینے کے بعد اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”عبد الملک! میں سمجھتا تھا کہ یہ مقام زندگی کی نگاہوں سے بہت دور ہے۔ مجھے امید تھی کہ یہاں تک میرا پیچھا کوئی نہیں کرے گا لیکن اب مجھے ٹھکانہ بھی بدلنا پڑے گا۔ تم بغداد کی افواج کہاں چھوڑ آئے؟ تم نے یہاں آ کر ان باتوں کی یاد تازہ کر دی جنہیں میں بھول جانا چاہتا تھا۔“

سلطان نے پھر شراب کا پیالہ اٹھا لیا لیکن عبد الملک نے اس کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر دور پھینک دیا اور خنجر نکال کر سلطان جلال الدّین کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطانِ معظّم! میں نے شاید گستاخی کی ہے۔ یہ لیجیے مجھے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیجیے۔ میں یہ نہیں دکھ سکتا۔ میری آنکھیں نکال دیجیے۔“

راگ بند ہو چکا تھا اور محفل میں سناٹا چھا رہا تھا۔ سلطان نے غیر متوقع اطمینان کے ساتھ عبد الملک کی طرف دیکھا اور صراحی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو اسے بھی توڑ ڈالو۔ میں خود کئی مرتبہ انہیں توڑ چکا ہوں۔ ایسی چیزیں ٹوٹنے سے ختم نہیں ہوتیں۔ یہ مٹی کے ٹھیکرے ہیں جو ایک بار ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جُڑ سکتے ہیں اور اگر نہ جُڑ سکیں تو نئے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ انسان کا دل نہیں جو ایک بار ٹوٹنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاتا ہے۔“

عبد الملک کی پریشانی اور تذبذب پر سلطان جلال الدّین نے صراحی دیوار کے ساتھ دے ماری۔

عبد الملک نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”سلطانِ معظّم! میں اپنی زندگی میں صرف ایک آدمی دیکھا تھا جو مایوس ہونا نہیں جانتا تھا لیکن آج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!“

جلال الدّین نے کہا۔ ”وہ انسان جسے تم جلال الدّین خوارزم شاہ کے نام

سے جانتے تھے، مر چکا ہے، اس وقت تم اس کی لاش سے باتیں کر رہے ہو۔ ہاں یہ بتاؤ تم یہاں کس طرح پہنچے؟"

"میں بغداد سے رضا کاروں کی ایک جماعت لے کر آیا تھا اور۔۔۔۔۔۔۔!" سلطان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کتنے رضا کاروں کی جماعت؟"

"میرے ساتھ پانچ ہزار آدمی روانہ ہوئے تھے۔"

"تم غلطی کی۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔"

"آپ کا پیغام مجھے اس وقت ملا جب میں بغداد سے ایک منزل آگے آ چکا تھا اور آپ کا حکم سُن کر تین ہزار سپاہی واپس چلے گئے اور۔۔۔"

سلطان نے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور باقی دو ہزار یقیناً کسی مقام پر تاتاریوں کے نرغے میں آ گئے ہوں گے؟"

عبد الملک نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں تبریز اور ہمدان کے

درمیان ہمیں ان کے چند دستوں نے گھیر لیا تھا۔"

"کتنے سپاہی زندہ بچے؟"

"کوئی دوسو۔ کیونکہ تبریز پہنچ کر آپ کا پتہ نہ ملا۔ اس لیے پانچ کے سوا باقی سب مایوس ہو کر چلے گئے اور ان پانچ کے ساتھ قریباً دو ماہ آپ کو ان پہاڑوں میں تلاش کرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں۔"

جلال الدّین نے کہا۔ "تم نے اتنی جانیں بے فائدہ ضائع کیں۔"

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے کُردستان سے چکر کاٹ کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ آپ کے اعترافِ شکست کے بعد ان لاکھوں انسانوں کی قربانی رائیگاں جائے گی جو آخری فتح کی امید پر آپ کا ساتھ دیتے رہے؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "تو تم یہ چاہتے ہو کہ جب تک میں زندہ رہوں، تھوڑے تھوڑے مسلمان جمع کر کے موت کے منہ میں دھکیلتا رہوں۔ میں آج تک اس امید پر لڑتا رہا کہ کبھی تو عالمِ اسلام بیدار ہو گا۔ میں

انہیں تیاری کے لیے وقت دینا چاہتا تھا اور میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ انہوں نے مراکش سے لے کر ہندوستان تک میرے پاس تسلّی کے پیامات بھیجے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ میں اب اُٹھوں تو کسی سہارے پر لڑوں؟ لڑوں تو کس امید پر؟ تم اس قوم سے کیا توقع رکھتے ہو جس کے امراء ملت فروش ہوں، جس کے علما میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو چکی ہو جو بر سرِ منبر تاتاریوں کی غلامی کا فتویٰ دیتی ہو۔ جس کے سپاہیوں کی تلوار کا لوہا دشمن کی آنچ سے پگھل چکا ہو اور جس کا خلیفہ۔۔۔ میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ سب کچھ خلیفہ کی وجہ سے ہوا ہے لیکن خلیفہ کی بد عہدی کے بعد خدا کی رحمت کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ آپ پر ہندوستان نہیں تو مصر اور مراکش کے دروازے کھلے ہوں گے۔ ہم تاتاریوں سے شمال کے برفانی علاقوں کی شکست کا بدلہ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں لے لیں گے۔ شاید ابھی تک خدا کی رحمت کے نزول کا وقت نہیں آیا لیکن ہم اس وقت تک لڑیں گے جب تک خدا کی رحمت جوش میں نہیں آتی۔

فرض کیجیے کہ تاتاریوں کو ترکستان سے نکالنا آپ کے مقدر میں نہیں۔ لیکن یہ تو آپ کے بس میں ہے کہ سلطان اور سپہ سالار کی بجائے ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنی خدمات کسی اور سلطنت کو سونپ دیں!"

سلطان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم مجھے پریشان کیوں کرتے ہو؟ میں کئی سلطنتوں کو پیغام بھیج چکا ہوں اور ان کے جواب بھی آ چکے ہیں۔ وہ حق بجانب ہیں۔ ایک ہارے ہوئے بادشاہ کو پناہ دینا آسان نہیں اور میری تلاش میں تو تاتاریوں کی پانچ لاکھ فوج دن رات ایک کر رہی ہے۔ وہ اپنی فوج میں ایک شکست خوردہ سپاہی کا اضافہ کر کے پانچ لاکھ تاتاریوں کو حملے کی دعوت کیوں دیں۔ میں صرف ایک سپاہی تھا اور اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ میرے پاس تلوار تھی اور جب تک اس کی دھار کند نہیں ہوئی، میں لڑتا رہا۔ لیکن تم سپاہی کے علاوہ ایک عالم بھی ہو اور تمہارا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔ تم جاؤ۔ اب میرا اور تمہارا راستہ مختلف ہے۔"

عبدالملک نے کہا۔ "لیکن ایک راستہ ہے جو ہم دونوں کے لیے کھلا ہے۔"

”وہ کیا؟“

”عزّت کی موت! ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

جلال الدّین اٹھ کھڑا ہو گیا اور کوئی بات کہے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو سواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ حاضرین مجلس کھڑے ہو گئے۔

سلطان نے کہا۔ ”عبد الملک عزّت کی موت کے لیے مجھے ساتھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دنیا کے تمام آلام کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے چین نصیب نہ ہو سکا۔ میں نے نغموں کی تانوں میں سونے کی کوشش کی لیکن تلواروں کی جھنکار میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ میں جاتا ہوں اور تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ کوئی میرا پیچھا نہ کرے۔ میں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے تمہاری تلواروں کا محتاج تھا لیکن اب اپنے لیے کسی کی جان خطرے میں ڈالنا گوارا نہیں کروں گا۔ عبد

الملک! تمھیں میری شراب نوشی سے دُکھ ہوا ہو گا۔ میرے دل میں تیمور ملک کے خون کے بعد تمھارے آنسوؤں کی بڑی قدر ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم واپس جا کر اپنا کام جاری رکھو تمھارے لیے ہندوستان جانا بہتر ہو گا۔ طاہر شاید ابھی تک وہاں ہو۔ اگر وہ ملے تو میری طرف سے کہو کہ سلطان التمش کے پاس رہے۔ اگر وہ نہ مانے تو اسے کہنا کہ یہ میرا حکم ہے۔ میرا آخری حکم!"

سلطان نے ایک شخص کو گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔

ایک سردار نے سوال کیا۔ "لیکن آپ اس برف باری میں کہاں جائیں گے؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "میں تمھیں یہ سوال پوچھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو یہ دعا کرو کہ خدا مجھے عزّت کی موت سے محروم نہ کرے اور تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھاری موجودگی کی وجہ سے تاتاری اس علاقے کو بھی تباہ و برباد کر

دیں۔ عبدالملک! ان لوگوں میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے گھر بار نہیں۔ میں انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں تم انہیں ہندوستان لے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان التمش ان کی مدد کرے گا۔"

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ قلعے کے دروازے کے باہر کھڑے سلطان کو الوداع کہہ رہے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ جس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو ایک شخص نے بھاگ کر اس کی رکاب پڑلی اور رو کر کہا۔ "میں بچپن سے آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اپنے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا۔ تم میرے ساتھ آسکتے ہو لیکن کسی اور نے حکم عدولی کی تو مجھے بہُت دکھ ہو گا۔"

سلطان جلال الدّین خوارزم شاہ برف باری کے طوفان میں روپوش ہو گیا اور اس کے بعد کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ کئی برس تک اس کے متعلق عجیب و غریب داستانیں مشہور ہوتی

رہیں۔ کبھی یہ افواہ اُڑتی کہ اسے فلاں بستی میں ایک درویش کے لباس میں دیکھا گیا ہے۔ کبھی یہ مشہور ہوتا کہ وہ کسی جنگل میں گوش نشینی اختیار کر چکا ہے اور بھی بھی خبر آئی کہ وہ دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر تاتاریوں سے آخری جنگ لڑنے کے لیے جانبازوں کی ایک زبردست فوج منظّم کر رہا ہے اور اچانک کسی دن فلاں مقام سے ظاہر ہو گا۔

تاتاریوں نے اس کی تلاش میں ملک کا کونہ کونہ چھان مارا۔ سینکڑوں آدمیوں کو جلال الدّین سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کا سراغ لگانے والوں کے لیے بڑے بڑے انعامات مقرر کیے لیکن اس کا پتہ نہ لگا۔

بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ ایک عام سپاہی کے لباس میں تاتاریوں کی کسی چوکی پر حملہ کرنے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اسے قوم کے کسی غدّار یا تاتاریوں کے کسی جاسوس نے قتل کر دیا ہے۔

بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ آہستہ آہستہ اس بات پر یقین کرنے لگے کہ شیر خوارزم اس دنیا میں نہیں۔

(۵)

ایک شام بغداد سے چند منازل کے فاصلے پر عبد الملک اور اس کے ساتھی ایک بستی کی سرائے کے سامنے کر گھوڑوں سے اترے۔ رات کے وقت جب سرائے کے تمام کمرے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے تو سرائے کے مالک نے عبد الملک کے کمرے میں آ کر کہا۔ ”ایک اور معزّز آدمی آیا ہے۔ باقی کمروں میں تو تل دھرنے کے لیے جگہ نہیں۔ آپ کو اس کے لیے تکلیف اٹھانی پڑے گی۔“

عبد الملک نے کہا۔ ”میں اسے دیکھے بغیر اپنے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ سرائے کے مالک نے کہا۔ ”وہ بہت تھکا ہوا ہے اور تاتاریوں کا جاسوس معلوم نہیں ہوتا۔“

عبد الملک نے کہا۔ ”تاتاریوں کا نہیں تو خلیفہ کا جاسوس ہو گا۔“

"مجھے یقین ہے کہ وہ جاسوس نہیں۔ سرائے والوں کے ساتھ جاسوس اس طرح تحکمانہ انداز سے پیش نہیں آتے۔ میرے انکار پر اس نے پیٹ پھاڑ ڈالنے کی دھمکی دے دی ہے۔"

ایک شخص نے اندر داخل ہو کر کہا۔ "ان کے ساتھ میں فیصلہ کر لیتا ہوں تم فوراً کھانا لاؤ۔"

"طاہر!" عبد الملک نے بھاگ کر نووارد سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"میں بغداد سے آیا ہوں اور سلطان کی تلاش میں آذربائیجان جا رہا ہوں۔"

عبد الملک نے سوال کیا۔ "تم بغداد کب پہنچے؟"

"چار دن ہوئے۔ آدھی رات کے وقت بغداد پہنچا اور تمہارے گھر سے تمام حالات معلوم کر کے علی الصبح اس طرف لوٹ آیا۔"

”تو تمہیں تمام حالات معلوم ہو چکے ہیں۔“

طاہر نے مایوسی کے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں!“

عبدالملک نے کہا۔ ”تم نے یہاں پہنچنے میں بہت دیر لگائی۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”مجھے سلطان التمش نے بنگال کی ایک مہم پر بھیج دیا تھا۔ تمہارا قاصد مجھے دیر سے ملا۔“

”تمہاری بیوی کہاں ہے؟“

”اسے دہلی چھوڑ آیا ہوں۔ یہ سفر بہت کٹھن تھا۔ بغداد سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ تم پر تاتاریوں نے راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ مجھے تمہارے متعلق بھی تشویش تھی۔ اب تم کدھر جا رہے ہو؟“

”میں صرف بچوں کو لینے بغداد جا رہا ہوں۔“

”اور اس کے بعد؟“

”اس کے بعد ہندوستان جانے کا ارادہ ہے؟“

"سلطان جلال الدّین نے سلطان التمش کے نام کوئی پیغام دیا ہے؟"

"نہیں؟"

طاہر کے چند سوالات کے جواب میں عبد المُلک نے اپنی سرگزشت بیان کی۔ طاہر دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سرائے کے مالک نے کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔

عبد المُلک نے کہا۔ "میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ بغداد لے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ تھا کہ انہیں اس سرائے میں ٹھہرا کر بغداد سے بچوں کو یہاں لے آؤں اور پھر ہندوستان کا رخ کریں۔ اب تم آ گئے ہو اور مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہو۔"

طاہر نے کہا۔ "اگر ہم سلطان کو تلاش کر کے ہندوستان کے جانے پر آمادہ کر سکیں تو مجھے یقین ہے کہ اب سلطان التمش کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ جلال الدّین کا پیغام جانے پر وہ تاتاریوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے لیے تیار ہو گئے تھے۔"

"لیکن خوارزم شاہ کو اوّل تو ڈھونڈنا آسان نہیں اور اگر ہم انہیں تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو وہ ہندوستان جانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ایک گری ہوئی دیوار دوبارہ استوار کی جا سکتی ہے، گرے ہوئے پہاڑ کو دوبارہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا!" طاہر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "بہت اچھا۔ تم اپنے ساتھیوں کو یہاں چھوڑ دو لیکن میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی لیکن وہاں بجھی ہوئی راکھ میں پھونکیں مارنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اب تو وہاں ایسے علما بھی پیدا ہو چکے ہیں جو تاتاریوں کو ظل اللہ، اولی الامر کہتے ہیں۔"

"میں وہاں اپنا آخری فرض پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"میں عوام کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کی تباہی آنے والی ہے، اگر وہ آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو میں نہیں کہوں گا کہ

وہ اپنے لیے کوئی اور جائے پناہ تلاش کر لیں۔ خلیفہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسے کم از کم اپنے گھر کی حفاظت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"لیکن یہ سب بے سود ہے اور تمہیں شاید یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ تاتاریوں کے ساتھ معاہدہ کرتے ہی خلیفہ نے مہلب کو وزیر اعظم بنا دیا ہے۔"

"میں اس لیے بھی وہاں جانا چاہتا ہوں۔ ہاں! مبارک کہاں ہے؟"

"وہ بغداد میں ہے!"

آخری پیغام

بغداد میں نہ ختم ہونے والے مناظروں کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ دریا کے کنارے ایک کھلے میدان میں شیعہ و سنی علما کا ایک زبردست مناظرہ ہو رہا تھا۔ دونوں جماعتوں کے بڑے علما اس مناظرے میں حصّہ لے رہے تھے اور عوام یہ محسوس کرتے تھے کہ کھوئی ہوئی دلچسپیاں پھر لوٹ آئی ہیں۔

ہمدان میں تاتاریوں کی افواج کا اجتماع اہل بغداد کے لیے ایک تلخ حقیقت تھی۔ خلیفہ اور تولائی خان کے درمیان دوستانہ تعلقات کے باوجود کسی کو غلط فہمی نہ تھی کہ تاتاری موقع ملنے پر بغداد پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ لیکن اہل بغداد کی مثال اس شتر مرغ سے کم نہ تھی جو افق پر

آندھی کے آثار دیکھ کر ریت میں سر چھپالیتا ہے۔ مباحثے اور مناظرے ان کے لیے خواب آور نشہ تھا۔ اسلام کے دشمن ترکستان، خراساں اور ایران کے میدانوں میں پڑاؤ ڈال کر عالمِ اسلام پر آخری ضرب لگانے کے لیے اپنی تلواریں اور نیزے درست کر رہے تھے اور بغداد میں اسلام کے نام لیوا صرف یہ جاننے کے لیے بے قرار تھے کہ کسی فرقے کے علما کی زبان کے نشتر دوسروں کی نسبت زیادہ تیز اور زیادہ زہر آلود ہیں۔

طاہر بن یوسف اور اس کے ساتھیوں نے ان میں ایک عارضی زندگی پیدا کی تھی اور ان کی سرگرمیوں سے ان علما کا کاروبار کچھ عرصے کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ جو گزشتہ چار صدیوں سے ایک دوسرے کو جھوٹا اور کافر ثابت کرنا اسلام کی بہت بڑی خدمت سمجھتے تھے اور ان کی جگہ ان حق پرست علمانے چھین لی تھی جو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نام لیوا کو تباہی اور بربادی سے بچنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ لیکن حق پرستوں کی یہ جماعت بھی ان لوگوں کو تلوار کی اہمیت سمجھانے میں

کامیاب نہ ہو سکی جو صدیوں سے اپنے ہر درد کا علاج کتابوں میں تلاش کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ طاہر کی دعوت پر میدان میں آئے اور ان کی کوششوں سے عوام کی ذہنیت میں اچانک ایک تبدیلی آ گئی۔ وہ باتوں کی بجائے عمل میں اپنی نجات محسوس کرنے لگے۔ وہ خوارزم شاہ کو اپنا آخری دفاعی حصار سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن بدلے ہوئے حالات کے ساتھ یہ جوش و خروش ٹھنڈ پڑ گیا۔ دور دراز سے آئے ہوئے رضا کار مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ خلیفہ ان کی حفاظت کا ضامن تھا اور خلیفہ کے نئے وزیر نے انتہائی دور اندیشی اور تدبر سے کام لے کر تاتاریوں کو اہلِ بغداد کے محافظ اور دوست بنا دیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں اتحاد، تنظیم اور جہاد پر زور دینے والے علما کی اہمیت کم ہونے لگی اور وہ پھر اپنے ان رہنماؤں کی طرف متوجہ ہو گئے جو ایک کامیاب مناظر بننا دنیا آخرت کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ شیعوں اور سُنّیوں کا یہ مناظرہ بغداد میں علم و عرفان کی بارش کے نزول کے دورِ ثانی کی ابتدا تھی۔

(۲)

یہ مناظرے کی تیسری رات تھی۔ آمنے سامنے دو اسٹیجوں پر شامیانے نصب تھے اور مناظرے میں حصّہ لینے والے علما کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ ان کے سامنے بڑی بڑی میزوں پر کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ روشنی کے لیے دونوں جماعتوں کے رضا کار مشعلیں اٹھائے کھڑے تھے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ فانوس لٹک رہے تھے۔ درمیان میں ثالث کی اسٹیج تھی اور چاروں اطراف لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔

گزشتہ دو دن مناظرے کے اصول اور قواعد طے کرنے میں صرف ہوئے تھے۔ دونوں جماعتوں کے علما نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ وہ اشتعال انگیزی سے کام نہیں لیں گے۔ سامعین کا یہ خیال تھا کہ یہ دلچسپی کم از کم چھ ماہ تک ختم نہ ہو گی اور کسانوں کے سوا اکثر لوگ مناظرے کے اختتام تک موسم میں تبدیلی کے خواہشمند نہ تھے۔ وہ بارہا یہ آزما چکے تھے کہ اگر آندھی بارش کی وجہ سے مناظرہ ایک یا دو دن ملتوی ہو جائے تو مناظرین تازہ دم ہونے کے بعد پھر ابتدا سے بحث شروع کر دیتے ہیں۔ آج شام

کے قریب اُفقِ مغرب پر سیاہی چھارہی تھی لیکن لوگوں کا خیال تھا کہ اس موسم میں آندھی نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ مناظرہ شروع ہونے سے پہلے ثالث کی درخواست پر لوگ یہ دُعا بھی کر چکے تھے کہ آج کی مجلس بخیر وخوبی ختم ہو۔

صفیں آراستہ ہو چکی تھیں۔ اور دین کے مورچوں میں بیٹھ کر علم کی توپیں گولہ باری کرنے والی تھیں لیکن آندھی کا ایک تند و تیز جھونکا آیا مشعلیں بجھ گئیں۔ شامیانوں کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور شامیانوں کے ساتھ لٹکے ہوئے فانوس کی بدولت دونوں اسٹیجوں پر آگ لگ گئی۔ علما بچ کر باہر نکل آئے لیکن افراتفری میں وہ کئی بیش قیمت کتابیں باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

چند بگولوں کے بعد ہوا تھم گئی اور مطلع صاف ہو گیا لیکن اسٹیجوں پر آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ثالث کے اسٹیج آگ سے محفوظ تھی۔ اس کا سائبان بھی سلامت تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں آگ کی بڑھتی ہوئی روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ بارش کے قریب ایک شخص

سپاہیانہ لباس پہن کر کھڑا ہے اور وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے خاموشی کی تلقین کر رہا ہے۔

قریب سے دیکھنے والے اکثر لوگوں نے اسے پہچان لیا اور تھوڑی دیر میں میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک طاہر بن یوسف! طاہر بن یوسف!! کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ چاروں اطراف سے سمٹ کر ثالث کی میز کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں سے اس شامیانے کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو چکا تھا لیکن چند آدمیوں نے طنابیں کاٹ کر شامیانہ ایک طرف پھینک دیا۔

طاہر بن یوسف کو تقریر کے لیے آمادہ دیکھ کر ثالث نے کہا۔ ”میں اپنی اسٹیج سے کسی کو تقریر کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لیکن عبد الملک نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کہا۔ ”آپ خاموش رہیں تو بہتر ہے ورنہ میرا خنجر بہت تیز ہے۔ یہ جلسہ آپ کی صدارت میں ہو گا۔ آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں!“

مناظرین کی توجہ جلتے ہوئے سائبانوں کے نیچے دبی ہوئی کتابوں پر مرکوز تھی۔ اس لیے انہیں یہ احساس نہ تھا کہ ثالث کی اسٹیج پر کیا ہو رہا ہے اور جب وہ طاہر بن یوسف کا نام سن کر چوکنے ہوئے، وہ تقریر شروع کر چکا تھا اور اس کے یہ چند فقرے عوام کے توجہ جذب کرنے کے لیے کافی تھے:

"زندگی کا تمسخر اڑانے والو! اس آندھی اور آگ کو قدرت کی طرف سے ایک انتباہ سمجھو۔ تم نے بابل و نینوا کی تباہی کی داستانیں سنی ہوں گی۔ لیکن خدا وہ دن نہ لائے جب مستقبل کے سیّاح ماضی کے کھنڈر دیکھ کر یہ کہیں کہ یہاں کسی زمانے میں ایک عظیم الشان شہر آباد تھا۔ جس کا نام بغداد تھا۔ جس میں بیس لاکھ انسان آباد تھے۔ جس کے محل پانچ صدیوں کی تعمیری یادگار تھے لیکن بابل اور نینوا کے باشندوں کی طرح انہیں بھی ایک عبرت ناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ صرف اس لیے کہ وہ اپنی کوتاہی عمل کے جواز کے لیے خدا اور رسول کے احکام کی تاویلیں کرتے تھے۔ انہوں نے قرآن حکیم سے درسِ حیات لینا ترک کر دیا تھا۔ قرآن

نے انہیں اتحاد و تنظیم کا درس دیا تھا لیکن ان کی زندگی کا اوّلین مقصد مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا تھا۔ خدا نے انہیں کفار سے جہاد کا حکم دیا تھا لیکن وہ کفار کو اپنا محافظ و نگہبان سمجھ کر آپس میں دست و گریبان ہو رہے تھے۔ بربریت کا بے پناہ طوفان ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور وہ آنے والی تباہی سے آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے پر الفاظ کے تیر برسانا کافی سمجھتے تھے۔ بغداد کے لوگو! تمہارا خلیفہ اور تمہارے امرا صرف چند سال امن اسے گزارنے کے لیے تمہیں اور تمہاری آنے والی نسلوں کی عزّت اور آزادی تاتاریوں کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں لیکن وہ امراء جو یہاں موجود ہیں، کان کھول کر سن لیں کہ بغداد کا انجام خوارزم کے شہروں سے مختلف نہیں ہو گا۔ تم نے بجلیوں کو بغداد کے خرمن تک پہنچنے کی دعوت دی ہے۔ تم نے آگ کے شعلوں کو اپنے گھر بلایا ہے۔ آگ صرف جلانا جانتی ہے اور یاد رکھو! جب وہ جلائے گی تو محلوں اور جھونپڑوں میں تمیز نہیں کرے گی!

مسلمانو! تمہاری تاریخ شاہد ہے کہ آج تک تمہیں کسی کی تلوار مغلوب

نہیں کر سکی۔ تمہارے لوہے نے ہر لوہے کو کاٹا ہے۔ تمہاری مٹھی بھر افواج نے دشمن کی بڑی بڑی افواج کو شکستیں دی ہیں۔ تمہاری کسی ناکامی کا باعث تمہاری کمزوری نہ تھی بلکہ تم نے اگر کہیں شکست کھائی تو وہ تمہاری آپس کی پھوٹ کا نتیجہ تھی۔ تم نے اگر کہیں تباہی کا سامنا کیا تو وہاں تمہارے غدّاروں کا ہاتھ موجود تھا!“

ایک شخص نے بلند آواز میں کہا۔ ”جلال الدّین کی شکستوں میں بھی کسی غدّار کا ہاتھ تھا؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ جلال الدّین کو تاتاریوں نے شکست دی؟ وہ ایک چٹان کی طرح تاتاریوں کے سیلاب کی لہروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ بڑے بڑے طوفان اُسے متزلزل نہ کر سکے لیکن اس چٹان کو نابود کرنے کے لیے تاتاریوں کو عالمِ اسلام کے معماروں نے اپنے تیشے پیش کیے۔ جلال الدّین کو مایوس کر کے تم اپنے مددگار کھو بیٹھے ہو۔ وہ بغداد کے دروازوں پر پہرہ دے رہا تھا لیکن اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا گیا۔ اس نے چند برس تاتاریوں کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی تا

کہ تمہیں تیاری کا موقع مل جائے۔ ترکستان، خراسان اور ایران کے شہروں کا حشر تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا لیکن تم نے اجتماعی زندگی پر انفرادی موت کو ترجیح دی۔ تم نے اس شخص کے پاؤں پر کلہاڑی ماری جو تمہارے حصّے کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ بغداد کے لوگو! تمہاری مرضی سے یا تمہاری مرضی کے خلاف خلیفہ نے تمہارے لیے کانٹے بوئے ہیں۔ تم مستقبل سے پھولوں کی توقع نہ رکھو۔ کیا تم نہیں سوچتے کہ بغداد۔۔۔!"

طاہر نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ دریا کے اونچے کنارے کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور بیک وقت تین تیر طاہر کی زرہ میں اٹک گئے۔ اسٹیج کے آس پاس چند آدمی زخمی ہوئے اور چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔ طاہر نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی اور بلند آواز میں کہا۔ "بغداد کے لوگو! میرا پیغام سن کر جاؤ۔"

عبد الملک نے جلدی سے طاہر کو دھکا دے کر اسٹیج سے نیچے اتار دیا۔ تیروں کی ایک بوچھاڑ آئی اور سٹیج کے آس پاس چند اور آدمی زخمی ہو گئے

اور اتنی دیر میں طاہر کے کئی عقیدت مند تلواریں سونت کر دریا کے کنارے کی طرف بھاگ رہے تھے اور نہتے لوگ بھی ان کی تقلید کر رہے تھے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے تیر انداز رفو چکر ہو چکے تھے اور دریا میں چند کشتیاں دوسرے کنارے کا رخ کر رہی تھیں۔ عبد المُلک نے چند رضا کاروں کو کنارے پر پہرہ دینے کے لیے کہا اور بھاگتا ہوا واپس طاہر کے پاس پہنچا۔ وہ بھاگ گئے لیکن تم زخمی ہو۔ چلو یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

لیکن طاہر نے اپنی زرہ میں اٹکے ہوئے دو تیر نکال کر پھینک دیے اور کہا۔ "یہ زخم بہت معمولی ہیں۔ تیسرا تیر تم نکال دو۔"

"لیکن خون؟"

"چند قطرے کوئی بڑا نقصان نہیں۔ جلدی کرو! میں چند باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

عبد المُلک نے تیر نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہاری مرضی لیکن یہ وہ مردے نہیں جو صورِ اسرافیل سے جاگ اُٹھیں۔"

(۳)

طاہر پھر ایک بار اسٹیج پر کھڑا ہو گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ اس نے کہا۔

"بغداد کے لوگو! کیا تم نہیں سوچتے کہ تمہاری غدّاری کی وجہ سے خوارزم کے لاکھوں شہیدوں کا خون رائیگاں جائے گا۔ یتیموں کی آہیں اور بیواؤں کے آنسو بے اثر ثابت ہوں گے۔ یاد رکھو! بغداد کے وہ لوگ جنہوں نے خوارزم شاہ کے ساتھ غدّاری کی ہے، قوم کے وہ مجرم ہیں جنہیں قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ قدرت کے فیصلے اٹل ہیں۔ شاید میری دعائیں انہیں بدل نہ سکیں۔ لیکن اگر تم صرف زندہ ہی رہنا چاہتے ہو تو بھی میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم بغداد چھوڑ کر کہیں دور چلے جاؤ۔ وہ شہر جس کے اندر اتنے غدّار اور بد طینت لوگ ہوں، قدرت کے انتقام سے نہیں بچ سکتے۔ میرا مشورہ شاید ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو جو تاتاریوں سے ملّت فروشی کی قیمت وصول کر چکے ہیں لیکن عوام سے میں یہ کہوں گا کہ وہ یہاں نہ رہیں۔ تمہارے علما کی فتنہ پروری، امراء کی غدّاری اور خلیفہ کی ناعاقبت اندیشی کے باعث بغداد زمین کے سینے پر ایک

ناسور بن چکا ہے اور قدرت جب جرّاحی پر آمادہ ہوتی ہے تو اس کا تیز اور بے رحم نشتر گندے خون کے ساتھ صاف خون بھی نکال دیتا ہے۔

یہ مت سمجھو کہ تمہارے خلیفہ کی روحانیت تمہاری حفاظت کی ضامن ہے اور تاتاری چونکہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر ہیں اس لیے تمہارے جیسے نام نہاد مسلمانوں پر بھی غالب نہیں آسکتے۔ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت صرف ان کے لیے ہے جو ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ تاتاری کافر ہیں لیکن تم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو لیکن عملی طور پر تم خدا اور رسول کے احکام سے منکر ہو۔ تاتاری نظامِ باطل کی فتح کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں۔ اسلام تمہیں جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام تمہیں یہ بتاتا ہے کہ تم دنیا سے تمام فتنوں کو ختم کرنے لیے پیدا ہوئے ہو لیکن تم خدا کے صریح احکام کے باوجود جنبش تک نہیں کرتے۔ یاد رکھو! ایک پست ہمت اور بُزدل قوم خدا کی رحمت کی مستحق نہیں بن سکتی۔ تم اسلاف کی امانت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ تم مٹ جاؤ گے تو اسلام بھی مٹ جائے

گا۔ نہیں، خدا اپنے دین کا بول بالا کرنے کے لیے کسی اور قوم کو منتخب کر لے گا۔ خدا کا دین تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ قدرت سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ تم سے مایوس ہو کر اُن تاتاریوں کو جو آج اسلام کے بدترین دشمن ہیں، اسلام کی پاسبانی کے لیے منتخب کر لے۔ اسلام کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو خدا کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوتا۔ ایسی گردن کی ضرورت ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا نہیں جانتی۔ ایسی تلوار کی ضرورت ہے جو زخم کھانا نہیں جانتی۔ اسلام کو ایسے سپاہی کی ضرورت ہے جو خدا کی راہ میں فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر لڑ سکتا ہے۔ اسلام کو نیک دل، نیک خُو اور نیک طینت انسانوں کی ضرورت ہے جو اپنوں سے غدّاری نہیں کرتے۔ ان علما کی ضرورت نہیں جو کفّار کی حکومت کے حق میں فتویٰ دیتے ہیں۔ ان علما کی ضرورت ہے جو تیروں کی بارش اور تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھتے ہیں۔ خدا کے دین کو ان سنگ مرمر کے مکانوں میں رہنے والوں اور بیش قیمت قبائیں زیبِ تن کرنے والے امراء کی ضرورت نہیں، ان صابر و شاکر سپاہیوں کی ضرورت ہے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑ سکتے ہیں۔

بغداد کے لوگو! تمہارے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی پچھلی کوتاہیوں سے توبہ کر کے مستقبل کی فکر کرو اور آنے والی مصیبت کے مقابلے کے لیے متحد ہو جاؤ۔ لیکن یہ تم اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک تم بغداد کی گلی کوچوں کو غدّاروں اور فرقہ بازوں کے وجود سے پاک نہیں کر دیتے۔ تمہارے لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ اس پر خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ دجلہ کا پانی تمہارے خون سے سرخ ہونے والا ہے اور تاتاری کھوپڑیوں سے اپنی فتح کی یادگاریں تعمیر کرنے والے ہیں۔ یہ شہر وحشت اور بربریت کا وہ دور دیکھنے والا ہے جو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ شاید بغداد کی تباہی کے سامنے بابل اور نینوا کی تباہی کی داستانیں بھی ماند پڑ جائیں۔

اس تقریب کے اختتام کے ساتھ میں بغداد میں اپنا آخری فرض پورا کرتا ہوں، اس کے بعد تم مجھے نہیں دیکھو گے اور یہ اس لیے نہیں کہ میں خطرے سے بھاگ رہا ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ میں خودکُشی کرنے والوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان لوگوں کا ساتھ دینا بہتر سمجھتا ہوں جو زندہ رہنا

چاہتے ہیں۔ میں اس لیے جا رہا ہوں کہ تم میری ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے اور تم بغداد کو غدّاروں کے وجود سے پاک کرنے کے لیے تیار ہو اور تاتاریوں کی حفاظت میں زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دیتے ہو تو میں عزّت کی موت میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ ذلّت کی زندگی میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔۔۔۔ خدا حافظ۔"

مناظرین نے اطمینان کا سانس لیا اور طاہر اسٹیج سے اتر کر عبد الملک اور چند نوجوانوں کے ساتھ تاریکی میں غائب ہو گیا۔

عبد الملک ایک دن پہلے اپنے بچوں کو بغداد سے روانہ کر چکا تھا۔ پندرہ بیس اور نوجوانوں کی جماعت شہر سے باہر ایک مقام پر ان کے لیے گھوڑے لیے کھڑی تھی۔ جلسہ گاہ سے نکل کر عبد الملک نے کہا۔ "اگر آپ زخموں کی وجہ سے سفر کرنا تکلیف دہ سمجھتے ہوں تو ابھی تک چند پناہ گاہیں ایسی ہیں جن تک حکومت کے سپاہی نہیں پہنچ سکتے۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "نہیں۔ زرہ میں ان تیروں نے کوئی اثر نہیں کیا۔ معمولی زخم ہیں۔ مجھے تو ان کا احساس بھی نہیں۔ لیکن جانے سے پہلے میں بغداد میں ابھی ایک اور فرض پورا کرنا چاہتا ہوں اور شاید اس مقصد کے لیے ہمیں چند نوجوانوں کی مدد لینا پڑے۔"

"وہ کیا؟"

"مہلب بن داؤد سے چند باتیں۔" "لیکن اس وقت وزیر اعظم کے محل میں داخل ہونا آسان نہیں۔"

"مجھے ایک آسان راستہ آتا ہے۔"

"کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ دس!"

"تو چلیے! لیکن جہاں آپ دس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں میں وہاں پندرہ لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔"

”بہت اچھا۔ پندرہ سہی لیکن اس مہم میں آدمیوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“

انجام

وزیر اعظم مہلب بن داؤد اپنے محل کے اس کشادہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جو دریا کنارے کی طرف تھا۔ ناظم شہر قید خانے کا داروغہ اور بغداد کی افواج کا سپہ سالار قشمور اس کی محفل میں شریک تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور بغداد کے تازہ حالات پر تبصرہ ہو رہا تھا۔

مہلب نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بچ گیا ہو گا۔ اس دن اتنا خطرناک زہر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا، معمولی زخم اس کا کیا کریں گے؟“

ناظم شہر نے جواب دیا۔ ”نہیں میں کوتوال سے تسلّی کر کے آیا ہوں، اتنے فاصلے سے کم از کم چار تیر لگنے کے بعد وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور اس

دن کے زہر کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اس کے پاس یقیناً کوئی تریاق ہو گا۔"

"لیکن وہ بہت دور اندیش ہے۔ ممکن ہے زرہ وغیرہ پہن کر آیا ہو۔ کوتوال نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میری ہدایت تھی کہ فوراً کشتیوں پر بیٹھ کر دوسرے کنارے پہنچ جائیں۔ اس لیے وہ نتائج کا انتظار نہ کر سکے۔"

مہلب نے کہا۔ "اس نے پھر اس پُر امن شہر میں آگ لگا دی ہے۔ اب مجھے پھر ایک بار تاتاریوں کو مطمئن کرنا پڑے گا اور میرے خیال میں ان کا مطالبہ یہی ہو گا کہ ان کے خلاف اشتعال پھیلانے والوں کو پکڑ کر ان کے حوالے کیا جائے۔"

داروغہ نے کہا۔ "اس کے سوا ہمارے لیے کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ طاہر کو اگر موقع ملا تو ہمیں یقیناً زِک پہنچائے گا۔"

ناظم شہر نے کہا۔ "لیکن ہماری طرف سے فوری کاروائی پر عوام ہمارے

خلاف بہت زیادہ مشتعل ہو جائیں گے اور عوام کو جوش و خروش دیکھ کر خلیفہ بھی ہمیں شاید فوری اقدام کی اجازت نہ دے۔ آج تقریر میں اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ بغداد سے جا رہا ہے۔ اگر وہ واقعی چلا گیا تو یہ معاملہ خود بخود ٹھنڈا ہو جائے گا اور اگر اس نے یہاں ٹھہرنے کی کوشش کی تو علما کے ایک بہت بڑے گروہ کو ہم اس کی مخالفت پر آمادہ کر چکے ہیں اور ان کے پیرو اسے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آج اس کی تقریر غیر متوقع تھی ورنہ ہم جلسے میں گڑبڑ ڈالنے کے لیے کئی آدمیوں کو بھیج سکتے تھے۔ آئندہ کے لیے یہ انتظام کروں گا کہ اسے روکنے کے لئے ہر مسجد اور ہر چوک میں علما موجود رہیں۔ کل تک کم از کم ڈیڑھ سو علما کی طرف سے یہ فتویٰ مشتہر کیا جائے گا کہ اس کے مقاصد باغیانہ ہیں۔"

اچانک طاہر ننگی تلوار لیے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "تمہیں غلط فتویٰ مشتہر کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

مہلب کے ہاتھ سے شراب کا جام گر پڑا اور اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔

قشمور نے جلدی سے اُٹھ کر تلوار کے قبضے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن طاہر نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا:

"بیٹھ جاؤ!"

قشمور غصّے سے ہونٹ کاٹتا ہوا بیٹھ گیا۔

مہلب نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کس نیّت سے آئے ہو؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "تم مدّت سے میرے پیچھے سرگرداں تھے اور میں بغداد چھوڑنے سے پہلے تم سے چند باتیں کرنا ضروری سمجھتا تھا۔"

"لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میری آواز پر پچاس پہرے دار یہاں اکٹھے ہوسکتے ہیں۔"

طاہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "پچاس نہیں، پینتالیس۔ پانچ دریا کے کنارے اونگھ رہے تھے۔ وہ ہمارے قبضے میں ہیں۔ اگر تم نے دوسروں کو

آواز دی تو تمہاری آواز آخری ثابت ہو گی۔"

عبد الملک کے ساتھ پانچ اور نوجوان ننگی تلواریں لیے کمرے میں داخل ہوئے۔

طاہر نے کہا۔ "اندر زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ باہر کا خیال رکھو۔
عبد الملک کے اشارے پر دونوں جوان باہر نکل گئے اور باقی تین ناظم شہر، قشمور اور داروغہ کے سروں پر کھڑے ہو گئے۔

طاہر نے کہا۔ "اٹھیے!"

مہلب نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

طاہر نے جواب دیا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارا مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہوں۔ کہو کیا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ کہ تم سب ہمارے ساتھ چلو!"

"کہاں؟"

”جہاں ہم لے جائیں؟“

”اور اگر میں انکار کروں تو؟“

”مجھے مجبوراً اپنی تلوار استعمال کرنا پڑے گی۔ اسے ہاتھ لگا کر دیکھ لو!“

طاہر نے یہ کہتے ہوئے آہستہ سے تلوار کی نوک اس کے سینے میں چبھو دی۔

”نہیں نہیں، خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بغداد چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”مجھے تمہارے وعدوں پر یقین نہیں اور اسی لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”کہاں؟“

”بغداد سے دور کسی ایسے مقام پر جہاں سے لوٹ کر تم پھر یہاں نہ آ سکو۔“

”تم یہ وعدہ کرو کہ مجھے قتل نہیں کرو گے؟“

طاہر نے کہا۔”اگر میں وعدہ کروں تو تمہیں یقین آجائے گا؟“

”میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹا وعدہ نہیں کرسکتے۔“

عبد الملک نے کہا۔”بغداد کے مناظرے سُن سُن کر اسے بحث کی عادت پڑگئی ہے۔ اس کا علاج میں جانتا ہوں۔“

طاہر کو ایک طرف ہٹا کر عبد الملک نے اپنی تلوار کی نوک مہلب کی گردن پر رکھ کر آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔”اٹھتے ہو یا۔۔۔۔!“

مہلب نے گھگھیا کر کہا۔”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میں چلتا ہوں۔“

”آہستہ بولو۔“عبد الملک نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

قشمور نے دوبارہ تلوار کے قبضے کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی لیکن طاہر نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ پر تلوار کی نوک رکھ دی اور اس کے ساتھی نے اس کے نیام سے تلوار نکال لی۔

قشمور نے کہا۔ ”بہادر کسی کے ہتھیار چھین کر اس پر حملہ نہیں کیا کرتے!“

طاہر نے کہا۔ ”تم اطمینان رکھو، تمہیں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع بھی مل جائے گا۔“ ”اگر تم یہ وعدہ کرتے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں!“

”میں وعدہ کرتا ہوں اور تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے تلوار کے مقابلے کے لیے ہماری طرف سے بھی ایک ہی تلوار ہو گی!“

قشمور نے کہا۔ ”چلو!“

طاہر ناظمِ شہر اور داروغہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اُٹھو۔ تمہاری ابھی ضرورت ہے۔“

(۲)

مہلب اور اس کے ساتھی اپنی پسلیوں پر تلواروں کی تیز نوک کا دباؤ

محسوس کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ طاہر کے باقی آٹھ دس ساتھیوں نے جو ابھی تک باہر کھڑے تھے، انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ دریا کے کنارے دو کشتیاں کھڑی تھیں۔ طاہر کے ساتھی مہلب کی سیر کی تمام کشتیوں کے رسے کاٹ کر انہیں دریا میں دھکیل چکے تھے۔ ایک کشتی میں پانچ پہریدار جنہیں انہوں نے دریا کے کنارے نیم خوابی کی حالت میں آدبوچا تھا، رسیوں میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔

طاہر نے مہلب کو کشتی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا اور اس کے اشارے سے زیادہ عبدالملک کی تلوار کی نوک سے مجبور ہو کر کشتی پر سوار ہو گیا۔ قشمور، ناظم اور داروغہ نے اس کی تقلید کی۔ طاہر کے آٹھ ساتھی اس کشتی میں سوار ہو گئے اور باقی سات دوسری کشتیوں میں رسیوں سے جکڑے ہوئے پہرے داروں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد کشتیاں دریا کی منجدھار میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیر رہی تھیں۔ مہلب نے چند بار نہایت عاجزی سے سوال کیا۔ ”تم ہمیں کہاں لے جارہے ہو؟“

عبد الملک ہر بار یہی جواب دیتا۔ ”فکر نہ کرو، تمہاری منزل بہت نزدیک ہے۔“

آباد کناروں سے آٹھ کوس دور نکل جانے کے بعد طاہر نے کشتی میں پڑے ہوئے پتھروں میں سے ایک اٹھا کر مہلب اور اس کے ساتھیوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو یہ پتھر کس کام آتے ہیں؟“

مہلب بلبلا اُٹھا۔ ”نہیں نہیں، یہ ظلم ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو؟“

طاہر قشمور کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیوں حضرت! آپ ہی بتایئے، بھلا یہ سوال پوچھنا ظلم ہے کہ دریا کے کنارے پڑے ہوئے پتھر کس کام آتے ہیں؟“

”میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔“

عبد الملک نے کہا۔ ”موٹی عقل کے آدمی ہیں، ان سے ایسے سوالات نہ پوچھئے۔“

قشمور نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے ساتھ بہادروں کی طرح مقابلہ کرنے کا وعدہ کیا تھا!“

طاہر نے کہا۔ ”میرے دل میں بہادری کے لیے عزّت ہے اور میں عبد الملک کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ وہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش نہ آئے اور اس کے ساتھ ہی مجھے آپ سے توقع ہے کہ آپ بزدلوں کی اعانت نہ کریں گے۔ میں آپ سے چند سوالات پوچھتا ہوں۔ نہیں بلکہ آپ کو قاضی سمجھ کر آپ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا ہوں۔“قشمور نے کہا۔ ”لیکن میں صرف سپاہی ہوں؟“

”میرا مقدمہ کوئی پیچیدہ نہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے میری کمر کے ساتھ پتھر بندھوا کر مجھے دریا میں ڈلوا دیا تھا، اگر وہ شخص مجھے مل جائے تو اسے کیا سزا دوں؟“

قشمور نے کہا۔ ”اگر مل جائے تو تم اس کے ساتھ وہی سلوک کر سکتے ہو!“

طاہر نے کہا۔ ”مجھے ایک بہادر سپاہی سے یہی امید تھی۔ داروغہ کی کمر کے

ساتھ یہ پتھر باندھ دو!"

طاہر کے تین ساتھیوں نے داروغہ کو زبردستی منہ کے بل لٹادیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن عبدالمُلک نے تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خبردار! اگر تم نے ذرا بھی جنبش کی تو میں ذبح کرڈالوں گا؟"

جب اس کی کمر کے ساتھ پتھر باندھا جارہا تھا تو مہلب نے اُٹھ کر دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن طاہر نے بائیں ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر ایک مُکّا رسید کیا اور وہ تیورا کر کشتی میں گر پڑا۔ ناظمِ شہر نے بھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن طاہر کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اس کے گلے میں رسہ ڈال کر اسے پیٹھ کے بل کشتی میں گرادیا۔

تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد ناظم شہر اور مہلب کی پیٹھ پر بھی پتھر باندھ دیئے گئے۔

مہلب، عبدالمُلک کی دھمکیوں کی پروانہ کرتے ہوئے چلّا چلّا کر یہ کہہ رہا

تھا کہ میرا پتھر ان دونوں سے بھاری ہے، یہ مجھ سے بہتر تیر اک ہیں، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں ایک لاکھ اشرفی دینے کے لیے تیار ہوں!"

طاہر نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ قریباً آدھی اسلامی دنیا کی تباہی کے لیے یہ معاوضہ بہت تھوڑا ہے؟"

"میں تمہیں دولاکھ دیتا ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔"

طاہر نے کہا۔ "لیکن اس رقم سے تو ہم خوارزم کا ایک اجڑا ہوا شہر بھی دوبارہ نہیں بسا سکتے؟"

"میں تمہیں پانچ لاکھ دیتا ہوں، اس سے زیادہ میرے پاس نہیں۔"

"لیکن تمہارا باپ شاید ایک غریب آدمی تھا۔ تم نے اتنی دولت کہاں سے جمع کر لی؟ میرے خیال میں تم جان بچانے کے لیے جھوٹ کہہ رہے ہو؟"

”نہیں، خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا۔ میرے پاس پانچ لاکھ اشرفیاں اور اتنی مالیت کے جواہرات بھی ہیں، مجھے چھوڑ دو۔ میں یہ تمام دولت تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں!“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بغداد کے لوگوں سے رشوت کا مال جمع کیا ہے؟“

”نہیں۔ خدا کی قسم میں نے رشوت نہیں لی۔“

”تو پھر یہ دولت کہاں سے آئی؟“

”میں نے تاتاریوں سے حاصل کی تھی۔“

”جہاں تک مجھے معلوم ہے تاتاریوں نے صرف ایک شخص کو مالا مال کیا تھا اور وہ، وہ تھا جس نے چنگیز خان کو خوارزم پر حملے کی صورت میں خلیفہ کی غیر جانبداری کا ثبوت دے دیا تھا۔ جس نے وحید الدّین کو قید کر کے زہر دے دیا تھا۔ جس نے وزیر اعظم کو قتل کیا تھا، جو خلیفہ مستنصر کے پاس تاتاریوں کی دوستی کا پیغام لے کر آیا تھا۔“ مہلب نے کہا۔ ”میں

اپنے تمام جرائم کا اقبال کرتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔ میری جان لینے سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

طاہر نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہاری موت کے باوجود بغداد پر جو تباہی آنے والی ہے، وہ آکر رہے گی۔ بغداد میں منافقتوں اور غدّاروں کی تعداد تمہارے سر کے بالوں سے بھی زیادہ ہے لیکن بغداد کی تباہی کے اسباب پیدا کرنے کرنے کے بعد تاتاریوں سے انعام حاصل کرنے والے تم نہیں، کوئی اور ہو گا۔ تم نے تاتاریوں کے لیے بغداد کے دروازے کھولے ہیں لیکن ان کی تلواروں کے سائے میں مسلمانوں پر حکومت کرنے والے غدّار تمہارے خاندان سے نہیں، کسی اور خاندان سے ہوں گے!"

ناظمِ شہر نے کہا۔ "تمہیں زہر دینے اور دریا میں پھینکنے کی سازش میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"

طاہر نے کہا۔ "پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرے خلاف ایسی سازش

کی گئی ہے؟"

"مجھے داروغہ نے بتایا تھا۔"

داروغہ نے کہا۔ "بزدل مت بنو۔ ہمارے بغیر تمہارا دل اس دنیا میں کیسے لگے گا؟"

طاہر نے کہا۔ "اب تم یہ فیصلہ کرلو کہ خود دریا میں کودنا پسند کرو گے یا ہم تمہارے ہاتھ پاؤں پکڑ کر دریا میں پھینک دیں؟"

داروغہ نے کہا۔ "ہم پر اگر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک ساتھ کودنے کا موقع دو!" طاہر نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ میں آخری وقت میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا اور پھر یہ پتھر وزن میں اس پتھر سے زیادہ نہیں جس کا بوجھ اٹھا کر میں نے دریا عبور کیا تھا۔"

ناظم نے کہا۔ "لیکن ہم تیراک نہیں۔"

”تو اس صورت میں ہمیں تمہیں زبردستی پانی میں پھینکنے کی تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ عبدالملک! پہلے مہلب کی باری ہے۔“

داروغہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر ایک ایک کر کے ہمیں پانی میں دھکیلا گیا تو تمہارا ڈوب جانا یقینی ہے۔ اگر اکٹھے کود دو تو میں تمہیں سہارا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ یہ پتھر بہت معمولی ہیں اور میں اس سے زیادہ بوجھ اٹھا کر دریا عبور کرتا ہوں۔“

طاہر اور اس کے ساتھی داروغہ کے اس ایثار پر حیران تھے کیونکہ جسمانی لحاظ سے وہ اپنے ساتھیوں کی نسبت زیادہ نحیف تھا۔ تاہم انہیں اطمینان تھا کہ اتنا بوجھ اٹھا کر کوئی بھی کنارے تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

داروغہ نے کہا۔ ”آپ ہمیں ایک ساتھ کودنے کی اجازت دیتے ہیں؟“

طاہر نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

داروغہ اُٹھ کر کشتی کے سرے پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ”میں جا رہا ہوں اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے تو میرے ساتھ آؤ۔ ورنہ میں پیچھے

مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔"

ناظم اور مہلب جھٹ اُٹھ کر اس کے قریب کھڑے ہو گئے۔ داروغہ نے بازو پھیلا کر کہا۔ "اپنی گردنیں میری بغل میں دے لو۔ میں تمہیں منجدھار سے نکال دوں گا اور اس کے بعد تمہاری قسمت!"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ناظم اور مہلب نے اپنی تقدیر داروغہ کے سپرد کر دی۔

عبدالملک نے طاہر کے کان میں کہا۔ "یہ تیر نا بالکل نہیں جانتا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ فوج میں تھا۔"

طاہر نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ ایک تیراک اس قدر بے وقوف نہیں ہو سکتا۔"

تینوں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کشتی کے سرے پر کھڑے رہے۔ بالآخر طاہر کے ساتھیوں نے انہیں تلواروں سے ہانک کر دریا میں کودنے پر مجبور کر دیا۔

”مجھے چھوڑ دو۔ ہم تیرنا نہیں جانتے، جھوٹے، فریبی، دغاباز، مکار۔ ہمیں چھوڑ دو۔ مہلب اور ناظمِ شہر پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چلّا رہے تھے۔ لیکن داروغہ کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم نے۔۔ زندگی۔۔۔ اور موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔۔۔!“

وہ چند بار ڈوب ڈوب کر ابھرنے کے بعد پانی میں غائب ہو گئے۔

اس عرصہ میں دو نوجوان قشمور کے سر پر تلواریں تانے کھڑے رہے۔ طاہر اور عبد الملک کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر قشمور نے کہا۔ ”تم نے مجھے ایک سپاہی کی موت مرنے کا موقع دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

طاہر نے جواب دیا۔ ”ہم تمہاری خواہش پوری کریں گے۔“

”تم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ میرا مقابلہ صرف ایک آدمی سے ہو گا۔“

”ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔“

(۴)

آدھی رات کا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ دونوں کشتیاں کنارے پر لگیں۔ طاہر نے اپنے دو ساتھیوں کو دوسری کشتی میں پڑے ہوئے پانچ اسیروں پر پہرہ دینے کے لیے کہا اور اس کے باقی ساتھی اس کی ہدایت کے مطابق کشتیوں سے اتر کر کنارے اور پانی کے درمیان ریت کے ایک چھوٹے سے ٹاپو پر کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد عبد الملک اور طاہر نے قشمور کو تلواروں کے پہرے میں کشتی سے اتارا۔ جب ان کے ساتھیوں نے قشمور کے گرد دائرہ بنا لیا تو طاہر نے اس کی چھینی ہوئی تلوار واپس دینے کا حکم دیا۔

عبد الملک نے طاہر کے کان میں کہا۔ ”تیروں سے زخمی ہونے کے بعد تمہارا بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ اس لیے مجھے اس سے تیغ آزمائی کی اجازت دو۔“

طاہر نے جواب دیا۔ ”صفیہ کی شہادت کے بعد میں نے ایک عہد کیا تھا اور

میں اسے پورا کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

عبد الملک نے بہت اصرار کیا جب وہ دبی زبان سے ایک دوسرے کو سمجھانے کی بجائے بلند آواز میں بحث کرنے لگے تو قشمور نے کہا۔ ”میرے مقابلے کے لیے کسی ایسے شخص کو سامنے آنا چاہے جو میرا ہم پلہ ہو۔ بد قسمتی سے تم دونوں میں سے کوئی میرا ہم رتبہ نہیں۔ تاہم میں طاہر کو ترجیح دیتا ہوں۔“

طاہر نے عبد الملک کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے نیام سے تلوار نکال لی اور کہا۔ ”تیار ہو جاؤ!“

قشمور نے تلوار کو جنبش دیتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔“

رات کی خاموشی میں تلواروں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر تیز و تند حملے کرنے کے بعد قشمور مغلوب ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔

طاہر نے کہا۔ ”پانی میں کودنے کے ارادے سے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تمہیں بہادروں کی طرح لڑنے کا موقع دینے کا وعدہ کیا تھا، بھاگنے کا موقع دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟“

قشمور نے کہا۔ ”تو تمہارے نزدیک میری سزا موت کے سوا کچھ نہیں؟“

طاہر نے کہا۔ ”تمہیں اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے؟“

”ہاں۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے زخموں کے متعلق میرا اندازہ صحیح نہ تھا۔ میں نے عبد الملک کی بجائے تمہیں مقابلے کے لیے منتخب کرنے میں غلطی کی ہے۔“

”تم اس غلطی کی تلافی کر سکتے ہو۔“

”وہ کیسے؟“

”ہتھیار ڈال کر۔“

طاہر کو ذرا ڈھیلا ہوتا دیکھ کر قشمور نے اچانک پینترا بدلا اور اس پر پے در

پے کئی وار کر دیے۔ ایک بار اس کی تلوار ہوا میں سنسناہٹ پیدا کرتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ طاہر نے نیچے جھک کر اپنی گردن بچاتے ہوئے اس پر اچانک ایک سیدھا وار کر دیا۔ قشمور تیورا کر زمین پر گرا۔ طاہر کی تلوار اس کے پیٹ سے آر پار ہو چکی تھی۔

طاہر نے جھک کر اس کے دامن سے تلوار پونچھتے ہوئے عبد الملک کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اگر یہ توبہ کر لیتا تو میں یقیناً اسے چھوڑ دیتا لیکن اس نے مجھے باتوں میں لگا کر یہ خیال کیا کہ میں بے پروا ہو گیا ہوں!'' عبد الملک نے کہا۔ ''چلیئے! اب دیر ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں کشتیاں پانی میں دھکیل دیں اور قیدیوں کو یہیں رہنے دیں۔ جب تک یہ کشتیاں کافی دور نکل جائیں گی اور جب تک کوئی قیدیوں کو نکال کر ان کی سرگزشت پوچھے گا ہم بہت دور جا چکے ہوں گے۔''

طاہر نے سوال کیا۔ ''ہمارے گھوڑے یہاں سے کتنی دور ہیں؟''

عبد الملک نے جواب دیا۔ ''کوئی آدھ کوس کے فاصلے پر۔''

(۴)

عبد الملک کی ہدایات کے مطابق بغداد سے اس کے چند دوست ایک دن قبل اس سرائے میں پہنچ چکے تھے جہاں وہ خوارزم شاہ کے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ٹھہرا گیا تھا۔ عبد الملک کی بیوی اور دو بچے بھی جن میں سے ایک آٹھ سالہ لڑکا اور دوسری پانچ سالہ لڑکی تھی، اس جگہ پہنچ چکے تھے۔

تیسرے دن شام کے وقت طاہر اور عبد الملک بیس سواروں کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئے اور چوتھے دن علی الصبح اس قافلے نے ہندوستان کا رخ کیا۔

چند دنوں کے بعد جب وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گزر رہے تھے تو طاہر نے ایک بلند ٹیلے پر پہنچ کر گھوڑا روکا اور شمال کے بلند پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تصور میں ایک ندی کے کنارے پتھروں کا وہ انبار دیکھ رہا تھا جس کے نیچے صفیہ دائمی نیند سو رہی تھی۔ عبد الملک نے گھوڑا روک کر

کچھ دیر اس کا انتظار کیا اور بالآخر بولا۔ ”طاہر کیا سوچ رہے ہو؟“

طاہر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ عبد الملک نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”چلو! قافلہ دور جا چکا ہے۔“

طاہر نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ”عبد الملک! میں سوچتا ہوں کہ بغداد سے اس درجہ مایوس ہونے میں ہم نے غلطی تو نہیں کی؟“

عبد الملک نے جواب دیا۔ ”نہیں، میرے خیال میں ہم نے بغداد کے لوگوں سے اتنی بڑی توقعات وابستہ کرنے میں غلطی کی تھی۔“

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ شہر جو صفیہ جیسی لڑکیاں پیدا کر سکتا ہو، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے؟“

”جس شہر میں مہلب جیسے ہزاروں انسان موجود ہوں، اسے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ صفیہ نے تو ایسے شہر کی مٹی میں دفن ہونا بھی قبول نہیں کیا جس پر خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے۔“

”عبد الملک! ہم اپنے فرض سے بھاگ تو نہیں رہے؟“

”نہیں۔ ہم وہاں جارہے ہیں جہاں ہمیں فرض بلا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں رہ کر ہم قوم کی کوئی صحیح خدمت کر سکیں گے۔ سلطان التمش کو ہماری تلواروں کی ضرورت ہے۔ بغداد میں ہم اپنا فرض پورا کر چکے ہیں۔ جو لوگ خود کُشی کا ارادہ کر چکے ہوں انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ جب ایک ایسی قوم کو جو طوفان میں غرق ہونے کا ارادہ کر چکی تھی، نوح علیہ السّلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی تباہی سے نہ بچا سکے تو ہم کون ہیں؟ ہم نے اہلِ بغداد کو ان کے راستے کے مہیب گڑھے دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے چلنے پر مُصِر ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ خوارزم کے شہر ان کے سامنے ایک ایک کر کے تباہ ہوئے لیکن قدرت کی طرف سے بار بار تنبیہہ کے باوجود انہوں نے عبرت حاصل نہیں کی۔“

اہل بغداد تنزل کی اس آخری گہرائی تک پہنچ چکے ہیں جہاں سے انہیں اُٹھانا کسی انسان کا کام نہیں۔ جس بستی کے ہر پانچ آدمیوں میں سے ایک غدّار ہو، اسے تباہی سے کون بچا سکتا ہے؟ ایک قوم کو تباہ کرنے کے لیے

مہلب جیسا ایک آدمی کافی ہوتا ہے اور بغداد میں تو ہزاروں مہلب موجود ہیں۔"

طاہر نے کہا۔ "بغداد کی تباہی کے آثار معتصم کی تخت نشینی کے ساتھ مکمل ہو جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ اسے شراب، عورتوں کے ناچ اور راگ کے سوا کسی شے کا شوق نہیں۔ میرے خیال میں ایسے شخص کا خلیفۃ المسلمین کہلانا ہی بغداد کی تباہی کے لیے کافی ہو گا۔ وہ جس شخص کو اپنا وزیر بنائے گا وہ مہلب سے یقیناً زیادہ عیّار ہو گا۔"

(۵)

طاہر اور عبدالملک التمش کی فوج کے بہترین جرنیلوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جلال الدّین خوارزم شاہ کے متعلق کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ تاتاری اس کی تلاش میں آذربائیجان، قفقاز اور آرمینیا کا کونہ کونہ چھان چکے تھے۔

ان کی طرف سے بارہا اس کی موت کا اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن دنیا یہ ماننے

کے لیے تیار نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ طاہر عزّت اور شہرت کے آخری زینے پر پہنچ چکا تھا، دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ ثریا کی محبت اس کے لیے گھر کی چار دیواری کو خلدِ بریں بنانے کے لیے کافی تھی۔ بڑھاپے میں اس کے تین بیٹے تیغ زنی اور دوسرے فنونِ حرب میں نام پیدا کر چکے تھے۔ ثریا کا بھائی اسماعیل تجارت کے میدان میں نام پیدا کر چکا تھا۔ عبد الملک کا مکان طاہر کے مکان کے ساتھ تھا اور اس کے لڑکے بھی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ مبارک اور طاہر کے باقی تمام ساتھی فارغ البالی سے زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

دہلی میں ہزاروں افراد ایسے تھے جن کے لیے طاہر کی زندگی قابلِ رشک تھی لیکن طاہر کو ایک خلش ہمیشہ بے چین رکھتی اور یہ بغداد کی یاد تھی۔ ماضی کا غبار اس کی نگاہوں سے بغداد کو اوجھل نہ کر سکا۔

دہلی میں پندرہ سال نوکری اور سیاسی خدمات سرانجام دینے کے بعد وہ

اپنی باقی زندگی اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر چکا تھا اور عبد الملک ہر میدان میں اس کا ساتھ دینے کا عزم کر چکا تھا۔ ہندوستان کے غیر مُسلموں کو خدا کے دین کی دعوت دینے کے بعد انہیں ایک روحانی تسکین حاصل ہوتی لیکن جب بھی کسی مجلس یا اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے طاہر کو بغداد کا خیال آتا تو جلدی سے تقریر ختم کر کے کسی گوشہ تنہائی میں جا بیٹھتا اور پہروں سوچتا رہتا۔ وہ بار بار اپنے دل میں کہتا۔ ”کاش! میں اس شہر کو تباہی سے بچا سکتا!“ وہ اپنے آپ کو کوستا۔ عبد الملک آ کر اسے تسلی دیتا اور کہتا۔ ”طاہر! تمہاری وجہ سے ہندوستان کے کئی ہزار انسان کلمہ پڑھ چکے ہیں اور ابھی کروڑوں انسانوں کے پاس خدا کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اب بغداد کے متعلق سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بغداد کی زمین بنجر تھی، اس لیے وہاں تم نیکی کا بیج نہ اگا سکے۔ ہندوستان کی زمین زرخیز ہے، یہاں ہمیں اپنی محنت کا پھل مل رہا ہے!“

”تم درست کہتے ہو؟“ طاہر یہ کہہ کر اٹھتا اور پھر اپنا کام شروع کر دیتا۔

(۶)

اٹھائیس برس گزر گئے اور ان اٹھائیس برسوں میں زمانہ کئی بار کروٹیں بدل چکا تھا۔ ایران میں چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان حکمران تھا اور بغداد میں معتصم کی خلافت کا تیسرا سال تھا۔ تاتاری بغداد پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خلیفہ کے وزیر ابن علقی نے ہلاکو خان کے ساتھ ساز باز کر کے خلیفہ کو یہ مشورہ دیا کہ علم اور روحانیت کے اس مرکز میں تین لاکھ فوج کی کیا ضرورت ہے۔ یہ خزانے پر ایک غیر ضروری بوجھ ہے۔ چنانچہ بغداد میں چند ہزار سپاہیوں کے سوا باقی تمام فوج کو دائمی رخصت دی جا چکی تھی۔ دوسری طرف بزرگانِ قوم اور علمائے دین کی یہ حالت تھی کہ ان کے مناظرے اب ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ شیعہ سُنّی کی بحث اب مکمل خانہ جنگی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

شہر کے امراء میں حکومت کے تنخواہ داروں کی نسبت تاتاریوں سے اپنے ضمیر اور قوم کی عزّت کی قیمت وصول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ خلیفہ کے ہاتھ میں شراب کا جام تھا اور اس کی مسند کے سامنے

عورتیں رقص کررہی تھیں۔ قاصد نے اطلاع دی کہ ہلاکو خان بغداد کے قریب پہنچ چکا ہے۔ خلیفہ کے ہاتھ سے شراب کا جام چھوٹ گیا اور اس کی سفید قبا پر دھبے پڑ گئے۔

ہلاکو خان آندھی اور بلا کی طرح نازل ہوا اور بغداد نے وہ تباہی دیکھی جس کے سامنے بابل اور نینوا کی داستانیں ہیچ ہیں۔

بیس لاکھ انسانوں میں سے صرف چار لاکھ انسان اپنی جانیں بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ دجلہ کا پانی خون سے سرخ ہورہا تھا۔ کتب خانوں، درس گاہوں اور مکانوں میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ شہر کے وہ کہنہ مشق مناظر جو برسوں سے ایک دوسرے کو کافر بنا رہے تھے، وہ امراء اور علما جو برسوں کی غدّاری کا آخری انعام حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ خلیفہ جس نے مسند پر بیٹھ کر خدا کے دین کا مذاق اڑایا تھا، بڑے بڑے قیمتی تحائف لے کر ہلاکو خان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن کسی کو زندہ لوٹنا نصیب نہ ہوا۔

خلافت عباسیہ کے آخری چشم و چراغ کو قتل کرنے کی بجائے نمدے کی لپیٹ میں ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالا گیا۔ جب ہلاکو خان کو یہ شک ہوا کہ بعض لوگ زمین دوز پناہوں میں چھپ کر اس کی تلوار اور آگ سے بچ گئے ہیں تو اس نے دریا کا بند تڑوا دیا اور ہلاکو خان کی واپسی کے بعد بغداد میں چیلوں اور کتوں کے سوا اور کوئی جاندار موجود نہ تھا۔۔۔ بغداد قصۂ ماضی بن چکا تھا۔ اہلِ بغداد اپنی کھیتی کا پھل کاٹ چکے تھے۔

ختم شد